فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (4)

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

فون: 7249218-7237430

E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

مجلّہ "تاریخ" کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 6665997

ای میل: lena@brain.net.pk

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز — فکشن ہاؤس

— 18-مزنگ روڈ لاہور

فون — 7249218-7237430

قیمت فی شمارہ — 100 روپے

سالانہ — 400 روپے

قیمت مجلد شمارہ — 150 روپے

بیرون ممالک — 2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام — ظہور احمد خاں

کمپوزنگ — فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز — حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

سرورق — عباس

اشاعت اول — جنوری 2000ء

اشاعت دوم — جون 2005ء

فہرست

مضامین

تحقیق کے نئے زاویے

تاریخ کے بنیادی ماخذ

سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ

ضیاء الدین برنی

ترجمہ: سید جمال الدین

مضامین

نئی تاریخ: ماضی اور مستقبل

پیٹر برک / ڈاکٹر مبارک علی

پچھلی دو ایک دہائیوں میں مورخوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ (1) انیسویں صدی تک قومی تاریخ کہ جس کا تاریخ نویسی پر تسلط تھا وہ وقت کے ساتھ ٹوٹتا چلا گیا اور اب اسے عالمی تاریخ سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مقامی تاریخ نے بھی اپنی اہمیت کو تسلیم کرا لیا ہے۔ (ایک وقت تھا کہ یہ قدیم چیزوں یا آثار کے عالموں اور شوقیہ محققوں کا شعبہ تھا) اب تاریخ پھیل کر کئی نئے شعبوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ان نئے شعبوں کو علمی' تاریخی حلقے عزت و احترام کی جگہ دے رہے ہیں مثلاً اب سماجی تاریخ معاشی تاریخ سے علیحدہ ہو کر خود مختار ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ لیبر کی تاریخ' شہروں کی تاریخ' اور دیہات کی تاریخ' تاریخ کی وسعت کو ظاہر کر رہی ہیں۔

معاشی تاریخ نئی اور قدیم میں تقسیم ہو گئی ہے۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں پیدا ہونے والی معاشی تاریخ (وہ بھی اب تک ادھیڑ بن کی عمر میں پہنچ چکی ہے) کے بارے میں چونکہ کافی معلومات ہیں لہٰذا اس پر اس جگہ مزید بحث مناسب نہیں ہے۔ (2) معاشی تاریخ کے مورخوں کے ہاں بھی نقطہ نظر کی تبدیلی کو دیکھتے ہیں کہ جنہوں نے پیداوار سے زیادہ اب خرچ (Consumption) پر توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشی تاریخ کو سماجی اور ثقافتی تاریخ سے علیحدہ کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ انتظام و انصرام (Management) کی تاریخ ایک اور نئی تاریخ ہے جس کی وجہ سے اس میں' معاشی تاریخ اور انتظامیہ (Administration) کے درمیان سرحدیں قائم کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ ایک اور خصوصیت کی حامل' پروپیگنڈا یا اشتہار بازی (Advertisement) کی تاریخ ہے کہ جو معاشی اور ذرائع ابلاغ کے درمیان تذبذب کے عالم میں ہے کہ کہاں جائے۔ اس وقت معاشی تاریخ کی اپنی شناخت سخت خطرے

میں ہے' کیونکہ اس کی حدود میں' یا اس تسلط میں ایک اور تاریخ آ رہی ہے جو کہ ابھی نئی بھی ہے' اور اس میں توانائی اور جذبہ بھی ہے یعنی ماحولیات کی تاریخ' یہ کبھی معاشی تاریخ ہی کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی۔

سیاسی تاریخ بھی تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ صرف اوپر اور نچلی سطح کے لیول پر ہی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اس میں وہ مورخ ہیں کہ جو حکومت کے مرکز اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں' اور وہ مورخ بھی ہیں کہ جو نچلی سطح کی سیاست کو اپنا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ اب سیاست کا مفہوم وسیع ہو چکا ہے اور مورخ (ان میں مائیکل فوکو اور دوسرے نظریاتی مورخ شامل ہیں) اب فیکٹریوں' اسکولوں' اور یہاں تک کہ خاندانوں میں جو تسلط و اقتدار کے جھگڑے ہوتے ہیں ان کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ اس وسعت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سیاسی تاریخ کی شناخت بحران کا شکار ہے۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ سیاست ہر جگہ اور ہر طرف موجود ہے تو پھر سیاسی تاریخ کی علیحدہ شناخت کی کیا ضرورت ہے۔ (3) اس قسم کے مسئلہ سے کلچرل تاریخ بھی دوچار ہے۔ کیونکہ اگر علم بشریات کی تعریف کے تحت کلچر کو دیکھا جائے تو یہ اور ہے۔ اور اگر اس کی روایتی تعریف کی جائے کہ آرٹ' ادب' اور موسیقی کس طرح سے مل کر کلچر کی تشکیل کرتے ہیں۔ تو ایک اور شکل میں ابھرتی ہے۔ ان دو تعریفوں کی وجہ سے کلچرل تاریخ بھی شناخت کے بحران میں ہے۔

اس وقت جب کہ عالمی صورت حال بدل رہی ہے۔ ایک طرف اس میں اتحاد ہے تو دوسری طرف یہ بکھر بھی رہی ہے' لہٰذا ان حالات میں صورت حال کے تجزیہ کے لئے نئی فہم اور سمجھ کو استعمال کرنا ہو گا۔ اس لئے جب "نئی تاریخ" کا نظریہ ابھرتا ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر نئی ہے۔ کیا یہ ایک وقتی ابھار ہے یا طویل دورانیہ میں پیدا ہونے والا رجحان؟ کیا یہ اس قابل ہے کہ یہ روایتی تاریخ کی جگہ لے سکے' یا دونوں رقیب باہم مل کر رہ بھی سکیں گے؟ (4)

نئی تاریخ کیا ہے؟

"نئی تاریخ" کی اصطلاح فرانس میں زیادہ جانی پہچانی ہے کہ جہاں قرون وسطٰی کی

تاریخ کے مشہور مورخ ژاک لوگوف (Jacque Le Goff) نے اس عنوان سے تاریخ کے مقالات پر مشتمل ایک کتاب کو ایڈٹ کیا ہے اس نے مزید تین جلدوں میں "نئے مسائل" نئی اپروچیز (Appraches) اور نئے مقاصد پر مقالات شائع کئے ہیں۔ (5) اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نئی تاریخ کیا ہے؟ یہ وہ تاریخ ہے کہ جو فرانس میں بنی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو نئے فیشن' نئے نئے رومان' اور اس کے ذکر کی ضرورت تو نہیں' مگر نئے نئے کھانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اور زیادہ وضاحت کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ تاریخ ہے کہ جو آنلز مکتبہ فکر سے وابستہ ہے جو کہ معیشت' معاشرہ' اور تہذیب کے موضوعات پر مشتمل ایک جنرل نکالتے ہیں۔

جب ہم دوبارہ سے یہ سوال دہراتے ہیں کہ نئی تاریخ کیا ہے؟ تو اس کا کوئی مثبت جواب دینا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس کو اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ نئی تاریخ' مکمل تاریخ (Total History) یا ساختیاتی (Structural) تاریخ ہے۔ اس مسئلہ کو سلجھانا ایسا ہی ہے کہ جیسے کہ قرون وسطٰی کے علماء کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ خدا کے بارے میں تعریف کر سکیں کہ وہ کیا تھا۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ نئی تاریخ کی تعریف یہاں سے کی جائے کہ یہ کیا نہیں ہے اور اس کے حامی کس کی مخالفت کرتے ہیں۔

نئی تاریخ دراصل روایتی تاریخ کے ردعمل اور اس کے قائم شدہ فریم ورک کی مخالفت کرتے ہوئے لکھی گئی۔ اس مفید' مگر غیر واضح اصطلاح کو سائنس کے ایک امریکی مورخ ٹامس کون (Thomas Kuhn) نے مقبول بنایا۔ (6) روایتی تاریخ نویسی کو اگر مشہور جرمن مورخ لیو پولڈ فون رانکے (1795-1886) کے نام پر "رانکین تاریخ" کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اگرچہ اس کے حامیوں کے مقابلہ میں شاید خود اس کو یہ اصطلاح پسند نہ ہو۔ (جیسے کہ مارکس مارکسٹ نہیں تھا۔ اس طرح رانکے رانکین نہیں تھا) لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کو سمجھنے کا ایک عام فہم طریقہ ہے۔ ہم اس کی تعریف تو نہیں کرتے مگر اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ماضی کی دریافت کرنے والے دوسرے نظریات کے مقابلہ میں' یہ تاریخ کو محض سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے بلکہ اس میں عملی کردار ادا کرتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے قدیم اور نئی تاریخ کے درمیان جو سات تضادات ہیں' ہم ان کو بیان کرتے ہیں۔

-1 تاریخ کے روایتی ڈھانچہ یا دائرے میں اس کا تعلق سیاست سے ہوتا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر سرجان سیلے (Sir John Seeley) کے الفاظ میں "تاریخ ماضی کی سیاست ہے اور سیاست زمانہ حال کی تاریخ ہے۔" سیاست کا تعلق ریاست سے ہوتا ہے' لہٰذا دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقامی سے زیادہ قومی اور بین الاقوامی ہوتی ہے۔ یہ چرچ کی تاریخ کو بحیثیت ایک ادارے کے اپنی دائرے میں شامل کرتی ہے۔ جیسا کہ ایک جرمن فوجی مفکر کارل فون کلاؤزے وٹز (Karl Von Klausewitz) نے کہا کہ یہ جنگ کے علاوہ اور دوسرے ذرائع سے بھی اپنے تسلسل کو باقی رکھتی ہے۔ جب کہ تاریخ کی دوسری اقسام میں جیسی کہ آرٹ کی تاریخ' یا سائنس کی تاریخ ان کو روایتی تاریخ نویسی سے بالکل خارج نہیں کیا جاتا ہے لیکن ان کو سیاسی تاریخ کے مقابلہ میں کم اہمیت دے کر محض حاشیہ آرائی سمجھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس نئی تاریخ تمام انسانی سرگرمیوں کو اپنے دائرہ عمل میں سمیٹ لیتی ہے۔ ہر چیز کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ جیسا کہ جے۔ بی۔ ایس' ہالڈن (J. B. S. Haldane) جو کہ ایک سائنس دان تھا' اس نے کہا تھا کہ ہر چیز کا ماضی ہوتا ہے جس کی تشکیل کر کے اسے جامع ماضی کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ (7) یہ اس مکمل یا جامع تاریخ (Total History) کے زمرے میں آ جاتا ہے کہ جس سے آنلز والوں کو بڑا لگاؤ ہے۔ اس صدی کے شروع میں نظریات و افکار کی تاریخ کا عروج ہوا۔ پچھلے تیس سال سے ہم ایسے موضوعات پر تاریخ کی تحقیقات کو دیکھ رہے ہیں کہ جن کو اس سے پہلے تاریخ سے باہر سمجھا جاتا تھا' مثلاً بچپن' موت' جنون' آب و ہوا' خوشبو و بدبو' گندگی اور صفائی' اشارے' جسم' عورتیں' پڑھائی' بول چال' اور یہاں تک کہ خاموشی۔ (8) ایک زمانہ میں کچھ چیزوں' قدروں' یا اداروں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ تبدیل نہیں ہوتے ہیں' لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ زمان و مکان میں رہتے ہوئے یہ بدلتے رہتے ہیں۔

نئی تاریخ میں کلچر کے عنصر کا جو کردار ہے' مناسب ہے کہ اس کے بارے میں وضاحت کی جائے۔ اس تاریخ کی نظریاتی یا فلسفیانہ بنیاد یہ ہے کہ حقیقت سماجی اور

ثقافتی عمل کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ اس روایتی فرق کو کم کرتی ہے کہ جو تاریخ میں مرکز اور اطراف کے تعلق سے چلا آتا ہے۔

-2 دوسری اہم بات یہ ہے کہ روایتی مورخ تاریخ کو واقعات کا بیان (Narrative) سمجھتے ہیں۔ جبکہ نئی تاریخ تعمیرو ساخت اور بناوٹ کے تجزیہ کو اہم قرار دیتی ہے۔ ہمارے زمانہ کی مشہور کتاب جو بروڈل نے "بحر روم" پر لکھی اس میں وہ واقعاتی تاریخ کو مسترد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ سمندر کی موجوں کے اوپر جھاگ ہوتے ہیں۔ (9) اس کے نزدیک معاشی اور سماجی تبدیلیاں جو ایک طویل دورانیہ میں وقوع پذیر ہوتی ہیں' اور جغرافیائی و تاریخی تبدیلیاں جو وقت کے وسیع حصہ میں سرگرم عمل رہتی ہیں' یہ وہ عناصر ہیں کہ جن پر غور کرنا چاہئے۔ اگرچہ اب اس نقطہ نظر پر اعتراضات ہونے لگے ہیں اور یہ کہا جانے لگا ہے کہ واقعات کو اس طرح آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا ہے' لیکن مختلف روایات اور اداروں کی ساخت و بناوٹ کو اب سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔

-3 روایتی تاریخ کا تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ حکمراں طبقوں یا اوپر کی سطح (from above) کی تاریخ کو پیش کرتی ہے اور ہمیشہ عظیم افراد کے عظیم کارناموں کو بیان کرتی ہے جن میں سیاستدان' جنرلز' اور کبھی کبھی چرچ کے اعلیٰ عہدیدار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو تاریخ میں بہت ہی معمولی مقام دیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس ردعمل سے ہوتا ہے کہ جو اس رجحان کے خلاف ابھرا۔ جب مشہور روسی لکھاری الکزنڈر پشکن کسانوں کی بغاوت اور ان کے لیڈر پگاچوف کے بارے میں لکھ رہا تھا تو زار نکولس نے بڑی حقارت سے کہا تھا "اس قسم کے آدمی کی تو کوئی تاریخ نہیں ہوتی ہے" 1950ء کی دہائی میں جب ایک برطانوی مورخ نے فرانسیسی انقلاب میں مقبول عام تحریک پر اپنا تھیسس لکھا تو اس کے ایک ممتحن نے اس سے سوال کیا کہ: "تم ان لٹیروں کے بارے میں جاننے کے لئے کیوں پریشان ہو۔" (10)

اس کے مقابلہ میں اب ایسے مورخوں کی بڑی تعداد ہے کہ جو نچلی سطح کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یعنی عام لوگوں کے نقطہ نظر کو سمجھنا اور ان کے تجربات کی روشنی میں سماجی تبدیلی کے عمل کا تجزیہ کرنا۔ اس دلچسپی کی وجہ سے مقبول کلچر اور اس

کی تاریخ پر اب کافی توجہ دی گئی ہے۔ جو مورخ چرچ کی تاریخ لکھ رہے ہیں اب وہ اس کے اوپری اور نچلی سطح دونوں پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں۔ (11) وہ مورخ کہ جو اب تک ذہنی و دانشوری کی تاریخ لکھ رہے تھے انہوں نے بھی اپنی توجہ عظیم کتابوں' یا عظیم نظریات سے ہٹ کر' جو ان کے لئے عظیم افراد کے مساوی تھیں' اب لوگوں کی اجتماعی ذہنیت' یا زبان اور بحث و مباحثہ کے پہلوؤں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ زبان کے سلسلہ میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کیا عام لوگوں کی بول چال اور زبان کو دیکھا جائے۔ یا علماء کی زبان کو۔ (12)

4- دونوں کے درمیان چوتھا فرق یہ ہے کہ روایتی تاریخ میں دستاویزات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ رانکے کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تاریخی بیانات کی کمزوریوں کو اجاگر کر کے اس پر زور دیا کہ سرکاری دستاویزات' جو کہ آرکائیوز میں محفوظ ہیں' ان پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کے اس کارنامہ کی یہ قیمت ہوئی کہ تاریخ کی دوسری شہادتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ تحریری تاریخ سے پہلے کے دور کو "قبل از تاریخ" کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔ لیکن دوسری طرف نچلی سطح کے نقطہ نظر سے لکھی جانے والی تاریخ اس قسم کی دستاویزات کی کمزوری کو سامنے لاتی ہے۔ سرکاری دستاویزات بہرحال سرکاری نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اگر باغیوں' منحرفوں' اور مخالفوں کے بارے میں تاریخ لکھنی ہو تو ان دستاویزات کے علاوہ دوسرے ماخذوں کو تلاش کرنا ہو گا۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے اگر آج کے مورخوں کو انسانی سرگرمیوں کی مختلف جہتوں پر تحقیق کرنی ہے تو اپنے سابقہ مورخوں کے مقابلہ میں انہیں مختلف قسم کے ماخذوں کو تاریخ کی تشکیل کے لئے استعمال کرنا ہو گا۔ اس قسم کی شہادتوں میں کچھ تو تحریری اور نظر آنے والی ہوتی ہیں اور اعداد و شمار کے ذریعہ بھی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں' مثلاً کاروباری نفع و نقصان کی میزانیں' اور ووٹ دینے والوں کی تعداد وغیرہ۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں کوانٹیٹیو (Quantitative) تاریخ کا عروج کا زمانہ تھا (کسی چیز کا انداز کسی پیمانہ سے کیا جائے) اور یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ تاریخ کو اسی پیمانہ پر لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس رجحان کے خلاف ردعمل ہوا' لیکن یہ کسی نہ کسی طرح سے تاریخ میں جاری ہے' مثلاً برطانیہ میں "تاریخ اور کمپیوٹنگ" کے نام

سے ایک ایسوسی ایشن 1987ء میں قائم ہو چکی ہے۔

5- اس روایتی فریم ورک کے تحت جس کو مفکر اور مورخ آر۔ جی۔ کولنگ وڈ نے اپنے نقطہ نظر سے یادگار بنا دیا ہے وہ یہ سوال ہے کہ جب ایک مورخ یہ سوال کرتا ہے کہ بروٹس نے سیزر کو کیوں قتل کیا؟ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ "بروٹس نے کیا سوچا تھا؟" کہ جس کی وجہ سے اسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ سیزر کے خنجر گھونپے؟" (13) تاریخی وضاحت و تشریح کے اس ماڈل موجودہ دور کے مورخوں نے کئی وجوہات کی بنا پر چیلنج کیا ہے کیونکہ اس میں مورخوں کے جانب سے اٹھائے گئے سوالات کے جوابات نہیں ملتے ہیں جو کہ اجتماعی تحریکیں اور انفرادی عمل اور واقعات کے بارے میں ہیں۔

مثلاً یہ سوال کہ آخر کیوں سولہویں صدی میں اسپین میں چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں؟ معاشی تاریخ کے مورخوں کو اس سوال کا جواب کولنگ وڈ کے ماڈل میں نہیں ملتا ہے' بلکہ وہ اس کا جواب چاندی در آمد' آبادی کے بڑھنے اور اس قسم کی دوسرے متعلقہ وجوہات میں ڈھونڈتے ہیں۔ فرنانڈ بروڈل کی مشہور کتاب "سولہویں صدی کے بحر روم" پر جو کہ 1949ء میں چھپی' اس میں تیسرے اور آخری حصہ میں وہ تاریخی واقعات کا ذکر کرتا ہے اور اس قسم کے سوالات اٹھاتا ہے کہ جن کا کولنگ وڈ کے نقطہ نظر سے بہت دور کا واسطہ ہے' لیکن یہاں بھی مصنف بالکل مختلف قسم کے جوابات دیتا ہے' اس میں بھی وہ اپنے ہیرو فلپ دوم کی ان دشواریوں کا ذکر کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے اپنے عہد میں وہ تاریخی عمل کو متاثر نہیں کر سکا۔ (14)

6- روایتی پیٹرن میں تاریخ معروضی ہے۔ مورخ کا کام یہ ہے کہ قاری کو واقعات پہنچا دے' یا بقول رانکے یہ بتائے کہ "حقیقتاً واقعہ کس طرح سے پیش آیا" یعنی مورخ آنے والی نسلوں کو بغیر کسی تعصب اور پسند و ناپسند کے صحیح حالات سے آگاہ کرے۔ لارڈ ایکٹن نے جب "کیمبرج ماڈرن ہسٹری" میں مقالات لکھنے والے مورخوں کو 1902ء میں جو خط لکھا تو اس میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ "ہم جب واٹرلو پر لکھیں تو وہ فرانسیسی' انگریزوں' جرمنوں' ڈچوں سب کو یکساں طور پر مطمئن کر دے؟ اور قاری کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہو کہ کہاں ایک مورخ نے اپنا مقالہ ختم کیا ہے اور کہاں

سے دوسرے نے شروع کیا ہے۔" (15)

آج اس قسم کے نقطہ نظر کو غیر حقیقی مانا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ رنگ' نسل' مذہب' اور جنس کے تعصبات سے خود کو بالاتر رکھیں' لیکن ہم اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ ماضی کو کسی ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھیں۔ تاریخی تحریروں میں ثقافتی اضافیت' یا اس کی گوناگوں انواع بھی اس کا ایک حصہ بن جاتی ہیں ہمارا ذہن حقیقت کو بلا کسی واسطہ کے تسلیم نہیں کرتا ہے۔ ہم اس دنیا کو روایات' اقدار' منصوبوں اور رسمی سلسلوں کے ایک نیٹ ورک سے سمجھتے ہیں کہ جن میں ایک کلچر دوسرے کلچر سے مختلف ہوتا ہے اس لئے ہمارے لئے کسی جھگڑے اور تصادم کو اس وقت سمجھنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے کہ جب مخالف نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آئے نہ کہ ا یکٹن کے فارمولے کے تحت کہ جس میں محض اتفاق رائے ہو۔ اس لئے ہم تاریخ کے مثالی تصور سے کہ جس میں ہم آہنگ تاریخ کی آواز ہو' ایک ایسی دنیا میں چلے گئے ہیں کہ جس میں مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد رائیں ہوں۔ (16)

رانکے کی مثالی تاریخ پیشہ ور مورخوں کے لئے تھی۔ انیسویں صدی میں تاریخ کو ایک پروفیشن بنا لیا گیا تھا۔ یونیورسٹیوں میں اس کے شعبے تھے۔ اس کے مخصوص جرنلز تھے جیسے جرمنی میں "تاریخی جرنل" برطانیہ میں "انگلش ہسٹاریکل ریویو" اس وقت کے مشہور مورخ بھی پروفیشنل تھے' سوائے ایک استثنا کے' وہ فرانسیسی مورخ فلپ آریز (Philippe Aries) تھا کہ جو خود کو "اتواری مورخ" کہا کرتا تھا۔ آنلز مکتبہ فکر کے مورخوں کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ جس طرح سیاسی تاریخ کو رانکے کے معیار پر قائم کیا جا سکتا ہے' اس طرح سے سماجی' ثقافتی اور معاشی تاریخوں کو بھی اعلیٰ معیار پر لکھا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے انسانی سرگرمیوں کی وسعت کو دیکھتے ہوئے دوسرے علوم سے تعاون و استفادہ کیا جیسے علم بشریات' معاشیات' لسانی تنقید' نفسیات' اور سماجیات وغیرہ۔ آرٹ' ادب' اور سائنس کے مورخ جو اب تک علیحدہ علیحدہ تھے' وہ بھی ان کے رابطہ میں آ گئے ہیں۔ نچلی سطح کی تاریخ جو اس جذبہ کا اظہار ہے کہ ماضی

کے بارے میں عام لوگوں کے نقطہ نظر کو سامنے لایا جائے' اس نقطہ نظر کو بھی نئی تاریخ کے مورخوں نے' اپنے سابقین کے مقابلہ میں' زیادہ سنجیدگی سے اپنا لیا ہے۔ (17) اور یہی کچھ زبانی تاریخ کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف رائے نئی تاریخ کا جوہر ہے۔

نئی تاریخ کتنی نئی ہے

وہ کون ہے کہ جس نے نئی تاریخ کو ایجاد یا دریافت کیا؟ اس کا ظہور 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں ہوا کہ جب روایتی تاریخ اور اس کے خاکہ و فریم ورک کے خلاف پوری دنیا میں ایک ردعمل ہوا جس کے نتیجہ میں جاپان' ہندوستان' لاطینی امریکہ اور دوسرے ملکوں کے مورخوں نے نئے نقطہ نظر کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ لیکن ذہن میں یہ رکھنا ضروری ہے کہ ان دو دہائیوں میں تاریخ نویسی میں جو تبدیلیاں آئیں وہ ایک طویل دورانیہ میں پیدا ہونے والے رجحانات تھے۔

بہت سے لوگوں کے خیال میں نئی تاریخ کے بانی لوسین فیبر اور مارک بلوخ ہیں کہ جنہوں نے 1929ء میں آنلز مکتبہ فکر کی بنیاد ڈالی تاکہ اس کے ذریعہ اپنی نئی اوپرچ کو روشناس کرا سکیں' اس کے بعد آنے والی نسل میں فرنانڈ بروڈل تھا جس نے اسے آگے بڑھایا۔ درحقیقت یہ بڑا مشکل ہے کہ ان لوگوں نے تاریخ کو نئی شکل دینے کی جو تحریک شروع کی اس سے انکار کیا جائے۔ لیکن رانکے کی قسم کی تاریخ کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں یہ تنہا نہیں تھے۔ 1930ء کی دہائی میں لیوس نامیر (Lewis Namier) اور آر۔ ایچ۔ ٹانی (R. H. Tawney) محض واقعات کے بیان کو مسترد کر چکے تھے اور اس کی جگہ تاریخ کی نئی ساخت و تشکیل کی بات کر رہے تھے۔ 1900ء میں جرمنی میں کارل لامپریخت (Karl Lamprecht) نے روایتی تاریخ سے انحراف کر کے خود کو بڑا غیر مقبول بنا لیا تھا۔ اس زمانہ میں آنلز مکتبہ فکر کے بانیوں سے بہت پہلے "واقعاتی تاریخ" کی اصطلاح حقیر معنوں میں استعمال ہوئی۔ (18) یہ ان اسکالروں کی طرف سے آئی کہ جو اس وقت فرانسیسی سوشیالوجی کے عالم ایمل ڈرک ہائم (Emile Durkheim) اور اس کے عملی جرنل کے گرد جمع تھے۔ دیکھا جائے تو

اس جرنل نے آنلز مکتبہ فکر کے لوگوں کو متاثر کیا۔

"نئی تاریخ" کی اصطلاح کی خود اپنی ایک تاریخ ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس کا سب سے پہلے استعمال 1912ء میں ہوا جب کہ امریکی مورخ جیمس ہنری رابنسن نے اس عنوان سے اپنی کتاب چھاپی۔ جیسا کہ رابنسن نے بیان کیا اس تاریخ میں انسان کے اس دنیا میں آنے تک کے تمام واقعات و نشانات و علامات کو جن کو اس نے تشکیل کیا یا جو کچھ اس نے سوچا' اسے بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "مکمل تاریخ" کے حامیوں میں سے تھا۔ جہاں تک فنی باریکیوں اور طریقہ کار کا سوال ہے کہ جو اس میں استعمال کیا گیا تو میں ایک بار پھر رابنسن کے الفاظ درج کروں گا کہ اس میں ان تمام دریافتوں کو استعمال کیا گیا ہے کہ جو ماہرین علم بشریات' معاشی دانوں' نفسیات دانوں اور سماجی علوم کے ماہرین نے اپنی تحقیق کے ذریعہ شائع کی ہیں۔ (19) نئی تاریخ کی یہ تحریک اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ لیکن اس وقت وہاں آنلز مکتبہ فکر کی جو مقبولیت ہے اس کو ہم اس پس منظر میں بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں۔

اگر ہم اس کی جڑوں کی تلاش میں جائیں تو ضروری نہیں ہے کہ 1912ء میں آکر رک جائیں یا 1900ء کو اس کا مرکز قرار دے لیں۔ اس پر پچھلے سالوں میں یہ دلیل دی گئی کہ قدیم تاریخ کی جگہ نئی تاریخ کو لانا تاریخ نویسی میں ایک پرانا نقطہ نظر ہے۔ (20) مثلاً انیسویں صدی میں رانکے اور اس کے حامیوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا' اسی بات کو جین مابی لوں (Jean Mabillon) نے دہرایا۔ جس نے سترہویں صدی میں تنقید کے اصولوں کو روشناس کرایا تھا۔ یونانی مورخ پولی بیس (Polybius) نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ایک سو پچاس سال پہلے اپنے مورخ ساتھیوں کو اس پر برا بھلا کہا تھا کہ ان کی تحریر میں محض خطابت و لفاظی ہوتی ہے۔ 1867ء میں مشہور ڈچ مورخ روبرٹ فروئن (Robert Fruin) نے ایک مضمون بعنوان "نئی تاریخ نویسی" لکھا کہ جس میں اس نے رانکے اور اس کی تاریخ نویسی کے سائنسی طریقہ کا دفاع کیا۔ (21)

تاریخ کو محض سیاسی واقعات کے بجائے وسیع تناظر میں لکھنے کا رواج بھی کافی پرانا ہے۔ انیسویں صدی میں جرمنی' برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں معاشی تاریخ کو ریاست

کی تاریخ کے متبادل رواج دیا گیا۔ 1860ء میں سوئزرلینڈ کے مورخ یاکوب بک ہارڈٹ نے "دی سویزیلائی زیشن آف دی رینا ساں ان اٹلی" (The Civilization of Renaissance in Italy) شائع کی۔ اس میں اس نے تاریخ کے ثقافتی پہلو پر توجہ دی اور واقعات کے بجائے رجحانات و رویوں پر زیادہ زور دیا۔ انیسویں صدی کے ماہرین سماجیات جیسے آگسٹ کومے (Auguste Comte) ہربرٹ اسپینسر ـــــ میں یہاں کارل مارکس کو چھوڑتا ہوں۔ یہ سب تاریخ میں بے انتہا دلچسپی لیتے تھے، لیکن پروفیشنل مورخوں کی جانب ان کا رویہ حقارت آمیز تھا۔ وہ واقعات سے زیادہ ساخت پر زور دیتے تھے۔ دیکھا جائے تو نئی تاریخ نے ان سے بہت کچھ لیا ہے، لیکن اس کو تسلیم نہیں کیا۔

انہوں نے بھی اپنے سابقین سے بہت کچھ سیکھا۔ مگر اس کو مانا نہیں ـــــ ان میں روشن خیالی کے عہد کے مورخ تھے جن میں والٹیر۔ گبن، روبرٹ سن، ویچو، اور موئزر قابل ذکر ہیں۔ اٹھارویں صدی میں تاریخ نویسی میں ایک بین الاقوامی تحریک چلی ہوئی تھی کہ تاریخ کو محض فوجی اور سیاسی واقعات تک محدود کر کے نہیں رکھنا چاہئے، بلکہ اس میں قانون، تجارت، معاشرے کی سوچ، ادب و آداب، رسوم و رواج، اور "روح عصر" کو تحریر میں لانا چاہئے۔ جرمنی خاص طور سے اس وقت دنیا کی تاریخ سے دلچسپی تھی۔ (22) عورتوں کی تاریخ پر اسکاٹ مین ولیم الکزنڈر اور کرسٹوف مائنر (Cristoph Meiner) جو کو کہ گوٹن گن میں پروفیسر تھا۔ (اٹھارہویں صدی کے آخر میں اس یونیورسٹی میں نئی سماجی تاریخ کا سینٹر تھا) انہوں نے کتابیں شائع کیں۔ (23)

لہٰذا نئی تاریخ یا سیاسی تاریخ کے متبادل تاریخ کا نظریہ کوئی نیا نہیں ہے۔ اگرچہ جنہوں نے اسے شروع کیا انہیں آج فراموش کر دیا گیا ہے۔ لیکن آج جو نئی تاریخ ہے وہ نئی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج اس کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اب وہ خود کو نظر انداز کروانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

نئی تاریخ کی تعریف اور اس کے مسائل

نئی تاریخ کا وجود اس لئے ہوا کہ روایتی تاریخ اپنی بناوٹ و تعمیر میں اس قابل

نہیں رہی تھی کہ نئی تبدیلیوں کو سمیٹ سکے۔ روایتی تاریخ کی مرکزوں اور ناموزونیت کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب تک ہم ان پھیلی ہوئی اہم تبدیلیوں کا تجزیہ نہ کریں کہ جو دنیا میں ہو رہی تھیں۔ مثلاً نوآبادیاتی عہد کا خاتمہ' اور تحریک نسواں کا ظہور' یہ دو اہم تحریکیں ہیں کہ جنہوں نے جدید دور کی تاریخ نویسی کو اثر انداز کیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آگے چل کر ماحولیات تاریخ نویسی کو اور زیادہ متاثر کرے گی۔

بلکہ یہ موضوع اب تک کافی مورخوں کو اثر انداز کر چکا ہے۔ بروڈل کی مشہور کتاب "بحر روم" جب 1949ء میں چھپی تو اس میں کافی حصہ طبعی ماحولیات کے لئے وقف ہے' زمین' سمندر' پہاڑ اور جزائر کے بارے میں کافی معلومات دی گئی ہیں۔ لیکن ماحولیات کے بدلتے ہوئے نظریہ میں بروڈل کے خیالات ایک جگہ کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ اس نے اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ انسان جب جنگلات کو تباہ کرتا ہے تو اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس نے یہ ضرور بتایا ہے کہ جہاز بنانے میں درختوں کو کاٹ کر ان کی لکڑی کو استعمال کیا گیا' مگر اس سے آگے وہ خاموش ہے۔

ماحولیات سے متعلق کئی مورخوں نے لکھا ہے۔ ولیم کرونون (William Coronon) نے کولونیل دور کے نیو انگلینڈ کی تاریخ لکھی ہے' جس میں اس نے اس نکتہ پر زور دیا ہے کہ یورپی آبادکاروں کے آنے کے بعد اس علاقے میں درختوں اور جانوروں پر کیا اثرات ہوئے' مثلاً سنجاب اور (Beavers) ریچھ' جانوروں میں سیدار (Cedar) اور سفید پائن درختوں میں کس طرح سے غائب ہو گئے۔ اور جب یہاں پر یورپ کے جانوروں کو لایا گیا تو ان کے چرنے کی وجہ سے ماحول میں کیا تبدیلی آئی۔ ایک اور دوسرے ہی نقطہ نظر سے الفرڈ کروزبی (Alfred Crosby) "یورپ کی بائیولوجیکل پھیلاؤ" پر لکھا ہے۔ یہ عہد 900 سے لے کر 1900 تک کا ہے کہ اس عرصہ میں یورپی بیماریوں کے پھیلنے سے مقامی لوگ کس طرح بڑی تعداد میں مرے جن کی وجہ سے نیو انگلینڈ اور نیوزی لینڈ میں آبادکاروں کو اپنی آبادیاں بنانے میں کامیابی ہو گئی۔ (24)

اگرچہ ہم نے روایتی تاریخ نویسی کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن نئی تاریخ بھی

مسائل سے آزاد نہیں ہے۔ یعنی اس کی کس طرح سے تعریف کی جائے' اس کے ماخذ کون سے ہوں گے' اس کو کس طریقہ سے لکھا جائے' اور کس طرح سے اس کی تشریح کی جائے۔ مثلاً سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ نئی تاریخ کی تعریف کا تعین کیسے ہو۔ یہ اس لئے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بالکل نیا شعبہ ہے اور مورخ ایک ایسی فیلڈ میں جا رہے ہیں کہ جو ابھی تک پوری طرح سے دریافت نہیں ہوئی ہے۔ جیسے کہ نئے نئے دریافت کرنے والے اجنبی کلچر کے بارے میں منفی رویہ رکھتے ہیں' یہی حال نئی تاریخ کے مورخوں کا ہے کہ وہ تذبذب کے ساتھ اپنے موضوع کو اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً مشرق کی تاریخ' مغرب کے اسکالرز کے لئے' ان کی اپنی کے مقابلہ میں بطور تضاد کے ابھرتی ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ' چین اور جاپان کی تاریخوں کے درمیان کوئی فرق نہیں دیکھتے ہیں۔ اور سب کو ایک سا سمجھتے ہیں۔ (25) اس طرح سے نچلی اور اوپری سطحوں کی تاریخ کا مسئلہ ہے اور اسی سے جڑا ہوا نچلا اور اوپری کلچر ہے۔ اب اگر مقبول عام کلچر لوگوں سے متعلق ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن لوگوں سے؟ کیا اس میں غریب' نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے' سب ہی آتے ہیں۔ کیا ان میں بغیر پڑھے لکھے اور غیر تعلیم بھی شامل ہیں؟ ہم یہ فرض نہیں کر سکتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں معاشی اور ثقافتی طور پر لوگ ایک ہی سطح پر ہوں۔ اور یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ آخر تعلیم کیا ہے؟ کیا یہ کسی سرکاری تعلیم یافتہ ادارے میں تربیت پانے کے بعد حاصل ہوتی ہے؟ کیا عام لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں' یا انہوں نے طبقہ اعلیٰ کے مقابلہ میں ایک دوسرے کلچر میں' دوسری قسم کی تعلیم حاصل کی ہے۔

یہ فرض نہیں کرنا چاہئے کہ تمام لوگوں کو زندگی کا ایک جیسا تجربہ ہے۔ دنیا کے کچھ حصوں میں' اٹلی سے لے کر برازیل تک لوگوں کی تاریخ کو' "مفتوح لوگوں کی تاریخ" کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے مغرب کی نچلے طبقوں کے تجربات کو نوآبادیات کے مفتوح لوگوں سے ملا دیا جاتا ہے۔ (26) لیکن ان دونوں تجربات کے درمیان جو فرق ہے اس پر بھی بحث کی ضرورت ہے۔

"نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ" یا "نچلی سطح کی تاریخ" کو جب استعمال کیا جاتا ہے تو راہ میں حائل مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے اپنے مسائل

ہیں۔ مختلف سیاق و سباق میں اس کے معنی بدل جاتے ہیں مثلاً اگر نچلی سطح پر سیاسی تاریخ کو بیان کیا جائے۔ تو اس میں صرف ان لوگوں کے خیالات کو جگہ دی جائے کہ جو اقتدار سے دور اور محروم ہیں اور یا وہ زیادہ مقامی نچلی سطح کی تاریخ سے اپنے تعلق کو قائم رکھے؟ کیا چرچ کی نچلی سطح کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں عبادت گذاروں کے خیالات کو ان کے سماجی مرتبہ کا خیال کئے بغیر بیان کیا جائے؟ کیا طب کی تاریخ کو نچلی سطح کے نقطہ نظر سے لکھا جائے تو اس میں ان ویدوں' حکیموں کو شامل کیا جائے کہ جو روایتی طریقہ علاج کے حامی ہیں اور اس میں سے پروفیشنل اور اعلیٰ تربیت یافتہ ڈاکٹروں کو خارج کر دیا جائے' یا مریضوں کے تجربات اور ان کی بیماریوں کی تشخیص کو بیان کیا جائے؟ (27) کیا ملٹری تاریخ جس کو نچلی سطح سے دیکھا جائے تو وہ عام فوجیوں کے بارے میں ہو گی کہ جو جنگوں میں لڑے' اور یا اس میں صرف جنگ کے بارے میں شہریوں کے تاثرات ہوں گے؟ (28) کیا تعلیم کی تاریخ میں تعلیمی ماہرین اور اسکالرز نہیں ہوں گے اور صرف عام اساتذہ ہوں گے' یا اسے اسکولوں کے طالب علموں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا۔ (29) اس طرح سے کیا تجارت کی تاریخ صرف چھوٹے تاجروں اور گاہکوں پر تحقیق کرے گی؟

"مقبول عام" کلچر کی تعریف کرتے ہوئے سب سے بڑا مسئلہ یہ آتا ہے کہ "کلچر" اور "مقبول عام" دونوں کو کیسے بیان کیا جائے۔ اونچی سطح سے کلچر کی جو تعریف کی جاتی ہے اگرچہ وہ بہت تنگ ہے' مگر ساتھ میں جامع بھی ہے۔ نئی تاریخ میں کلچر اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ آتا ہے۔ (30) ریاست' سماجی گروہ' جنس اور معاشرہ یہ سب کلچر کے دائرہ میں آ جاتے ہیں۔ اگر ہم اس کو وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں تو یہ سوال آتا ہے کہ آخر کلچر میں کیا نہیں آتا ہے؟

اسی سلسلہ میں ایک دوسری اپروچ کو جو مسائل کو پیدا کرتی ہے وہ "روزمرہ کی تاریخ" ہے یہ نقطہ نظر بھی نیا نہیں ہے' کیونکہ 1930ء کی دہائی میں ایک فرانسیسی پبلشر نے اس عنوان سے ایک سیریز چھاپی تھی۔ نئی چیز یہ ہے کہ اب جدید مورخ روزمرہ کی تاریخ کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔ خاص طور سے 1967ء میں بروڈل کی کتاب' "مادی تہذیب (Materil Civilization) چھپنے کے بعد سے۔ (31) ایک وقت تھا کہ اس کو

بیکار کہہ کر مسترد کر دیا گیا تھا' مگر اب کچھ مورخ اسی کو اہم تاریخ سمجھنے لگے ہیں کہ جو ہر واقعہ کا مرکز ہے۔ بلکہ اب یہ سوشیولوجی میں بھی داخل ہو گئی ہے اور اس علم میں اس نے اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ (32)

تاریخ نویسی کے مختلف زاویوں میں ایک چیز جو سب میں ملتی ہے وہ یہ کہ عام لوگوں کے تجربات کو دیکھا جائے (بجائے اس کے کہ پورے معاشرہ کا جائزہ لیا جائے) روزمرہ کی تاریخ لکھنے والوں اور ماہر علم بشریات میں جو تعلق ہے وہ یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں ان قوانین اور رسومات کو اجاگر کرتے ہیں کہ جن کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ کسی بھی کلچر میں باپ' لڑکی' حکمران یا پیر کو کیا ہونا چاہئے۔ (33) اس نقطہ پر آ کر مورخ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں: ایک خود کو "نئے کلچرل مورخ" کہتے ہیں۔ جب کہ دوسرے "سماجی و کلچرل و مورخ" کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (34) لیکن یہ حقیقت ہے بدلتے ہوئے کلچر کے اثرات تاریخی نویسی پر انمٹ ہیں۔

لیکن جیسا کہ سوشیولوجی کے ماہر نوربرٹ ایلیاس (Norbert Elias) نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ روزمرہ کی اصطلاح واضح نہیں ہے' اور یہ بہت پیچیدہ ہے اگرچہ دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی ہے۔ وہ اس کو آٹھ قسموں میں تقسیم کرتا ہے جو کہ نجی زندگی سے شروع ہو کر عام آدمیوں کی زندگی تک مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے۔ (35) روزمرہ کی زندگی میں سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔ اگرچہ بروڈل ان کو روزمرہ میں شامل کرنے پر تیار نہیں' اس میں رجحانات بھی ہیں جنہیں ہم ذہنی رویئے بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں رسومات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے' کیونکہ یہ فرد اور معاشرے کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن کچھ رسومات کو روزمرہ سے متضاد قرار دیتے ہیں۔ جب کہ غیر ملکی مورخ کسی بھی معاشرہ میں روزانہ رسومات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن میں کھانا کھانے کے طریقہ' ادب و آداب اور اس قسم کی چیزیں کہ جنہیں مقامی قطعی رسومات نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان کو اہمیت دیتے ہیں۔

اسی طرح سے یہ بھی بتانا مشکل ہے کہ روزمرہ کی تشکیل کیسے ہوتی ہے؟ اور پھر اس میں تبدیلی کیسے آتی ہے؟ کیونکہ روزمرہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وقت ٹھہرا

ہوا نظر آتا ہے۔ اس لئے مورخوں کے لئے یہ پیچیدہ مسئلہ ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی اور معمولات کو کس طرح سے بڑے واقعات سے جوڑیں' جیسے تحریک اصلاح مذہب یا فرانسیسی انقلاب' یا طویل دورانیہ کے عمل جیسے مغربیت اور سرمایہ داری کا تسلط۔ یہ سماجی مورخوں کے لئے ایک اہم موضوع ہے کہ وہ ان دونوں میں تعلق کا تجزیہ کریں اور یہ دیکھیں کہ فرانسیسی اور روسی انقلابات نے کس طرح سے کس حد تک اور کن طریقوں اور ذرائع سے روزمرہ کی زندگی میں دخل اندازی کی اور کس حد تک کامیابی کے ساتھ ان کے خلاف مزاحمت بھی ہوئی۔

ماخذوں کے مسائل

نئی تاریخ کے مورخوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ماخذوں اور طریقہ کار کا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ جب بھی مورخ نئے سوالات اٹھاتے ہیں' تحقیق کے لئے نئے موضوعات چنتے ہیں۔ تو انہیں سرکاری دستاویزات کے ساتھ ساتھ نئے ماخذوں کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا کچھ تو زبانی تاریخ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ کچھ آرٹ و مجسمہ تراشی میں جو علامتیں ہیں ان کا سہارا لیتے ہیں اور کچھ اعداد و شمار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ سرکاری دستاویزات اور ان کے متن کو نئے سرے سے پڑھتے ہیں وہ مورخ کے جو مقبول عام کلچر پر کام کر رہے ہیں وہ عدالتی کارروائی اور اس کی دستاویزات کا استعمال کرتے ہیں' خصوصیت سے ملزم سے جو تفتیش ہوئی تھی' اس کی کارروائی ان کے لئے بہترین ماخذ ہوتی ہے۔ اس سب سے عمدہ مثال گینز برگ (Gensberg) کی "پنیر اور کیڑا" (Cheese and The Worms) ہے۔

لیکن یہ تمام ماخذ بڑے ٹیڑھے سوالات اٹھاتے ہیں۔ مقبول عام کلچر کے مورخ کوشش کرتے ہیں کہ عام زندگی اور اس کے معمولات اس ریکارڈ کی مدد سے تشکیل دیں جو کہ ملزموں کی زندگی میں اہم واقعات بن کر ظاہر ہوئے: یعنی تفتیش اور مقدمہ۔ وہ اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں ان حالات میں' جو کہ اس کے لئے بڑے غیر معمولی ہیں۔ وہ کیا سوچتا ہے اور کیا کہتا ہے؟ اس لئے یہ انتہائی اہم ہے کہ دستاویزات کو بین السطور میں پڑھا جائے۔ بین السطور میں ذہن کے خیالات کو پڑھنا کوئی غلط نہیں

ہے' کیونکہ یہ کام لادوری اور گینز برگ نے کیا ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ اس طرح دستاویزات کو پڑھ اور ان سے مطلب اخذ کرنا ہمیشہ درست نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ سماجی طور پر نظروں سے اوجھل لوگ (جن میں کام کرنے والی عورتیں ہیں) یا ان لوگوں کی بات سننا کہ جو خاموش اکثریت ہیں' یہ خطرناک مہم جوئی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے روایتی تاریخ نویسی میں جب شارلیمن کے عہد کی سیاسی تاریخ کو لکھا جاتا ہے تو ماخذوں کی کمی ایسے ہی رکاوٹ کا سبب بنتی ہے جیسے کہ اگر سولہویں صدی میں مقبول عام کلچر پر لکھا جائے۔ (36)

مورخوں نے کافی توجہ زبانی شہادتوں پر بھی دی ہے۔ خاص طور سے ان مورخوں نے کہ جنہوں نے افریقہ کی تاریخ پر کام کیا ہے۔ جیسے یان واسینا (Jan Vasina) جو کہ صدیوں پرانی روایات کی صداقت کے بارے میں متذبذب ہے۔ پاؤم ٹامپسن نے بھی زبانی شہادتوں کی بنیاد پر ایڈورڈین عہد کی زندگی کو تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ اس پر بھی کافی بحث ہوتی ہے کہ جب مورخ انٹرویو لیتا ہے تو اس وقت کا ماحول اور شہادت دینے والے کے بیانات کی تصدیق کس طرح سے ہو۔ (37) یہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ جس طرح سے دستاویزات کی تصدیق چھان بین کے بعد ہو جاتی ہے' ابھی اس طرح سے زبانی شہادتوں کو نہیں پرکھا جا سکتا ہے۔ خیالات صدی کے ایک چوتھائی حصہ میں کیسے سفر کرتے ہیں' اور کس طرح ان کے سامنے ایک طویل راستہ اور طے کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر ان سب کا جائزہ لینا ہو تو واسینا کی کتاب جو زبانی روایات پر ہے اس کے پہلے ایڈیشن کو جو 1961ء میں چھپا تھا اس کا مقابلہ اس ایڈیشن سے کریں جو 1985ء میں دوبارہ سے نئی شکل میں اضافہ کے بعد چھپا ہے۔ (38)

صورت حال فوٹو گرافی' مصوری' اور کلچر کے سلسلہ میں بھی اس قسم کی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ فوٹو گرافی پر جو کام ہوا ہے (جس میں فلم بھی شامل ہے) اس نے اس مفروضہ کو توڑ دیا ہے کہ کیمرا حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فوٹو گرافر فوٹو لیتے وقت نہ صرف اپنی دلچسپی' پسند و ناپسند' عقائد' روایات' اور تعصبات کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے' بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مصوری کی روایات کو باقی رکھتا ہے اگر وکٹورین عہد کے کچھ فوٹو گرافس سترہویں صدی کے ڈچ مصوری کی

دیہاتی مناظر سے ملتے نظر آئیں گے۔ تو اس لئے کہ فوٹوگرافر اس عہد کی اس مصوری سے آگاہ تھا اور اس نے جن لوگوں کی تصویر لی ہے انہیں اسی طرح سے پوز کرنے کو کہا ہے۔ جیسے کہ ٹامس ٹارڈن نے بھی ایک ڈچ پینٹنگ کہ جس کا عنوان "Under the Greenwood Tree" تھا' اس کو بطور سب ٹائٹل استعمال کیا ہے۔

مورخوں کی طرح فوٹوگرافر بھی حقیقت کی عکاسی نہیں کرتے ہیں' بلکہ اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لہٰذا ابھی فوٹوگرافی کے اس پہلو پر بھی تجزیہ اور تنقید کی ضرورت ہے۔ لیکن اس لئے ایک لمبا راستہ ہے کہ جو طے کرنا ہے۔ (39)

مصوری کے سلسلہ میں بھی جو بیسویں صدی میں ایک جوش تھا وہ بھی اب ذرا سرد پڑ گیا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ بھی حالات کو یا ماضی کو سمجھنا ذرا مشکل ہی ہے۔ (40) مذہبی شبیہوں کے ذریعہ حقیقت تک پہنچنا اس لئے مسئلہ بن جاتا ہے کہ جب دوسرے مورخ ان شبیہوں کے ذریعہ سے محض مذہبی اور سیاسی رجحانات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ ڈیورر (Duerer) کی تصویروں کے ذریعہ روحانی بحران کی علامت کو بتاتے ہیں تو کچھ ان ہی سے ایک ایسے بحران کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ (41)

وہ کلچر کہ جس سے معاشرہ کی روزمرہ کی زندگی اور استعمال کی ہوئی اشیاء کے بارے میں پتہ چلتا ہے وہ روایتی طور پر آثار قدیمہ کے ماہرین کا شعبہ رہا ہے۔ خاص طور سے اس عہد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے کہ جس کی کوئی تحریری تاریخ نہ ہو۔ لیکن اب یہ ضروری نہیں رہا ہے کہ آثار قدیمہ کے ماہرین صرف اسی دور پر توجہ دیں کہ جو ماقبل تاریخ ہے' اب وہ قرون وسطیٰ' صنعتی انقلاب اور تاریخ کے مختلف ادوار کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ جن میں نوآبادیاتی دور کے امریکہ سے لے کر موجودہ دور کی خرچیلی سوسائٹی ہے (42)

مورخ بھی اب ان کی پیروی کر رہے ہیں' اگرچہ وہ ماضی کی کھدائی تو نہیں کرتے ہیں (ورسائی اور دوسری اہم تاریخی عمارتوں کی کھدائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے) لیکن ان عمارتوں کی ساخت اور ان کی تشکیل پر توجہ دے رہے ہیں۔ مثلاً جب انفرادیت کی

ابتداء اور اس کے عروج پر تحقیق کی جاتی ہے اور یہ کہ موجودہ دور میں نجی زندگی کا تصور کیسے ابھرا تو اس کی شہادتیں وہ نہ صرف ذاتی ڈائریوں سے لیتے ہیں بلکہ ان رویوں سے لیتے ہیں کہ جو اس عہد میں پروان چڑھے جیسے ہر فرد کا اپنا کپ (اس سے پہلے سارے لوگ ایک پیالہ کو استعمال کرتے تھے) کرسیاں (اس سے پہلے سب لوگوں کے لئے بنچیں ہوتی تھیں) اور سونے کے لئے خواب گاہیں۔ (43)

مادی کلچر کی ان شہادتوں کی تصدیق اس عہد کے ادب سے ہوتی ہے۔ کیا آثار قدیمہ کا علم اس سلسلہ میں ہماری اور مدد کر سکتا ہے۔ سر موزیز فنلے (Sir Moses Finley) نے کہا تھا کہ خاص قسم کی شہادتوں کو اگر محفوظ کر لیا جائے تو اس صورت میں آثار قدیمہ کے علم کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ (44) اس نے جو چیلنج دیا ہے اس کا موثر جواب دینے کی ضرورت ہے' لیکن قرون وسطیٰ تاریخ کے مابعد کے دور میں مادی کلچر سے جو شہادتیں لی جاتی ہیں' ان کی اہمیت اور تجزیہ کی ابھی ضرورت ہے۔

مادی کلچر کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جو مورخ اس کو بطور ماخذ استعمال کر رہے ہیں وہ اس کی اشیاء اور استعمال شدہ چیزوں سے زیادہ اس کے ادب سے معلومات اخذ کرتے ہیں۔ مورخوں کو اس میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اشیاء کی سماجی زندگی کیا ہوتی ہے یا یہ کہ جس کمیونٹی یا گروپ نے انہیں استعمال کیا ان کی سماجی زندگی کیسی تھی۔ یہ مواد وہ سیاحوں کے بیانات سے لیتے ہیں کہ جو ان کے بارے میں تفصیل سے ناتے ہیں' یا ان رجسٹروں سے کہ جن میں استعمال ہونے والی اشیاء کا اندراج ہوا تھا۔ ن شہادتوں کی مدد سے وہ سماجی زندگی کا بہترین تجزیہ کرتے ہیں۔ (45)

پچھلے دنوں کمیت (وہ اندازہ جو بلحاظ مقدار کیا جائے) کے ذریعہ تاریخی عمل کو دیکھنے کا رواج ہوا ہے۔ یہ طریقہ کار اقتصادیات اور آبادی کے ماہرین و مورخوں کے ہاں تو کافی عرصہ سے تھا۔ لیکن 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں یہ تاریخ کے دوسرے شعبوں میں بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ مثلاً امریکہ میں نئی سیاسی تاریخ کے لکھنے والے انتخابات میں ووٹوں کی تعداد کے ذریعہ حالات کے رخ کو دیکھتے ہیں۔ (46) فرانس میں سیریل تاریخ (اس کو سیریل اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اعداد و شمار کو

وقت کے لحاظ سے سیریز میں جمع کیا جاتا ہے) کو ابتداء میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے لئے استعمال کیا گیا' پھر آبادی کے تجزیہ کے لئے اور اب اسے مذہبی اور سیکولر ذہنیت کے جانچنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ (47) مثلاً یہ نتیجہ کہ فرانس میں عیسائیت کا زور کیسے کم ہوا' اس سے اخذ کیا گیا کہ ایسٹر کے تہوار میں لوگوں کی شرکت کم ہوتی چلی گئی۔ فرانس کے صوبہ پرووینس (Provence) میں موت کے بارے میں لوگوں کے تبدیل ہوتے ہوئے نظریات کو 3 لاکھ وصیتوں کے ذریعہ جانچا گیا' کہ اس میں نہ تو آخرت میں حساب کتاب کا ذکر تھا' اور نہ ہی یہ وصیت کے ان کی تجہیز و تکفین شاندار و مذہبی رسومات کے ساتھ ہو۔ (48)

موجودہ زمانہ میں شماریات اور کمپوٹر نے رانکے کی تاریخ کے ماخذ یعنی دستاویزات کو بھی متاثر کیا ہے۔ کیونکہ ماضی کی دستاویزات کو اب "ڈیٹا بنک" کے ذریعہ محفوظ کر لیا گیا ہے جس کی وجہ سے مورخوں کو ان کے استعمال میں سہولت ہو گئی ہے۔ (49)

یہ بھی صحیح ہے کہ اعداد و شمار کے عنصر نے ان کے حامی اور مخالف دونوں پیدا کر دیئے ہیں۔ دونوں اس کے استعمال پر مبالغہ آمیزی کی حد تک اس کے حق میں یا مخالفت میں دلائل دیتے ہیں۔ اعداد و شمار جھوٹے ہو سکتے ہیں' مگر یہی بات متن (Text) کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جس طرح اعداد و شمار کے ذریعہ دھوکہ دیا جا سکتا ہے' اس طرح سے متن کی بھی غلط طور پر تاویل کی جا سکتی ہے۔ مشین کے ذریعہ جس ڈیٹا کو پڑھا جاتا ہے وہ استعمال کرنے والے کے لئے کوئی جذبات نہیں رکھتی ہے' لیکن اسی قسم کی بات مسودات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو کہ بہت ناقص اور خراب رسم الخط میں ہوتے ہیں اور اس قدر خستہ ہوتے ہیں کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خاتمہ کے قریب ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تعصبات کو ختم کیا جائے اور اس قسم کے طریقوں کو دریافت کیا جائے کہ جن کے ذریعہ اعداد و شمار قابل اعتبار ہو جائیں۔

ان ماخذوں کو استعمال کے لئے ایک "نئی ڈپلومیسی" کی ضرورت ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال ایک بنی ڈکٹن (Benedictive) اسکالر یان موبی لون (Jean Mobillon) نے سترہویں صدی کے آخر میں اس وقت استعمال کیا تھا۔ جب وہ چارٹرز یا معاہدوں کو

بطور ماخذ استعمال کر رہا تھا کہ جو اس کے ہم عصر مورخوں کے لئے شک و شبہ کا باعث تھے (50) لیکن سوال یہ ہے کہ کون شماریات' فوٹو گرافی' اور زبانی تاریخ کے لئے موبی لون بننے کے لئے تیار ہو گا؟

تشریح کے مسائل

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مورخوں کے لئے تاریخی عمل کو سمجھنے اور تحریر کرنے کے لئے کئی طریقہ کار وجود میں آ گئے ہیں اور ان کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو کر آ گئی ہے کہ سماجی اور ثقافتی رجحانات کو اس طریقہ سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے جیسے کہ سیاسی واقعات کو' کیونکہ ان کے سمجھنے کے لئے ایک منظم اور باقاعدہ اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو ان کے عمل کی تشریح کر سکیں۔ اب مورخ پسند کریں یا نہ کریں' مگر انہیں ان سوالات کا جواب دینا ہو گا کہ جو اب تک سماجی علوم کے ماہرین کے ذمہ تھا۔ مثلاً یہ سوال کہ تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے والے کون ہیں: افراد یا جماعتیں و گروہ؟ کیا وہ کامیابی کے ساتھ معاشرے کے سماجی' سیاسی' اور ثقافتی ساخت اور اس کے دباؤ کو برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا یہ معاشرتی ڈھانچے آزادی کے عمل کو روکتے ہیں' یا وہ تاریخی ایجنٹوں کو یہ مواقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اور زیادہ آزادی سے تبدیلی کے عمل کے لئے کام کریں۔ (51)

1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں اقتصادی اور سماجی موضوعات کے مورخین تاریخ کے عمل میں ایک تعین شدہ منصوبے کی تکمیل کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھ رہے تھے' جیسے کہ مارکس نے تاریخی عمل میں معاشی عناصر کو اہمیت دی' یا بروڈل نے جغرافیائی ماحول کو' یا آبادی کے اتار چڑھاؤ کو (جو مالتھوس کے نظریہ آبادی میں ہے)۔ لیکن اب جس ماڈل کو اہمیت دی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ جس میں عام آدمی کو آزادی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے حرکت کرے' عمل کرے' اور بات چیت کرے' اور اپنے مفادات کے تحت مستحکم شدہ روایات انحراف کرتے ہوئے انہیں پورا کرے تاکہ وہ ہر صورت حال میں اپنی بقا کو سامنے رکھتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرے۔

تاریخ نویسی میں جو وسعت آئی ہے اس سے سیاسی تاریخ کی تشریح بھی بدل گئی

ہے۔ اس لئے اب سیاسی واقعات کو بھی کئی طرح سے بیان کیا جانے لگا ہے۔ مثلاً جب سے تاریخ کو نچلی سطح سے دیکھا جانے لگا ہے اس کے بعد سے سیاسی واقعات کی اہمیت بھی بدل گئی ہے مثلاً جو مورخ فرانسیسی انقلاب کو نچلی سطح سے دیکھتے ہیں تو ان کا نقطہ نظر ان مورخوں سے بالکل بدل جاتا ہے کہ جو اس واقعہ کو راہنماؤں' ان کے عمل اور ردعمل کی روشنی میں دیکھتے آئے ہیں۔ بلکہ وہ مورخ بھی کہ جو انقلاب کے راہنماؤں کے عمل کو اہمیت دیتے ہیں وہ بھی اب روایتی ماڈل سے ہٹ کر اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ انہوں نے اپنے نقطہ نظر میں مبالغہ آمیزی کی ہے۔

مورخوں کا ایک گروہ جو "سائکو مورخ" کہلاتے ہیں اور جن کی بڑی تعداد امریکہ میں ہے' انہوں نے فرائڈ کے نظریات کو تاریخ میں سمو کر واقعات کے تجزیہ کی نئے انداز میں کوشش کی ہے۔ ان میں ایک مورخ ایرک ایرکسن (Erik Erikson) نے "مارٹن لوتھر کنگ" اور شناخت کے مسئلہ پر تحقیق کر کے نئے گوشوں کو واضح کیا۔ اگرچہ "سائیکو تاریخ" پر زبردست تنقید بھی ہوئی کہ یہ تاریخ کو سکیڑ کر افراد کی شخصیت اور اس کی پیچیدگی کو کم کر رہے ہیں۔ (52)

تاریخی تشریح کے سلسلہ میں جو بحث و مباحثہ ہوئے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے بہتر ہے کہ ہٹلر کی مثال لی جائے۔ اس سے پہلے ہٹلر پر جو بحث ایچ۔ آر۔ ٹریور روپر (H. R. Trevor. Roper) اور اے۔ جے۔ پی۔ ٹیلر میں ہوئی تھی اس کا موضوع تھا کہ ہٹلر کے وقتی اور مستقبل کے منصوبے کیا تھے؟ یہ بحث روایتی ماڈل کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہوئی کہ جس میں فرد کے "شعوری اداروں" یا شعوری منصوبوں کو دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ مباحثہ اس سے ہٹ کر وسیع تناظر میں ہونے لگا ہے۔ مثلاً ایک مورخ روبرٹ ویٹ (Robert-waite) کا کہنا ہے کہ ہٹلر کے منصوبے غیر شعوری اور نفسیاتی الجھنوں کی پیداوار تھے۔ اس کے ثبوت میں وہ اس کی غیر معمولی جنسی خواہشات' اس کی ماں کی موت کا صدمہ (جس کا علاج ایک یہودی ڈاکٹر نے کیا تھا) اور اسی قسم کی دوسری مثالیں دیتا ہے۔ (53)

مورخوں کا ایک دوسرا گروہ اس "ارادیت" کے تصور کو بالکل رد کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ "ساختیاتی مورخ" اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ہٹلر

کی "تیسری ریپبلک" کو اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ وہ کون لوگ تھے کہ جو اس کے اردگرد تھے۔ حکومت کی انتظامیہ کو دیکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ فیصلے کن مراحل کے بعد ہوتے تھے اور ان میں کون کون شریک ہوتے تھے اور پھر نازی ازم کو ایک سیاسی تحریک کے طور پر دیکھا جائے۔ (54) مورخوں کی ایک جماعت اور ہے جو کہ ساخت اور سائیکو تاریخ دونوں کو ملا کر اس تشریح پر توجہ دیتے ہیں کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے کہ جن کی وجہ سے لوگ ہٹلر کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ (55)

آخر ہٹلر کی ایک دلچسپ مگر کنفیوز کرنے والی بحث کا کیا ہوا؟ اس کا حشر بھی وہی ہوا کہ جو اکثر تاریخی مباحثوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے' یعنی اس کو زیادہ دیر تک باقاعدگی کے ساتھ نہیں چلایا گیا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ تاریخ کو تشریح کرنے کا روایتی طریقہ کار ٹوٹ گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی جگہ کوئی اور لے گا' یا اب اسی صورت حال میں اور تاریخی مباحث ہوتے رہیں گے۔

لیکن اگر تاریخ کی نئی تشریح پر اتفاق رائے ہوتی ہے تو "تاریخی سائیکلوجی" اس میں ایک اہم کردار ادا کرے گی کیونکہ یہ اس کا تجزیہ کرے گی کہ تاریخی عمل میں فرد یا جماعت کے کیا شعور اور غیر شعوری ارادے ہوتے ہیں؟ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ اس پہلو میں کافی پیش رفت ہو رہی ہے۔ اب امنگ' اولوالعزمی' غصہ' ڈر' خوف' احساس جرم' منافقت' محبت' غرور' تحفظ' اور اس طرح کے دوسرے جذبات و احساسات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ (56)

سائیکلوجی تاریخ کے تحت تاریخ لکھنے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ماضی کے لوگ بھی ہماری طرح سے سوچتے تھے اور اسی طرح سے احساسات کے مالک تھے تو اس صورت میں ماضی یکساں ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کو پوری طرح سے سمجھنا مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر مورخ مخمصہ میں پھنس جاتے ہیں۔ اگر وہ مختلف ادوار میں سماجی رویوں کو یکساں طور سے دیکھیں تو اس میں سطحیت آ جاتی ہے۔ اگر وہ ہر دور میں افراد اور جماعتوں کے رویوں ان کے ماحول اور روایات میں دیکھیں تو اس صورت میں وہ ان کے کردار کی لچک اور ان کے عمل کی

آزادی کو ان کے زمانے میں اسیر کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اس صورت حال سے نکلنے کے لئے پیر بوردیو (Pierre Boerdieu) نے ایک حل نکالا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی گروپ کو اس کے مخصوص ماحول میں دیکھا جائے کہ اس کے اردگرد جو چیلنج تھے ان کا اس نے کیا حل نکالا۔ اس میں گروپ کی آزادی کو جو ایک ماحول اور محدود ثقافتی دائرہ میں تھی۔ اس کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ (57)

اگرچہ مشکلات بہت ہیں لیکن پھر بھی نئی تاریخ لکھنے والوں نے روایتی تاریخ پر تنقید کر کے اور نئی راہیں کھول کر تاریخی عمل میں فرد اور گروہوں کے نئے انداز میں مطالعہ کرنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ (58) دوسری طرف انہوں نے ان مادی عناصر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی کہ جن میں طبعی ماحول' اس کے ذرائع و ماخذ شامل ہیں۔ ابھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ان پر بھی پوری توجہ دی جائے۔

ہم آہنگی کے مسائل

مورخوں کی دنیا میں جو وسعت آئی ہے اور تاریخ کا دوسرے علوم سے جو رشتہ و تعلق قائم ہوا ہے اس رویہ کو خوش آئند کہا جا سکتا ہے' مگر اس کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اس کی قیمت بھی ہے۔ اس وقت تاریخ کا علم پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اقتصادیات کے مورخ اب ماہرین معیشت کی زبان میں' علم و ادب اور دانش وری کے موضوعات پر کام کرنے والے فلسفیوں کی زبان' سماجی تاریخ کے ماہرین علوم سماجیات اور بشریات کی زبان بول رہے ہیں۔ ان مورخوں کے لئے یہ دشوار ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں۔ کیا ہم اس صورت حال کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں؟ اور کیا یہ امید ہے کہ یہ آپس میں ہم آہنگ ہو جائیں؟

اس سلسلہ میں جواب دینا مشکل ہے۔ ہاں یہاں میں اپنی ذاتی رائے ضرور دے سکتا ہوں جسے دو متضاد نقطہ ہائے نظر میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تاریخ کے علم میں جو تقسیم ہوئی ہے یہ لازمی تھی اور یہ صرف تاریخ تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے علوم بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً محنت کی تقسیم کو ہم اپنے صنعتی معاشرے میں بخوبی

دیکھ سکتے ہیں- یہ تقسیم تاریخ کے لئے مفید ثابت ہوئی ہے کیونکہ اس نے انسانی ذہن کو سمجھنے کے لئے علم کی نئی راہوں کو تلاش کیا ہے اور اس کو معیاری بنانے کے لئے تحقیق کو مشکل، اور منظم بنا دیا ہے-

لیکن جہاں منافع ہوتا ہے وہاں اس کی قیمت بھی ادا کرنی ہوتی ہے- لیکن ہمارے لئے بہرحال یہ ممکن ہے کہ ہم اس دانشوری کی قیمت کو کم سے کم رکھیں- یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ علوم اور اس کی شاخوں میں ایک دوسرے سے تعلق ضرور ہوتا ہے- لہٰذا علم تاریخ کے معاملہ میں دوسرے علوم سے ہم آہنگی نہیں تو ایک دوسرے سے مفاہمت ضرور ہے-

یہ صحیح ہے کہ جب ساختیاتی تاریخ کی ابتداء ہوئی تو جوش میں آ کر واقعاتی تاریخ کو فراموش کر دیا گیا- یہی حال سماجی تاریخ کے سلسلہ میں ہوا کہ سیاسی تاریخ کو اس کے سامنے حقیر سمجھا جانے لگا اور روایتی سیاسی تاریخ لکھنے والوں کے خلاف تعصب آمیز رویہ اختیار کیا گیا- عورتوں کی تاریخ اور مقبول کلچر کی تاریخ کو اس طرح سے آزادانہ شعبوں کے طور پر لیا گیا جیسے کہ یہ عام انسانی تاریخ اور معاشرے کے کلچر سے جدا ہیں- روزمرہ کی تاریخ دراصل اس تاریخ نویسی کا ردعمل ہے کہ جس میں وسیع تناظر میں سماجی رویوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ بغیر کسی انسانی جذبات کے سامنے آتا ہے-

اس صورت حال میں اس ردعمل کے خلاف بھی ایک ردعمل ہے، وہ تلاش ایک مرکز کی ہے کہ جہاں سب جمع ہو سکیں- اس وقت مقبول عام کلچر کے مورخین نچلی اور اونچی سطح کے کلچروں کے درمیان باہمی تعلقات کا تجزیہ کر رہے ہیں- (59) عورتوں کی تاریخ لکھنے والے اب جنسی تفریق اور ان کے رشتوں کو سمجھ کر عورتوں اور مردوں کی تاریخ کو تشکیل دے رہے ہیں- (60) واقعہ اور تشکیل (ڈھانچہ) کے درمیان جو فرق تھا اور وہ ان دونوں کے درمیان تعلقات کی جگہ لے رہا ہے-

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سیاسی اور غیر سیاسی مورخوں کے درمیان مخالفت ختم ہو رہی ہے- جی- ایم- ٹریولن (G. M. Trevelin) کی سماجی تاریخ کے بارے میں یہ رائے کہ یہ سیاسی تاریخ کا گمشدہ حصہ ہے، اب مسترد ہو گئی ہے اب ہمیں سیاسی تاریخ

میں سماجی اور سماجی تاریخ میں سیاسی عناصر ملنے لگے ہیں اور اب سیاسی تاریخ کے مورخ بھی طبقہ اعلیٰ کے مورخ نہیں رہے ہیں۔ اب وہ انتخابات پر لکھتے ہوئے اس کے سماجی اور جغرافیائی پہلوؤں پر بھی توجہ دیتے ہیں اور گاؤں کی جمہوریت پر بھی ان کی نظریں پڑنے لگی ہیں۔ (61) وہ سیاسی کلچر کا بھی تجزیہ کرتے ہیں اور اس مفروضہ کو بھی دیکھتے ہیں کہ کیا سیاست روزمرہ کا حصہ ہے؟ لیکن یہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں مختلف ہے۔ اب معاشرہ اور کلچر کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہاں فیصلے کئے جاتے ہیں، اس لئے "خاندان کی سیاست" زبان کی سیاست مورخوں کے لئے موضوعات بن گئے ہیں۔ یا یہ کہ رسومات کس طرح سے موثر ہوتی ہیں اور اس کا اظہار کرتی ہیں۔ (62) امریکی مورخ مائیکل کامن (Michael Kammen) کا کہنا ہے کہ علم بشریات کے مفہوم میں کلچر ایک ایسا شعبہ ہے کہ جو تاریخ کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک مرکز پر لا کر متحد کر سکتا ہے۔ (63)

بہرحال بروڈل نے مکمل تاریخ کا جو خاکہ پیش کیا ہے ابھی ہم اس کی تکمیل سے بہت دور ہیں۔ یہ سوچنا کہ ہم اس مقصد میں کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے ـــــ "غلط ہے، لیکن ہمیں اس کی جانب کئی قدم اور اٹھانا ہوں گے۔"

REFERENCE

1. This essay owes a great deal to discussions with Raphael Samuel over many years; to Gwyn Prins and several generations of students at Emmanuel College Cambrideg; and more recently to Nilo Odalia and the lively audience at my lectures at the Universidade Estadual de São Paulo at Araraquarn in 1989.
2. For a famous (and debatabte) example. see R.W. Fogel and S. Engerman, *Time on the Cross* (Boston. 1974). There is a judicious assessment of the position of economic history today in D. C. Coleman. *History and the Economic Past* (Oxford, 1987).

3. J. Vincent, *The Formation of the British Liberal Party* (London, 1966).
4. Other varieties are surveyed in *What is History Today?* ed. J. Gardiner (London, 1988).
5. J. Le Goff, (ed), *La nouvelle histoire* (Paris, 1978): J. Le Goff and P. Nora (eds), *Faire de yL'histoire* (3 vols, Paris, 1974). Some of the essays in this collection are available in English: J. Le Goff and P. Nora, (eds). *Constructing the Past* (Cambridge, 1985).
6. T. S. Kuhn, *The Structure of Scientific Revolutions* (New York, 1961).
7. J. B. S. Haldane, *Everything has a History* (London, 1951).
8. P. Aries, *Centuries of Childhood tr.* R. Baklick (London, 1962); P. Aries, *The Hour of Our Death tr.* 11. Weaver (London, 1981); M. Foucault. *Madness and Civilisation, tr.* R. Howard (London, 1967); E. Le Roy Ladurie, *Times of Feast, Times of Famine tr.* B. Bray (New York), 1971); A. Corbin, *The Foul and the Fragrant.* translation (Leamington, 1986); G. Vigarello, *Concepts of Cleanliness,* translation (Cambridge, 1988); J. C. Schmitt (ed.), *Gestures,* special issue, *History and Anthropology I* (1984); R. Bauman, *Let Your Words be Few* (Cambridge, 1984).
9. F. Braudel, *The Mediterranean and the Mediterranean World in the Age of Philip II,* tr. S. Reynolds, 2nd edn (2 vols, London 1972-3).
10. The examiner's name was Lewis Namier. R. Cobb, *The Police and the People,* (Oxford, 1970), p.81.
11. E. Hoornaert et al., *Historia da Igreja no Brasil: ensaio de interpretacao a Partir do povo,* Petropolis, 1977.
12. J. G. A. Pocock, 'The Concept of a Language', in *The Language of Political Theory.* (ed.) A.

Pagden (Cambridge, 1987). Cf. D. Kelley: 'Horizons of Intellectual History'. *Journal of the History of Ideas* 18 (1987), pp. 143-69. and 'What is Happening to the History of Ideas? *Journal of the History of Ideas 51* (1990). pp. 3-25.

13. R. G. Collingwood. *The Idea of History.* (Oxford, 1946). pp. 213ft.
14. Braudel (1949).
15. Ouoted in *Varieties of History*. ed. F. Stern (New York, 1956). p. 249.
16. I take the term from the famous Russian critic Mikhail Bakhtin, in his *Dialogic Imagination,* tr. C. Emerson and M. Holquist (Austin, 1981). pp. xix, 49, 55, 263, 273 Cf. M. de Certeau, *Heterologies: Discourse on the Other, tr.* B. Massumi (Minneapolis, 1986).
17. See almost any issue of the History Workshop Journal.
18. Cf. P. Burke, *The French Historieal Revolut*[illegible] (Cambridge, 1990). p. 113.
19. J. H. R[illegible]son, *The New History* (New York, 1912); ef. J. R. Pole, 'The New History and the Sense of Social Purpose in American Historieal Writing' (1973, reprinted in his *Paths to the American Past* (New York, 1979, pp. 271-98).
20. L. Orr. 'The Revenge of Literature', *New Literary History* 18. 1986), pp. 1-22.
21. R. Fruin, 'De nieuwe historiographie', reprinted in this *Verspreide Geschriften* 9 (The Hague, 1904, pp. 410-18.
22. M. Harbsmeier. 'World Histories before Domestication' *Culture and History* 5 (1989) pp. 93-131.
23. W. Alexander, *The History of Women* (London, 1979); C. Meiners, *Geschiehte des weibliechen Geschlechts* (4 vols. Hanover, 1788-1800).

24. W. Cronon, *Changes in the Land* (New York, 1983); A. W. Crosby, *Ecological Imperialism* (Cambridge, 1986).
25. There are some sharp comments on this problem in E. Said, *Orientalism* (London 1978).
26. E. De Decca, 1930: *o silencio dos vencidos* (Sao Paulo, 1981).
27. Cf. R. Porter, 'The Patient's View: Doing Medical History from Below', *Theory and Society* 14 (1985), pp. 175-98.
28. On the ordinary soldiers, see J. Keegan, *The face of Battle* (London, 1976).
29. J. Oxouf, (ed.), *Nous les maitres d'ecole* (Paris, 1967) examines the experience of elementary school-teachers c. 1914.
30. L. Hunt, (ed.), *The New Cultural History* (Berkeley, 1989).
31. F. Braudel, *Civilisation materielle et capitalisme* (Paris, 1967); revised ed. *Les Structures du quotidien* (Paris, 1979); *The Structures of Everyday Life, tr.* M. Kochan (London, 1981). Cf. J. Kuczynski, *Geschichte des Alltags des Deutschen Volkes* (4 vols, Berlin, 1980-2).
32. M. De Certeau, *L'invention du quotidien* (Paris, 1980); E. Goffman, *The Presentation of Self in Everyday Life* (New York, 1959); H. Lefebvre, *Critique de la vie quotidienne* (3 vols, Paris, 1946-81). Cf. F. Mackie, *The Status of Everyday Life* (Lodnon, 1985).
33. J. Lotman, 'the Poetics of Every Day Behaviour in Russian Eighteenth-Century Culture', in *The Semiotics of Russian Clture,* ed. J. Lotman and B. A. Uspenskii (Ann Arbor, 1984), pp. 231-56. A fuller discussion of the problem of writing the history of cultural rules is in P. Burke, *Historical Anthropology of*

Early Modern Italy (Cambridge, 1987), pp. 5ff, 21ff.

34. L. Hunt, ed., *The New Cultural History* (Berkeley, 1989)
35. N. Elias, 'Zum Begriff des Alltags' in *Materiellen zur Soziologie des Alltags,* ed. K. Hammerich and M. Klein (Opladen, 1978), pp. 22-9.
36. Cf. P. Burke, *Popular Culture in Early Modern Europe* (London, 1978), chapter 3.
37. R. Samuel and P. Thompson, (eds), *The Myths We Live By* (London, 1990).
38. P. Thompson, *The Voice of the Past* 1978; revised ed., Oxford, 1988); J. Vansina, *Oral Tradition, tr.* H.M. Wright (London, 1965) and *Oral Tradition as History* (Madison, 1985)
39. P. Smith, (ed.), *The Historian and Film* (Cambridge 1976); A. Trachtenberg, 'Albums of War', *Representations* 9 (1985) pp. 1-32; J. Tagg, *The burden of Representation: Essays on Photographies and Histories* (Amherst, 1988).

40. E. Panofsky, *Essay in Iconology* (New York, 1939); E. Wind, *Pagan Mysteries in the Renaissance* (London, 1958). A more sceptical point of view is expressed by E. H. Gombrich, 'Aims and Limits of Iconology' in his *Symbolic Images* (London, 1972), pp. 1-22.
41. C. Ginzburg, ' Da Aby Warburg a E. H. Gombrich', *Studi Medievali* 8 (1966) pp. 1015-65. His criticism was directed against Fritz Saxl in particular. On iconography for historians of mentalities see, M. Vovelle (ed.), *Iconographie et historie des mentalites* (Aix, 1979).
42. K. Hudson, *The Archaeology of the Consumer Society* (London, 1983).

43. J. Deetz, *In Small Things Forgotten: the Archaeology of Early American Life* (New York, 1977).
44. M. I. Finley, *The Use and Abuse of History* (London, 1975), p. 101.
45. A. Appadurai, (ed.), *The Social Life of Things* (Cambridge, 1986).
46. W. Aydelotte, *Quantification in History* (Reading, Mass., 1971); *A. Bogue, Clio and the Bitch Goddess: Quantification in American Political History* (beverly Hills, 1983).
47. P. Chaunu, 'Le quantitatif au 3e niveau' (1973: reprinted in his *Histoire quantitatif, histoire serielle* (Paris, 1978).
48. G. Le Bras, *Etudes de sociologie religieuse* (2 vols, Paris 1955-6); M. Vovelle, *piete baroque et dechristianisation* (Paris, 1973).
49. G. Henningsen, 'El "Banco de datos" del Santo Oficio', *Boletin de la Real Academia de Historia* 174 (1977), pp. 547-70.
50. J. Mabillon, *De re diplomatica* (Paris, 1681).
51. C. Lioyd, *Explanation in Social History* (Oxford, 1986) offers a general survey. More accessible to non-philosophers is S. James, *The Content of Social Explanation* (Cambridge, 1984).
52. E. Erikson, *Young Man Luther* (New York, 1958); P. Gay, *Freud for Historians* (New York, 1985); D. Stannard, *Shrinking History* (New York, 1980).
53. R. G. L. Waite, *The Psychopathic God*: Adolf Hitler (New York, 1977).
54. I take the distinction between 'intentionalists' and 'functionalists' from T. Mason, 'Intention and Explanation' in *The Fuhrer State, Myth and Reality*, ed. G. Hirschfeld and L. Kettenacker (Stuttgart, 1981). pp. 23-40. My

thanks to Ian Kershaw for bringing this article to my attention.

55. P. Lowenberg, 'The Psychohistorical Origins of the Nazi Youth Cohort', *American Historical Review* 76 (1971), pp. 1457-502.
56. J. Delumeau, *La peur en occident* (Paris, 1978); and *Rassurer et proteger* (Paris, 1989); P. N. and C. Z. Stearns, 'Emotionology', *American Historical Review* 90 (1986), pp. 813-36; C. Z. and P. N. Stearns, *Anger* (Chicago, 1986); T. Zeldin, *France* 1848-1945 (2 vols, Oxford 1973-7).
57. P. Bourdieu, *Outline of a Theory of Practice, tr:* R. Nice (Cambridge, 1977).
58. The argument is unusually explicit in G. Sider, *Culture and Class in Anthropology and History* (Cambridge and Paris, 1986).
59. A. Gurevich, Medieval *Popular Culture, tr.* J. M. Bak and P. A. Hollingsworth (Cambridge, 1988).
60. Editorial collective, 'Why Gender and History? *Gender and History* 1 (1989) pp. 1-6.
61. M. Agulhon, *The Republic in the Village, tr.* J. Lloyd (Cambridge, 1982).
62. M. Segalen, *Love and Power in the Peasant Family, tr.* S. Matthews (Cambridge, 1983); O. Smith, *The Politics of Language 1791-1815* (Oxford, 1984); D. Cannadine and S. Price, (eds) *Rituals of Royalty* (Cambridge, 1987).
63. M. Kammen, 'Extending the Reach of American Cultural History' *American Studies* 29 (1984), pp. 19-42.

زبانی تاریخ

گین پرنس / ڈاکٹر مبارک علی

جدید دور کے پروفیشنل مورخ جو کہ پڑھے لکھے اور صنعتی معاشروں میں رہتے ہیں- وہ زبانی روایات کی بنیاد پر ماضی کی تشکیل سے خوش نہیں اور اس عمل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں- مثلاً اے- جی- ٹیلر نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ "اس معاملہ میں' میں مکمل طور پر شبہات کا شکار ہوں- یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ بوڑھے لوگ اپنی جوانی کو یاد کر کے دگلی یا مذاق کرتے ہوں' اس کا مضحکہ اڑاتے ہوں- اس لئے میں زبانی تاریخ کا قائل نہیں ہوں-"

لیکن ان میں سے تھوڑے بہت اب زبانی تاریخ کی اہمیت کو ماننے لگے ہیں- ایک ایسی تاریخ کہ جو دستاویزات کے بجائے زندہ لوگوں کی شہادت پر لکھی جاتی ہے- لیکن اب بھی ایسے لوگ ہیں کہ جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک جدید معاشرے میں کہ جہاں دستاویزات اور تحریری مواد موجود ہے' وہاں زبانی تاریخ کی اہمیت نہیں ہے- ان کا کہنا ہے کہ اسٹڈیز ٹریکل (Stud Turikel) نے جو عوامی تاریخیں اقتصادی بحران (1929ء) اور دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی ہیں' انہوں نے ان اہم واقعات کے بارے میں کوئی نیا نظریہ' سوچ' یا روشنی نہیں دی ہے-

زبانی ماخذوں کے بارے میں اس قسم کے شکوک و شبہات اور خیالات اس قدر عام ہیں کہ انہیں دور کرنا بڑا مشکل ہے- اس لئے وہ معاشرے کے جہاں تحریری مواد نہیں ہے ان کے لئے روایتی طور پر اپنی تاریخ تشکیل دینے کا کام ناممکن ہو جاتا ہے- اگرچہ آرتھر ماروک (Arthur Marwick) نے اپنی کتاب "دی نیچر آف ہسٹری" (The Nature of History) میں لکھا ہے کہ وہ تاریخ کہ جو دستاویزات کی مدد کے بغیر لکھی جائے جیسے کہ افریقہ کے لوگوں کی تاریخ' چاہے وہ اطمینان بخش نہ ہو' اور

سطحی ہو' لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ بہرحال پھر بھی تاریخ ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ لوگ بھی ہیں کہ جو بغیر دستاویزاتی ثبوت کے کسی اور چیز کو تاریخ ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ جب سے کہ رانکے کے طریقہ کار کے مطابق تاریخ کو لکھنے کا رواج ہوا ہے اس وقت سے افریقہ کو غیر تاریخی براعظم کے طور پر دیکھا جانے لگا ہے۔ 1931ء میں ہیگل نے اس کے بارے میں کہا کہ "یہ دنیا کی تاریخ کا حصہ نہیں ہے" اس طرح سے 1965ء میں ہیو ٹریور روپر نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ افریقہ کی کوئی تاریخ نہیں سوائے اس کے کہ وحشی قبائلوں کا ایک چکر ہے جو جاری ہے۔ (1) لیکن دیکھا جائے تو یہ نقطہ نظر صرف افریقہ کے لئے ہی نہیں ہے۔ ہندوستان کے گاؤں جو کہ ایشیائی طریقہ پیداوار کی وجہ سے' صرف اپنی ہی ضرورت کے لئے پیدا کرتے رہے۔ سورج کی گرمی میں پگھلتے رہے اور سیاست کے گھنے بادلوں سے محروم رہے۔ یہ مارکس کا کہنا تھا۔ وہ مارکسٹ جو کہ نوآبادیاتی نظام کے مخالف ہیں' مسلسل مارکس کے اس نقطہ نظر کے دفاع میں اور یہ ثابت کرنے میں مصروف ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ جو اس نے کہا۔

بہرحال اس سلسلہ میں ہمدردوں اور مخالفوں دونوں کا اصرار ہے کہ تاریخ نویسی میں رانکے کے قائم کردہ اصولوں کو اپنایا جائے کہ جن میں سب سے زیادہ اہمیت سرکاری دستاویزات کو دی گئی ہے اگر سرکاری دستاویزات موجود نہ ہوں' تو اس صورت میں دوسرے ماخذوں پر توجہ دی جا سکتی ہے مگر یہ ماخذ ثانوی حیثیت کے ہوں گے۔ اس لحاظ سے ان کی وہ حیثیت نہیں ہو گی جو کہ سرکاری دستاویزات کی ہے۔ اس زمرے میں زبانی تاریخ ثانوی ماخذ میں آتی ہے' لہٰذا اس کی بنیاد پر جو تاریخ لکھی جائے گی اس کی حیثیت بھی ثانوی ہی ہو گی۔

جن مورخوں نے زبانی روایات کو تاریخ میں بطور ماخذ کے استعمال کیا ہے' جب وہ اس تنقید کو سنتے ہیں تو کچھ تو بہت زیادہ تلخ ہو جاتے ہیں اور کچھ اس کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے ہیں۔ پال ٹامپسن (Paul Thomason) جو کہ زبانی روایات پر تاریخ نویسی کے اہم مورخوں میں سے ایک ہے اور جو سماجی تاریخ میں زبانی روایات کے کردار کا پرزور حامی ہے۔ وہ ان کی بنیاد پر ان محروم اور فراموش شدہ لوگوں کی تاریخ کو

تشکیل دے رہا ہے کہ جنہیں اعلیٰ سطح کی تاریخ نے کوئی جگہ نہیں دی ہے۔ اپنی کتاب "ماضی کی آواز" (Voice of the Past) میں بڑے غصہ میں لکھتا ہے کہ:

> زبانی تاریخ کی مخالفت کا دعویٰ جذبات و احساسات اور اصولوں کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ پرانی نسل کے مورخ کہ جو شعبوں کے سربراہ ہیں اور جن کے پاس مالی وسائل خرچ کرنے کا اختیار ہے وہ اس نئے طریقہ کار سے تشویش میں مبتلا ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ اب زیادہ عرصہ تک اپنے روایتی طریقوں کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گے۔ اس لئے وہ ان نوجوانوں کو بدنام کر رہے ہیں کہ جو ہاتھوں میں ٹیپ ریکارڈز لئے گلیوں گلیوں جا رہے ہیں۔ (2)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم عصر مورخوں کے درمیان زبانی تاریخ کے ماخذوں کے بارے میں جو اختلافات ہیں' اور اس کے اظہار کے لئے جو زبان اختیار کی گئی ہے اس سے دونوں جانب کے جذبات کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ لیکن زبانی تاریخ کی جو اہمیت غیر تعلیم یافتہ معاشروں میں ہے' اس کے بارے میں یان واسینا (Jan Vasina) نے کہ جو افریقہ کی زبانی تاریخ کا ماہر ہے' اس نے ماروک کے نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہوئے اپنے مینی فیسٹو "زبانی روایت بطور تاریخ" (Oral Tradition as History) میں کہا ہے کہ:

> جہاں کوئی تحریری مواد موجود ہی نہ ہو وہاں زبانی روایت کو یہ ذمہ داری سنبھالنی پڑتی ہے کہ وہ تاریخ کی تشکیل نو کرے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ یہ کام اس طرح سے تو نہیں کرتی کہ جو تحریری مواد کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ تحریر ایک ٹیکنیکل معجزہ ہے..... زبانی روایت میں جو کمی ہے اس کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کوششوں کو سراہنا چاہئے جو تاریخ کی تشکیل نو کے سلسلہ میں کی گئیں ہیں۔ اگرچہ وہ جامع اور مکمل نہیں' لیکن پھر بھی انہوں نے تاریخ کو بنیاد فراہم کی۔ یہ صحیح ہے کہ زبانی روایت کی بنیاد پر جو تاریخ لکھی جاتی ہے وہ اس لحاظ سے کم تر ہے کہ اس کے حقائق

کو جانچنے کے لئے اور دوسرا کوئی مواد نہیں ہے۔ (3)

یہاں اس نکتہ پر غور کیجئے کہ جو اس نے بیان کیا ہے کہ زبانی روایات کی وہاں اہمیت ہو جاتی ہے کہ جہاں اور دوسرا کوئی مواد موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کہنا ہے کہ جہاں تحریری مواد ناکام ہو جاتا ہے وہاں زبانی روایت کام آتی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ زبانی ماخذ دوسرے نقطہ ہائے نظر کو درست کرتے ہیں' نہ ہی زبانی ماخذ سے جو تاریخ بنتی ہے وہ دوسرے ماخذوں سے درست ہوتی ہے۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ آخر زبانی ماخذوں کے بارے میں اس قدر تنازع کیوں ہے؟ پال تامپسن کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانے پروفیسر نئے طریقہ کار اور نئے انداز کو اختیار کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ وہ تاریخ نویسی میں ہر نئی چیز کو رائج کے متعین شدہ تاریخ کے اصولوں کے خلاف سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ شاید یہ درست ہو' لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی تہہ میں اور دوسری وجوہات ہیں۔ عام طور پر مورخ پڑھے لکھے معاشروں میں رہتے ہیں کہ جہاں زبانی الفاظ کی کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے تحریر باعث فخر ہو جاتی ہے' اور لکھے ہوئے الفاظ کی عزت کی جاتی ہے۔ اور کیوں نہ کی جائے؟ جیسا کہ واسینا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علامات اور تحریری زبان کے ذریعہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا انسان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اگرچہ پڑھے لکھے لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ نیوزی لینڈ کے ماوریوں کی مثال کو سامنے رکھیں تو اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ انہوں نے یورپی تسلط کے پھیلاؤ کے زمانے میں حالات کو مشاہدہ کرتے ہوئے انہیں پوری طرح سے سمجھ لیا تھا' لیکن وہ اپنی تمام تر توانائی کے باوجود تحریری علم کو اپنے قابو میں نہیں لا سکے اور یورپیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

مثلاً 1833ء میں 500 ماوری پڑھ لکھ سکتے تھے' اس کے ایک سال کے اندر اندر ان کی تعداد 10,000 ہو گئی 1840ء میں جب کہ معاہدہ ویتانگی (Waitangi) ہوا کہ جس کے تحت ماوری سرداروں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا (یا یہ کہ برطانوی تسلط سے وہ مستفید ہوئے۔ یہ تشریح آپ کے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہو گی) تو اس دوران میں ایک سیاح نے ان کی صحت کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کہ اب وہ دوڑنے بھاگنے

کے بجائے ایک جگہ بیٹھنے والے ہو گئے' کیونکہ اسی حالت میں رہتے ہوئے وہ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ 1848ء میں ولیم کولنسو (William Colenso) جو مصور بھی تھا اور ایک پروٹسٹنٹ مشنری کارکن بھی' اس نے ماوری زبان میں بائبل کا ترجمہ تیار کیا اور اسے ماوری لوگوں میں تقسیم کیا۔ 1844ء میں گورنر جارج گرے کا خیال تھا کہ ماوری آبادی بھی اسی قدر پڑھی لکھی ہے جس قدر کہ یورپی۔ آخر لکھنے میں وہ کون سی طاقت چھپی ہوئی تھی کہ جس کی وجہ سے ماوری لوگوں نے اسے سیکھا؟

اس جذبہ کے پس منظر میں تین قسم کی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ لیکن بطور مفتوح اور کم پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے انہوں نے علم کے صرف ایک حصہ ہی کی تحصیل کی۔ مثلاً ابتدائی میں ماوری لوگوں نے کتاب کو ٹوٹم کے طور پر لیا اور اس کے صفحات کو اپنے چھدے ہوئے کانوں میں ٹھونس لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس طرح سے کتاب یا ٹوٹم سے جسمانی تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔

تحریری متن کو نہ سمجھنا ان کی دوسری کمزوری تھی۔ جب 1840ء میں معاہدہ ویٹانگی ہوا تو ماوری لوگ اس زبان کو تو سمجھ گئے' مگر اس کے قانونی پہلوؤں کو نہ سمجھ سکے۔ اس وجہ سے ان کی زمینیں جو وہ جنگ میں نہیں ہارے تھے اس معاہدے کے تحت ہار گئے۔ (4) تیسری اہم بات یہ تھی کہ ماوری اپنے بکھرے علم کو ایک جگہ جمع نہیں کر سکے تاکہ اس کی مدد سے حالات کی تبدیلی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو سمجھ سکتے۔ یہ وہ اسٹیج تھی کہ جس میں وہ تحریری علم کے سحر سے ایک جگہ ٹھہر گئے تھے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ عملی طور پر متحرک نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ تحریری الفاظ کے شکار ہوئے' ان پر قابو پا کر اور انہیں استعمال کر کے مالک نہیں ہوئے۔

قدیم مشرق وسطی میں کہ جہاں لوہا' اناج تھا اور جہاں جانوروں کو سدھایا گیا تھا۔ (5) وہاں تحریر کے ذریعہ انسان نے اپنے جذبات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ دیکھا جائے زبانی بات چیت ناپائدار ہوتی ہے' جب کہ تحریر مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تحریر کو اس وقت اہمیت ملتی ہے کہ جب الفاظ کا تعین ہو جاتا ہے کہ زبان کو کیسے لکھا جائے۔

جیک گڈی (Jack Goody) نے اپنی کتاب "وحشی ذہن کو سدھانا"

(Domestication of Savage Mind) میں کہا ہے کہ تحریری علم کی طاقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مارکس کی ان اصطلاحات سے مدد لے لی جائے جو اس نے ذرائع ابلاغ کے سلسلہ میں وضع کی ہیں' یعنی ابلاغ کے ذرائع اور ان کا باہمی تعلق' رشتہ' یعنی اس کے مادی اور سماجی ثقافتی پہلو کہ جن کو باہمی طور پر ملا کر دیکھنا چاہئے۔

جب ہم موجودہ دور کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں ہیں کہ جہاں ہر قسم کا لٹریچر موجود ہے اور تحریر کا ایک مبسوط رسم الخط ہے' اس کے پس منظر میں جب ہم ماضی کو دیکھتے ہیں تو وہاں تین قسم کے ابلاغ کے ذرائع ملتے ہیں:

1- زبانی کلچر کہ جس میں زبان غیر تحریری شکل میں ہوتی ہے۔

2- تحریری کلچر کہ جس میں زبانی کلچر ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ تحریر لے لیتی ہے۔ اس کی مثال کلاسیکل زبانیں ہیں۔

3- مخلوط کلچر جس میں زبانی اور تحریری کلچر دونوں مل جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں تمام بڑی زبانیں بولنے والے مخلوط کلچر میں رہتے ہیں۔ اس لئے چاہے ان میں سے کچھ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ' ان پر کتابوں کا اثر اور تسلط ہے۔ جیسے کہ 19 صدی میں ماوری لوگوں کو تحریری علم کے ذریعہ ماتحتی میں لایا گیا' یا اسلامی دنیا میں تحریری اور زبانی کلچر نے مخلوط کلچر کو پیدا کیا۔ آج کی دنیا میں اب تحریری علم کے ساتھ ساتھ ریڈیو' ٹی۔ وی' اور ٹیلی فون نے پڑھے لکھے لوگوں کو سحر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ لہٰذا مخلوط کلچر اور اس کے اثر کی بات اپنی جگہ' مگر مورخوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے تحریری الفاظ کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ انہیں کے ذریعہ وہ اپنا معیار اور طریقہ کار متعین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زبانی الفاظ کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔

زبانی روایات کی اہمیت کو مسلمانوں میں حدیث کے علم سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس میں راویوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو حدیث کی تشکیل کرتا ہے۔ لرنسیٹ گیلنر نے مراکش کے صوفیوں پر جو تحقیق کی اس کے مطابق ولی یا صوفی اگرچہ خود پڑھا نہ ہو' لیکن وہ جب شریعت کی تشریح کرتا ہے تو لوگ اس بات کو سنتے ہیں۔ اس

کے اردگرد برکت کا جو ہالہ ہے وہ مقدس کتابوں کی تحریروں کے نتیجہ میں ہی بنا ہے۔ اس کے علم کی بنیاد قرآن و حدیث ہے' جسے وہ زبانی طور پر اپنے سامعین تک پہنچاتا ہے۔

وہ روایتی مورخ کہ جو دستاویزات کو قابل بھروسہ سمجھتے ہیں' وہ اپنے ماخذ میں تین چیزوں کو دیکھتے ہیں' یہ وہ تین چیزیں ہیں کہ جو زبانی روایات میں نہیں ہیں' اس لئے وہ ان کو قابل اعتبار نہیں گردانتے ہیں۔ ان کے لئے سب سے اہم چیز متن کی صحت ہوتی ہے' اس کے بعد شہادت کا درست ہونا ہوتا ہے۔ ان کے لئے دستاویزات آرٹ کا ایک نمونہ ہوتی ہے۔ شہادت کی صداقت کو جانچنے کے لئے وہ ایک متن کا دوسرے متنوں سے مقابلہ کرتے ہیں' متن کے الفاظ کا تجزیہ کرتے ہیں' اس کی تشکیل کو بغور دیکھتے ہیں اور اس عمل کے بعد شہادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس عمل کے بعد ضروری ہوتا ہے کہ تقویم کو درست کیا جائے۔ اور اس کی روشنی میں واقعات کا مطالعہ کیا جائے۔

دوسرے مورخ واقعات کو اس کے زمانی دائرہ میں دیکھتے ہیں کہ جس کی پیمائش کلینڈر یا ہماری ہاتھ پر بندھی گھڑی سے ہوتی ہے۔ دستاویزات ان کو تفصیلات فراہم کرتی ہیں کہ جن کی بنیاد پر وہ دلائل کی تشکیل کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر آپ پڑھے لکھے ہیں تو آپ کے لئے لکھنا آسان ہوتا ہے۔ اس لئے آج کے دور میں ہم تحریروں کے سمندر میں رہتے ہیں۔ ایک متن کو سمجھنے کے لئے ہم دوسرے متن پڑھتے ہیں۔ کیونکہ صرف 'ایک شہادت' کوئی شہادت نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کئی شہادتوں کو دریافت کرتے ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی شہادت زبانی روایت پر ہو تو اسے بھروسہ کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر متن کی ہیئت ٹھیک نہیں' سنہ اور تاریخ میں گڑبڑ ہے تو اسے روایتی مورخ تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ ان کے لئے زبانی تاریخ کی یہ کمزوریاں ناقابل معافی ہیں۔

زبانی تاریخ کے بارے میں جو ایک شکایت ہے وہ یہ ہے کہ زبانی روایات کی بنیاد پر جو ڈیٹا اکٹھا کیا جاتا ہے وہ تبدیلی کے عمل کی تشریح نہیں کرتا ہے' جب کہ تبدیلی وہ اہم عمل ہے کہ جس کا مورخ مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو ایسے معاشروں

میں کہ جہاں پڑھے لکھے یا تو کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں تو ایسے معاشروں کے مطالعہ میں تسلسل کا عمل بے انتہا دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اور اکثر تبدیلی سے زیادہ تسلسل کے عمل کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ دراصل زبانی تاریخ کے سلسلہ میں اس شکایت کے پیچھے یا تو نچلی سطح سے ابھرتی ہوئی تاریخ سے ڈر ہوتا ہے' یا یہ کہ زبانی روایات کو فرد کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے' اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر تاریخ کو اس محدود دائرے میں سمجھا گیا تو یہ ہمیں گمراہی کی طرف لے جائے گی۔ کیونکہ خیال یہ ہوتا ہے کہ زبانی تاریخ میں اہم لوگوں کے لئے کوئی عزت کا مقام نہیں ہے اور نہ ہی اہم چیزیں ان کے لئے اہم ہیں (کیونکہ وہ ان کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں)

زبانی تاریخ پر اس تنقید کو دیکھا جائے تو اس کے پس منظر میں روایتی مورخ اور ان کے طریقہ کار کی کمزوری نظر آتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ رانکے کے طریقہ کار کے علاوہ تاریخ کو سمجھنے اور اس کو تشکیل دینے کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔

یان واسینا نے زبانی تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "زبانی شہادتیں اور گواہیاں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں" یہ وہ مواد ہوتا ہے کہ جس کی بنیاد پر ہم معاشرے کے ماضی اور کلچر کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ زبانی کلچر آہستہ آہستہ اس وقت کمزور ہوتا ہے کہ جب معاشرے میں خواندگی کی شرح بڑھتی جاتی ہے۔ اگرچہ کچھ زبانی روایات اس خواندگی کے باوجود باقی رہتی ہیں۔

زبانی روایت کی ایک قسم ذاتی یادداشتیں ہیں کہ جس کا تعلق فرد کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ اس قسم کی یادداشتیں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل نہیں ہوتی ہیں' اگر ہوتی بھی ہیں تو بکھری ہوئی اور ٹوٹی ہوئی شکل میں' زبانی روایت اور یادداشت میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ اگر زبانی روایات کے مواد کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا جائے تو اس کے لئے ذہنی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے' اور اس کے لئے کسی مقصد کا ہونا بھی لازمی امر ہوتا ہے۔ ڈرک ہائم کے نزدیک جب یہ روایات ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کی ساخت کو اسی شکل میں برقرار رکھا جائے۔ دوسرے اس عمل کو اور زیادہ وسعت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ لیکن اس بحث کو چھوڑ کر دوبارہ موضوع کی طرف آیا جائے' تو ہم کہہ سکتے ہیں

کہ زبانی روایات کو چار قسموں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ (6)

1- رٹا ہو' 2- نہ رٹا ہوا' 3- ٹھہرا ہوا یا جما ہوا' 4- اور آزاد۔ رٹے ہوئے میں وہ چیزیں آتی ہیں کہ جو ایک جگہ جم کر رہ گئی ہیں یا ٹھٹھر گئی ہیں۔ جیسے شاعری' اور گیت اور رزمیہ نظمیں۔

وہ روایات کہ جو اس قید سے آزاد ہیں' ان میں محاورے' ضرب الامثال' اور مختلف قسم کے فارمولے' اور یادداشتیں آ جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زبانی روایات' تمام احتیاطوں کے باوجود ماضی کے بارے میں صحیح' درست' اور ٹھیک معلومات نہیں دے سکتی ہیں' کیونکہ انسانی یادداشت کی اپنی کمزوریاں ہیں' وقت گزرنے کے ساتھ ذہن میں کچھ محفوظ رہتا ہے اور کچھ کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ بات کو بیان کرتے ہوئے' راوی اس میں اضافے بھی کرتا ہے اور اس میں تحریف بھی کرتا ہے۔

لیکن زبانی روایات کے حامی اس کا جواب دیتے ہیں کہ تحریری تاریخ میں بھی اضافے اور تحریف مورخ کی پسند یا ناپسند کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ایک اور اعتراض جو زبانی تاریخ پر ہوتا ہے وہ یہ کہ اس میں تقویم یا سنہ و تاریخ کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ہوتی ہیں۔ یہ بات اس لئے کہی جاتی ہے کیونکہ روایتی مورخوں نے موجودہ تقویم کو تسلیم کر لیا ہے اور اب اس کے دائرے میں ماضی کے واقعات کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ وقت کو ماپنے کا ایک قدیم طریقہ موسموں کی تبدیلی سے تھا۔ سماجی مورخ ای- پی- ٹامپسن نے اس موضوع پر لکھتے ہوئے وقت کے شعور اور اس کی تبدیلی کے بارے میں کہا ہے کہ "مدغاسکر میں میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ "چاول کا پکنا" تو اس کا مطلب ہوتا ہے آدھ گھنٹہ' بھٹے کا بھوننا' مغربی نائیجیریا میں اس کا مطلب ہے پندرہ منٹ۔ (ہمارے ہاں اب تک ہم بولتے ہیں' پلک جھپکنے میں آنا' یا وقت کو' دوپہر' عصر' مغرب' اور عشاء سے ناپنا) موجودہ وقت کی تقسیم صنعتی معاشرہ کی پیدا کردہ ہے۔ (7) لیکن مورخ جو کہ سنہ و تاریخ کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط کے قائل ہیں'.وہ مختلف معاشروں میں وقت کی اس تقسیم کے قائل نہیں ہیں۔ وہ تاریخ میں بادشاہوں کی تعداد کو گنتے ہیں' وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایک نسل 33 سال تک چلتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

کچھ مورخوں کا یہ خیال ہے کہ ان کا کام واقعات کو بیان کرنا اور ان کی تشریح کرنا ہے۔ اگرچہ یہ ضروری ہے' مگر کافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مورخ کے دو اور اہم فرائض ہیں: تاریخی عمل میں جو تسلسل ہے اس کی وضاحت کرنا' تاریخی تسلسل جو کہ زبانی روایات اوز اس کے کلچر میں ہے وہ تبدیلی کے عمل سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے علاوہ روایات کے عمل کو دیکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ روایات اس وقت تک زندہ رہتی ہیں۔ جب کہ ان کا مسلسل احیاء کیا جاتا رہے۔ دوسرے مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قاری میں یہ اعتماد پیدا کرے کہ اس کی تاریخ نویسی کی بنیاد اس کی قابلیت پر ہے۔ مورخ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ تاریخ کے اونچے دھارے سے ہٹ کر یہ بھی دیکھے کہ معاشرہ میں ایک عام آدمی' کاریگر' مزدور' انجن ڈرائیور' گاؤں کا دیہاتی' اور آفس میں کام کرنے والا کلرک کیا سوچتا ہے۔

زبانی تاریخ کی ان روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر روایتی اور صنعتی دور کا مورخ خود کو ایک دائرہ میں محدود کرلے گا تو اس کی حالت ایسی ہی ہوگی جیسے کہ کوئی عاشق بلب کی دھندلی روشنی میں اندھیری اور سنسناتی ہوئی ہوا والی گلی میں کھمبے کے نیچے کھڑا محبوب کا انتظار کر رہا ہے۔

حوالہ جات

1- Henk Wesseling : What is Overseas history. p. 67-92.

2- P. Thompson: The Voice of the Past: Oral History (Oxford, 1978) p. 63.

3- J. Vasina: Orad Tradition as History (Madison, Wisconsin, 1985) p. 199.

4- D. F. Mc Kenzie: The Sociology of a text: Oral culture, literary and Print in early New Zealand. in P. Burke and R. Porter (eds), The Social History of Language (Cambridge 1987) p. 161-67.

5- لوہا تھائی لینڈ میں اپنے طور پر استعمال میں لایا گیا' اور یہی عمل وسطی افریقہ میں ہوا۔
مشرق وسطی میں اس کی اہمیت گھوڑے اور اناج کی کاشت سے ہوئی۔

6- J. Vasina: Once upon a time: Oral traditions and history in Africa. Daedulus 2 (Spring 1971) pp. 442-68.

7- E. E. Evans- Pritchard. The Nuer (Oxford, 1940); E. P. Thompson: Time, work Discipline and Industrial Capitalism in M. W. Fenin and T. C. Smoct (eds) Essays in social History. (Oxford, 1974) pp. 40-41

پاکستان امریکہ فوجی تعلقات

حمزہ علوی / طاہر کامران

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے فوراً بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ہندوستان کے ساتھ تنازعوں کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لیکن اس مسئلے کا محض پاکستان کے اس بڑے ہمسایہ ملک سے اختلافات ہی کے محدود اور مخصوص تناظر میں جائزہ لینا ایک عمومی غلطی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ چنانچہ پاک بھارت تعلقات کی نوعیت کو بین الاقوامی تعلقات کے وسیع تر تناظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے مکمل سیاق و سباق کو خاطر میں لائے بغیر اس صورتحال کا صحیح طور سے احاطہ نہ کیا جا سکے گا جس کے پیش نظر 1950ء کی دہائی کے دوران پاکستان کو مشرق وسطیٰ کے معاملات میں ملوث کر لیا گیا۔ اس خطے میں پاکستان کا مغربی فوجی حکمت کے ایک مہرے کے طور پر رول کا تعین امریکہ نے کیا۔ اس کے بعد یعنی 1950ء کی دہائی کے وسطی برسوں کے دوران پاکستان کے امریکہ کے ساتھ تعلقات ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئے جو کہ بعدازاں فوجی اتحاد اور معاہدوں پر منتج ہوئے جن کی وجہ سے پاکستان پر امریکی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ایسی یکطرفہ ذمہ داریاں مسلط کر دی گئیں جن کے آئندہ ایام میں بہت ہی دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

پاکستان اور امریکہ کے اتحاد کے بارے میں ایک عامیانہ تاثر یہ ہے کہ اس کا مقصد ہندوستان کے خلاف پاکستان کو مضبوط بنانا ہے۔ خاص طور پر ہندوستانی قوم پرستوں (Nationalists) کا نقطہ نظر تو بالکل یہی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے حکمرانوں کا بھی کم و بیش یہی خیال تھا جس کی وہ ترویج کرتے رہے کہ امریکہ نے پاکستان کو ہندوستان کے خلاف ایک بند کے طور پر مضبوط بنانے کی غرض سے حلیف بنایا ہے لیکن امریکی قیادت کا تعلقات کی اس نوعیت کے بارے میں تجزیہ بالکل مختلف تھا۔

امریکہ کے قائدین کا کہنا تھا کہ پاکستان کو روس کے استعماری عزائم کا سد باب کرنے کی غرض سے جنوبی ایشیا کے پہلے دفاعی قلعے کے طور پر مضبوط بنانے کیلئے مذکورہ بالا معاہدے کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ توضیح بھی جھوٹ کے پلندے کے سواء کچھ نہ تھی۔ البتہ یہ توضیح سرد جنگ کے زمانے کی میکارتھی ازم کی روح سے انتہائی مطابقت ضرور رکھتی تھی۔ امریکہ میں زیر بحث فوجی معاہدے کو اس طرح جائز اقدام کے طور پر تسلیم کروایا گیا۔

امریکی ارباب اقتدار نے بھارت پر ہر طرح سے یہ واضح کرنے کی سر توڑ کوشش کی کہ پاکستان اور امریکہ کے اتحاد سے اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اس اتحاد نے پاک بھارت جنگوں میں قطعاً" کوئی کردار ادا نہیں کیا (1965ء اور 1971ء کی دونوں جنگوں میں کہ جب پاکستان کو ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا) جیسا کہ ہم آئندہ سطور میں جائزہ لیں گے ان جنگوں کے دوران امریکی انتظامیہ نے اس سلسلے میں ہر ممکن طریقے سے یہ احتیاط برتی کہ کہیں پاکستان ہندوستان کے خلاف جنگی معرکوں میں وہ جنگی ہتھیار استعمال نہ کرے جو فوجی اتحاد کی شرائط کے تحت اسے مہیا کئے گئے تھے۔ اس مقالے میں اس امر کی نشاندہی کی سعی کی گئی ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے فوجی تعاون کی وہ توجیہات جو کہ اس تعاون کی بنیادی وجہ ہندوستان کو قرار دیتی ہیں دراصل اس تعاون کے صحیح مقاصد اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کے مجموعی محرکات کو "امریکہ نواز" قرار دیتے ہوئے پس پشت ڈال دیتی ہیں۔

پاکستان کے بارے میں پورے تسلسل کے ساتھ یہ بات بھی کہی جاتی رہی ہے کہ یہ 1950ء کی دہائی کے وسط سے نہیں بلکہ اپنے وجود میں آتے ہی امریکہ کا پٹھو بن گیا تھا۔ یہ بھی سراسر مغالطہ ہے۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کہ آزادی کے فوراً" بعد ہی پاکستانی حکمران اقتصادی اور فوجی امداد کے حصول کے لئے کاسہ گداگری لئے امریکہ جا پہنچے تھے اور پاکستانی افواج کو ناگفتہ بہ حالت کا رونا روا تھا۔ لیکن اس موقع پر امریکہ نے پاکستان کو "تابع حواری" کے طور پر قبول کرنے میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا تھا کیونکہ اس وقت پاکستان کو اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دینے سے امریکہ کے کسی مفاد کی تکمیل نہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے پاکستان کو ہتھیار فروخت کرنے

سے بھی انکار کر دیا۔

وینکٹ رامانی کی تصنیف (1984ء) The American Role in Pakistan (پاکستان میں امریکہ کا کردار) بھی اسی طرح کی غلط سوچ پر مبنی ایک روایتی کاوش ہے۔ وینکٹ رامانی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو تضحیک کا نشانہ بناتا ہے جو کہ اپنے نوزائیدہ ملک کے ابتدائی ایام میں فوجی ساز و سامان کے حصول کے لئے تگ و دو کر رہے تھے۔ رامانی کا کہنا ہے کہ وہ فوجی ساز و سامان کو خریدنے کے لئے اجازت نامہ لینے کی غرض سے مکمل طور پر بچھ گئے پھر بھی مسلسل انکار کے سواء ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔ وینکٹ رامانی قوم پرستانہ فخر کے ساتھ شیخی بگھارتے ہوئے کہتا ہے۔ پاکستانیوں سے بہت ناروا برتاؤ کیا گیا اس کے برعکس امریکہ نے ہندوستان کو کہیں زیادہ اہمیت دی۔ اس کی کتاب میں مرقوم ہے "یو ایس نے انڈیا کو واضح طور پر زیادہ اہم سمجھا" سوویت یونین اور چین کو ان کی حدود تک ہی روکے رکھنے کے لئے امریکی انتظامیہ نے ہندوستانی وزیراعظم جواہر لال نہرو کو تو امریکہ آنے کی دعوت دی لیکن اس نے پاکستانی وزیراعظم کو اس ضمن میں مکمل طور پر نظر انداز کر دیا (Venkat Ramani, 1984:73:74) رامانی کا یہ کہنا نہایت ہی طفلانہ فکر کی غمازی کرتا ہے۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ کوئی بھی ہندوستانی قوم پرست امریکہ کے ایسے سرپرستانہ طرز عمل پر جس کا اس نے پنڈت نہرو اور ہندوستان کی بابت اظہار کیا مسرت و شادمانی سے بغلیں بجانے لگے اور اسے ایک عظیم اعزاز تصور کرے۔ اس کے باوجود اس میں واقعی کوئی شک نہیں کہ 1950ء کی دہائی کے وسط تک ہندوستان میں امریکی مفادات اس قدر اہم تھے کہ وہ پاکستان کے ساتھ روابط استوار کر کے انہیں قربان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

1952ء تک صورتحال ایسی ہی رہی۔ اس وقت تک امریکی ترجیحات میں انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی بعد میں جب صورت حال بدلی تو ہندوستان کی ناراضگی کے خطرے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے امریکی قائدین نے پاکستان کے ساتھ فوجی اتحاد قائم کر لینا منظور کر لیا۔ دراصل یہ امریکی رویے میں یہ تبدیلی 1950ء کی دہائی کے دوران مشرق وسطی میں رونما ہونے والی نئی سٹریٹجک صورتحال کی وجہ سے آئی جس کے نتیجے

میں امریکہ کی علاقائی سطح پر دفاعی حکمت عملی وہ نہ رہی جو کہ اس سے پہلے تھی۔ چنانچہ ان مختلف حالات میں پاکستان کو امریکہ کے علاقائی سطح پر دفاعی حکمت عملی کے تقاضوں پورا کرنے کی غرض سے کردار ادا کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ پاکستان کی طرف امریکی رویے میں آنے والی اس واضح تبدیلی کا (جس کے تحت امریکہ نے پہلے والی سرد مہری کو ترک کر کے پاکستان کے ساتھ فوجی اتحاد قائم کرنا قبول کر لیا تھا) اوراک علاقائی صورتحال میں نمودار ہو جانے والی بنیادی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھے بغیر ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی پالیسی میں تبدیلی اس وجہ سے ہرگز نہیں آئی کیونکہ پاکستان کی یہ خواہش تھی یا اس کے ساتھ روابط قائم کرنے کی ابتداء پاکستان نے کی تھی یہ محض خام خیال اور دروغ گوئی پر مبنی نقطہ نظر ہے کہ جنرل ایوب خان اس فوجی اتحاد کا اصلی محرک تھا۔ اس جھوٹے دعوے نے بعدازاں اس تصور کو پھیلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا کہ اس فوجی اتحاد کا مقصد پاکستانی مفادات کی نگہداشت کرنا تھا اور ایسا کرنے پر امریکہ ہر طرح سے رضامند تھا۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اس فوجی اتحاد کو حقیقت کا روپ دینے میں پہل امریکہ نے کی تھی اور ایک مرتبہ جب انہوں نے اپنے آپ پر یہ واضح کر لیا کہ انہیں کیا درکار ہے تو پھر امریکی ارباب اقتدار نے اس فوجی اتحاد کے خلاف پاکستان میں جنم لینے والی ہر طرح کی مخالفت کی مکمل طور پر بیخ کنی کر دی۔

مشرق وسطیٰ میں معدنی تیل سے وابستہ مغربی مفادات کو اس وقت سخت دھچکہ لگا جب مارچ 1951ء میں محمد مصدق (قوم پرست ایرانی وزیراعظم) نے ایرانی تیل کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ یہ بحران تب نہایت ہی سنجیدہ صورت اختیار کر گیا کیونکہ مغربی طاقتیں ایران میں فوجی مداخلت نہ کر سکتی تھیں جیسا کہ ان کی خواہش تھی۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کے تیل سے وابستہ مفادات کی نگہداشت کے لئے کہ جنہیں مستقبل میں خطرہ درپیش ہونے کے امکانات موجود تھے امریکہ نے نئے سرے سے اپنی حکمت عملی کو وضع کرنے کے کام کا آغاز کر دیا۔ نئی حکمت عملی کے وضع کرنے کے کام کی ابتداء پاکستان کو ایک نئے فوجی اتحاد میں شراکت کا موقع فراہم کر کے کی گئی۔ بارنڈ (Barnds) جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امریکی سی آئی اے کا ملازم رہا ہے اس کا کہنا ہے ''امریکہ اور پاکستان کے فوجی تعلقات کے لئے امریکی ائر

فورس ان دنوں اپنے لئے ہوئی اڈوں (air bases) کے قیام کے لئے بعض ممکنہ جگہوں کے انتخاب کا جائزہ لے رہی تھی۔ دیگر فوجی حکمت عملی کے امریکی ماہرین (Military Stretagists) نے اس نکتے پر بھی غور شروع کر دیا تھا کہ ایشیا میں کہیں بھی پاکستانی فوجیوں کو اپنے کام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے (Barnds, 1972:1)-
دراصل موخرالذکر نقطہ نظر کو عملی شکل دینے کے بارے میں غور و غوض کیا جا رہا تھا یعنی مشرق وسطیٰ میں امریکی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے پاکستانی افواج کی دستیابی! یہی امریکہ کی نئی حکمت عملی کا مرکزی نکتہ تھا۔ اور اس سال ایرانی تیل کو قومی ملکیت میں لے لئے جانے کے عمل نے امریکہ کو یہ اقدام کرنے پر مجبور کیا تھا۔

امریکہ اور پاکستان کے مابین فوجی امداد سے متعلق معاہدہ 1952ء کے وسط میں طے پا گیا۔ جب 1953ء میں آئزن ہاور انتظامیہ کا سربراہ بن گیا اور ڈلس برادران سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور سی۔ آئی۔ اے کے انچارج بن گئے تو اس سمت میں تیزی سے پیش رفت ہونے لگی۔ اس بات کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کرتے چلیں کہ امریکہ کی اس مخصوص علاقائی فوجی حکمت عملی میں ظہور پذیر ہونے والی تبدیلی کا ہندوستان سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا سوائے اس کے کہ اس نے پاکستان کو فوجی اتحاد میں شامل کر کے ہندوستان سے اپنے دوستانہ تعلقات کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ لیکن امریکہ نے خارجہ پالیسی کے ضمن میں ہونے والے اس نقصان کی تلافی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ہندوستان کو مسلسل یہ یقین دلاتا رہا کہ پاکستان کے ساتھ اس کے فوجی اتحاد سے اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔

ان تمام برسوں کے دوران امریکہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی کہانی توازن سے قطعی مبراء اور پیچیدگی کا مظہر ہے۔ آزادی حاصل کر لینے کے بعد اپنے قیام کے ابتدائی عرصے میں پاکستان بری طرح مشکلات میں پھنسا ہوا تھا لہٰذا اس نے امداد کے لئے امریکہ کی طرف رجوع کیا لیکن ناکامی سے دوچار ہوا کیونکہ پاکستان کو امداد دینے سے امریکہ کا کوئی بھی مفاد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے امریکہ کی نظر انتخاب ہندوستان پر جا کر ٹھہری۔ اس میں کسی قسم کا کوئی کلام نہیں کہ امریکی اور برطانوی سرمایے کے لئے ہندوستان میں پاکستان کی نسبت زیادہ روشن امکانات تھے پاکستان کی پسماندہ اور مختصر سی

معیشت سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چنانچہ امریکہ جو کہ نئی بین الاقوامی نوآبادیاتی طاقت کے طور پر جلوہ افروز ہو چکا تھا، ہندوستان کے ساتھ اپنے خوشگوار مراسم کو مکدر کر دینے میں کوئی منطق دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور اس حقیقت کا پورا احساس پاکستان کو بھی تھا۔

زیر نظر عرصے کے دوران برطانیہ میں لیبر حکومت برسر اقتدار تھی جس کی قیادت کے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ دیرینہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ برطانوی لیبر موومنٹ انڈین نیشنل کانگرس جنوبی ایشیا میں ایک ایسی طاقت کے طور پر دیکھ رہی تھی جو کہ جمہوری اقدار کا علم بلند کئے ہوئے تھی اور تمام تر علاقے میں جمہوریت کی ترویج کے لئے سرگرداں تھی۔ اس کے برعکس لیبر پارٹی کے رہنماء مسلم لیگ سے عناد رکھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مسلم لیگ ایک فرقہ وارانہ قوت تھی جس کا طرز عمل غیر جمہوری اور رجعت پسندانہ تھا۔ اسی طرح امریکہ میں ڈیمو کریٹس اس عرصے میں اقتدار میں تھے۔ ان کے بھی انڈین نیشنل کانگریس کے رہنماؤں کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات تھے جبکہ مسلم لیگ کے بارے میں ان کے خیالات کم و بیش اسی طرح کے تھے جس طرح کے برطانوی لیبر پارٹی کے! سوویت یونین کا فطری میلان بھی ہندوستان کی طرف تھا۔ ان حالات میں پاکستان اپنے قیام کے ابتدائی عرصے کے دوران تنہا ہو کر رہ گیا جس نے اس کے قائدین میں احساس عدم تحفظ کو پروان چڑھایا۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ اور امریکہ سے معاملات کا طے ہونا غیر یقینی تھا دوسری طرف پاکستانی رہنماؤں کی نظریاتی وابستگی اور اس کے ساتھ ہی سوویت یونین کے ہندوستان کی طرف واضح جھکاؤ کے ہوتے ہوئے پاکستان کے لئے سوویت یونین سے امداد کا متبادل وسیلہ بننا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ پاکستانی لیڈر ان حالات کا بڑی بے بسی سے نظارہ کر رہے تھے کہ جب ہر طرف سے ہندوستان پر مہربانیاں برسائی جا رہی تھیں۔ تب پاکستان کی حالت بین الاقوامی سٹیج پر ایک سیاسی یتیم کی سی ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ اس کے پاس اس کے سواء کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کو اپنا شعار بنا کر آزادانہ راستہ اپنائے۔

جیسا کہ وینکٹ رامانی اور چند دیگر حضرات کا خیال ہے کہ ابتداء ہی سے پاکستان امریکہ کا پروردہ ملک ہرگز نہ تھا۔ بلکہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران پاکستان کی خارجہ

پالیسی حقیقتاً غیر جانبدارانہ اور غیر وابستہ تھی البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوری کے تحت ہوا۔ اس سے پاکستان کی دنیا میں اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں اچنبھے کی بات ہرگز نہیں کہ ہندوستان کے ساتھ تمام تر عداوت اور دشمنی کے باوجود لیاقت علی خان غیر جانبداری پر مبنی اپنی پالیسی کو بیان کرنے میں نہرو کے شانہ بشانہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیاقت علی خان نے مئی 1950ء میں امداد حاصل کرنے کی غرض سے امریکہ کا دورہ کیا۔ تب سرد جنگ کے پس منظر میں امریکیوں کا کلیہ یہ تھا کہ جو ہمارے کیمپ میں نہیں وہ لامحالہ ہمارے دشمن کے کیمپ میں ہو گا۔ اس کے باوجود امریکہ میں لیاقت علی خان نے نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں اپنی اہم ترین تقریر کی ابتداء میٹرنک کے ان الفاظ کو دہراتے ہوئے کی کہ ایک ملک کے نہ تو "مستقل دوست ہوتے ہیں اور نہ ہی مستقل دشمن۔ اس کے مستقل مفادات ہوتے ہیں۔" چنانچہ انہوں نے اپنی اس تقریر میں اپنے ملک کے مستقل مفادات کا تذکرہ کیا جو کہ پاکستان کی ایسی ضروریات تھیں جن کا سرد جنگ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے امریکہ کے حوالے سے اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا کہ "امید ہے کہ پاکستان اور امریکہ ایک دوسرے کے نقطہ ہائے نظر کو بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے۔" اس طرح انہوں نے پاکستان کی آزادانہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے امریکی کیمپ میں شامل ہونے کے تمام تر امکانات کا خاتمہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ خالی ہاتھ واپس لوٹے۔

لیاقت علی خاں کے دور میں پاکستان کی غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کو کچھ زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ اسے آج پوری طرح سے تسلیم بھی نہیں کیا جاتا۔ راقم نے اس کا تذکرہ ایک مقالے "دی برڈن آف یو ایس ایڈ" میں جو کہ پاکستان ٹوڈے (لندن) میں 1962ء میں شائع ہوا تھا کیا تھا۔ بارنڈس ایسے چند فاضل اصحاب میں سے ایک ہے جس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "پاکستان نے 1947ء کے بعد غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کی راہ کو اپنایا لیکن اعلانیہ طور پر نہیں کہا کہ وہ ایسا کر رہے ہیں (غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں) دراصل وہ بین الاقوامی سیاست میں دیگر مسلم ریاستوں اور عرب ممالک سے اپنا راستہ جدا نہ کرنا چاہتا تھا جو کہ عمومی طور

پر مغربی دنیا کے ساتھ دفاعی اتحادوں اور تنظیموں سے متعلق معاندانہ نقطہ نظر کے حامل تھے۔" (Barnds, 1972:92)_ بارنڈس کی پاکستان کی غیر جانبدارانہ خارجہ حکمت عملی کی وجوہات جن کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے درست نہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں غیر جانبداری کا عنصر عرب دنیا سے یکجہتی کے اظہار کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ دراصل ہم ابھی 1951ء سے پہلے کے عہد کے بارے میں تبصرہ کر رہے ہیں جب مشرق وسطیٰ میں برطانوی سرپرستی میں دائیں بازو کے فکر و عمل سے وابستہ حکومتیں قائم تھیں۔ اور جمال عبدالناصر اور عرب نیشنلزم نے ابھی عربوں کے قلوب و اذہان میں گھر نہ کیا تھا۔ اور نہ ہی پاکستانی خارجہ پالیسی اس وجہ سے غیر جانبدار تھی کیونکہ پاکستانی قائدین نے شعوری طور پر ایسی خارجہ پالیسی کا خود انتخاب کیا تھا بلکہ غیر جانبداری پر مبنی خارجہ پالیسی اس لئے وجود میں آ سکی تھی کیونکہ پوری دنیا میں پاکستان تن تنہا تھا اور جسے مغربی ممالک کا اعتماد حاصل نہ تھا۔ پاکستانی رہنماؤں پر بھی اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا کہ مغربی ممالک پہلے سے ہی ہندوستان کے دوست ملک کی حیثیت سے انتخاب کر چکے ہیں' بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے آپ کو امریکہ کے پلو سے اس وقت باندھ لیا جب اس نے 1952ء میں فوجی امداد کے ایک سمجھوتے پر دستخط کئے یہ بالکل وہی وقت تھا جب جمال عبدالناصر کی طرف سے عرب نیشنلزم کا علم بلند کیا جا چکا تھا اور جلد ہی اس کی صدائے بازگشت پوری عرب دنیا میں ہر جگہ سنائی دی جانے والی تھی۔

آزادی کے ابتدائی برسوں کے دوران حکومت پاکستان کو جس مسئلے نے سب سے زیادہ پریشان کئے رکھا وہ اس کی فوجی کمزوری تھی جو کہ ہندوستان کے افواج سے متعلق تقسیم ہند کے سمجھوتے سے روگردانی کا براہ راست نتیجہ تھا۔ ہندوستان نے فوجی اسلحے کا وہ حصہ جو کہ پاکستان کو ملنا چاہئے تھا اسے دینے میں پس و پیش کی اور بالاخر پاکستان کو اسلحے کے اپنے حصے سے محروم کر دیا گیا۔ مزید برآں وہ فوجی جو کہ پاکستان آئے اور جنہوں نے پاکستانی فوج کو تشکیل دیا وہ مختلف یونٹوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان میں ہم آہنگی کا شدید فقدان تھا۔ لہٰذا ان میں اتحاد و یکجہتی کی فضا کو پروان چڑھا کر اور نئے یونٹوں کو وجود میں لا کر ایک باقاعدہ فوج کی شکل دینی پڑی۔ وہ فوجی جنہوں نے

پاکستان کا اپنے وطن کے طور پر انتخاب کیا وہ زیادہ ایسی فوجی یونٹوں سے متعلق رہے تھے جو کہ دونوں قومیتوں (ہندوؤں اور مسلمانوں) پر مشتمل تھیں اس لئے پاکستانی فوجیوں کو بالکل نئے سرے سے منظم کرنا پڑا۔ لارڈ برڈوڈ (Lord Birdwod) جو کہ دفاع کے معاملات میں برطانوی کنزرویٹو پارٹی کا مشیر تھا۔ اس نے تحریر کیا کہ "طبقاتی یونٹوں یعنی ڈوگرہ' مرہٹہ اور سکھ کے بارے میں تو فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا انہیں ہندوستان کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ سب ہندوؤ برادریوں پر مشتمل تھے۔ لیکن پنجاب انفینٹری رجمنٹس (Punjab Infantry Regiments) اور تمام گھڑسوار دستے ہندوؤں' سکھوں اور مسلمانوں کی ملی جلی کمپنیوں اور سکواڈرنوں پر مشتمل تھے۔ سب سے کٹھن مسئلہ یہ تھا کہ فوج کی مختلف یونٹوں (Corps) کو کیسے تقسیم کیا جائے..... تمام شعبہ جات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے انہیں نئے یونٹوں اور نئے گھروں کو بھیجنا پڑا۔ مزید برآں اب ان کی وفاداریاں بھی ایک دوسرے سے متضاد ہو گئی تھیں" (Birdwood, 1953:83)_ لہٰذا پاکستان کی تمام کی تمام فوج کو نئے سرے سے تشکیل دیا گیا' ان کو نئے یونٹوں میں منظم کیا گیا اور اسے ایک اکائی کی شکل دی گئی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک وقت پاکستان کے پاس ایسا کوئی ادارہ تھا ہی نہیں جسے کہ باقاعدہ تربیت یافتہ' اسلحہ بردار بااثر اور پیشہ ور فوج کا نام دیا جا سکتا۔

پاکستانی فوج کے لئے اصل تشویش کا باعث اسے اس کے جائز حصے کے فوجی ساز و سامان سے محروم کر دیا جانا تھا جو کہ تقسیم کے وقت اس کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ متحدہ ہندوستان کی فوج کا زیادہ تر اسلحہ اس عرصے کے دوران ہند کے سرحدی علاقہ پر جاپانی حملے کے دنوں سے جنوبی ہند کے دور دراز علاقے میں رکھا ہوا تھا چنانچہ فوجی ساز و سامان کی تقسیم کے عمل کو ممکن بنانے کے لئے جنرل آکنلک کی سربراہی میں ایک سپریم کونسل بنائی گئی جس کی حیثیت آزادانہ تھی۔ اس کونسل کے ذمے دونوں افواج میں فوجی ساز و سامان کو صحیح طور پر تقسیم کر کے انہیں گو مگو کی حالت سے نکال کر بحال کرنا تھا۔ اسی کام کی نگرانی کے لئے ایک جائنٹ ڈیفنس کونسل بھی بنائی گئی۔ اگرچہ ان دونوں کونسلوں کو مارچ 1948ء تک اپنے فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری نبھانی تھی لیکن ہندوستان کے ایماء پر انہیں معینہ وقت سے پہلے یعنی نومبر 1947ء ہی میں برخواست کر

دیا گیا- برڈووڈ (Birdwood) نے اپنی ایک تحریر میں نقل کیا ہے "پاکستان کو سخت شکایت تھی کہ ڈیفنس کونسل نے اس کی فوج کو اسلحہ و دیگر ساز و سامان دینے کا حکم تو دیا ہو گا لیکن اس کا حکم عمل کی شکل اختیار نہ کر سکا- اس وجہ سے پاکستانیوں نے نومبر ہی میں سپریم کونسل کے خاتمے پر انتہائی مایوسی کا اظہار کیا- ابھی تک انہیں فوجی ساز و سامان کا اپنا جائز حصہ نہ مل سکا تھا- اس پر مستزاد یہ کہ اب وہ مرکزی اور آزادانہ اتھارٹی جس سے حکومت پاکستان امید باندھے ہوئے تھا اس کا بھی اب خاتمہ کر دیا گیا تھا- لہٰذا انہیں اب اس ضمن میں کسی قسم کی کوئی توقع بھی نہ رہی تھی (Ibid., : 84-85) حتیٰ کہ باقاعدہ فوجی ریکارڈ اور پاکستان آرمی ہیڈ کوارٹر سے متعلقہ دستاویزات نئی دلی کے پرانے جی ایچ کیو ہی میں رہ گئیں تھیں ان حالات کے پیش نظر یہ امر قطعاً" باعث حیرت نہیں کہ فوج کی تنظیم نو اور اس کے لئے فوجی ساز و سامان کا حصول پاکستان کے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا-

اس عرصے کے دوران پاکستان کے لئے تقریباً تمام راہیں مسدود تھیں- یورپ انہی دنوں جنگ عظیم دوئم کی تباہی کا شکار تھا اور اس براعظم کے تمام چیدہ چیدہ ممالک بعد از جنگ عظیم اپنی زبوں حالی سے عبارت معیشتوں کی تعمیر نو میں مصروف تھے چنانچہ فوجی ساز و سامان کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ صرف اور صرف امریکہ ہی تھا جو کہ پاکستان کی اس فوری ضرورت کو پورا کر سکتا تھا- لہٰذا حکومت پاکستان نے اپنی بری فوج بحریہ اور فضائیہ کے لئے ضروری نوعیت کا جنگی ساز و سامان خریدنے کے لئے امریکہ سے درخواست کرنے میں کوئی تاخیر نہ کی لیکن چونکہ ان دنوں امریکہ کے اقتصادی مفادات کا تقاضا تھا کہ وہ ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دے اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر خطوط پر استوار کرے اس لئے امریکہ نے پاکستانی حکومت کی درخواست کو زیادہ اہمیت نہ دی- ویسے تو ایشیا کے حوالے سے امریکہ کے لئے دلچسپی اور توجہ کا مرکز مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کے علاقے تھے اگر اسے جنوبی ایشیا کے کسی بھی خطے سے کوئی تھوڑی بہت دلچسپی تھی تو اس کا مرکز یقیناً ہندوستان ہی تھا کیونکہ امریکی سرمایے کے لئے تجارت اور سرمایہ کاری کے عوض منافع کمانے کے پاکستان میں امکانات بہت محدود تھے-

اپنی افواج کے لئے اسلحہ حاصل کرنے کی اشد ضرورت کے پیش نظر پاکستان نے امریکی ارباب اقتدار کی جانب سے مسلسل انکار اور تضحیک آمیز ردعمل کے باوجود اپنی گذارشات کی تکرار کو جاری رکھا اور حکومت پاکستان نے اسلحہ خریدنے کی اجازت حاصل کرنے کی تگ و دو کو ترک نہ کیا۔ لیکن امریکہ نے پاکستان کو اسلحہ فروخت کرنے میں ذراہ برابر بھی دلچسپی نہ لی۔ چنانچہ پاکستان کے لئے اب اس کے سواء اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کھلی منڈی (open market) سے دوسری جنگ عظیم کے دوران استعمال ہونے سے بچ جانے والا متر‌ک نوعیت اسلحہ خریدے تاکہ افواج کو کسی نہ کسی طرح کے ہتھیار مہیا کئے جاسکیں۔ پاکستانی فوج کے تاریخ دان میجر جنرل فضل مقیم خان نے پندرہ ممالک کی فہرست دی ہے کہ جن سے پاکستان نے اس عرصے کے دوران متروک اسلحہ خریدا تھا۔ اگرچہ تب بھی پاکستانی افواج کی ضروریات مکمل طور پر پوری نہ ہو سکی تھیں۔ (Khan, 1963:58) تبھی برطانوی انٹیلی جنس کو یہ خبر ملی کہ پاکستانی حکام چیکو سلوواکیہ سے فوجی ساز سامان خریدنے کے لئے بات چیت کر رہے ہیں۔ برطانوی انٹیلی جنس نے اس پیش رفت کی فوری اطلاع امریکیوں کو دی۔ تب امریکہ کو پاکستان سے متعلق اپنے سخت موقف میں نرمی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی عرصے کے دوران پینٹاگون (Pentagon) بھی پاکستانی سرزمین پر اپنے لئے فضائی اڈے قائم کرنے کے امکانات پر غور کر رہی تھی تاکہ وہاں سے سوویت یونین کی دفاعی کمزوریوں کا پتہ چلایا جا سکے۔ چنانچہ 1949ء میں امریکہ نے جزوی طور پر پاکستان کو اسلحہ کے فراہمی پر اپنی طرف سے عائد پابندی کو اٹھا لیا' اس طرح پاکستان کو تھوڑا بہت اسلحہ خریدنے کی اجازت مل گئی۔ امریکہ کو امید تھی کہ اس جزوی رعایت سے ہی پاکستان کی تشفی ہو جائے گی اور وہ کیمونسٹ ممالک سے اسلحہ خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ مزید برآں امریکی حکام کو اس طرح اپنے مفاد کے حصول کی بھی امید تھی کہ اگر مستقبل میں ضرورت پڑی تو پاکستان امریکہ کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اپنی سرزمین پر امریکی فضائی مراکز کے قیام میں پس و پیش نہ کرے گا۔ دوسری صورت پاکستان کو محدود پیمانے پر اسلحہ فروخت کرنے سے ہندوستان بھی معترض نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امریکی پالیسی میں ابھی تک قابل ذکر تبدیلی نہ آئی تھی۔

مارچ 1951ء میں ایرانی وزیراعظم محمد مصدق کی طرف سے ایرانی تیل کے قومیائے جانے کے ساتھ ہی اس علاقے کی اہمیت میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو گئی۔ برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتیں اپنی پوری کوشش کے باوجود اس تبدیلی کو وقوع پذیر ہونے سے نہ روک سکیں۔ اب صورتحال ایسی تھی کہ وہ اپنی تمام تر خواہش کے باوجود ایران کے خلاف فوجی کاروائی بھی نہ کر سکتی تھیں۔ ستم کی بات تو یہ ہے کہ برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت میں سیکرٹری خارجہ کے عہدے پر فائز مورسن (Morrison) نے بھی ایران کی جانب سے کئے جانے والے اس اقدام (ایرانی تیل کی نیشنلائزیشن) کی پرزور مذمت کی جبکہ خود برطانوی حکومت نے اپنے ملک میں اس عرصے کے دوران وہی کچھ کیا تھا جو کہ ایرانی وزیراعظم نے کیا یعنی ان دنوں برطانیہ میں بھی بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا بالکل اسی طرح جیسے محمد مصدق نے ایرانی تیل اور تیل کے کنوؤں کو نیشنلائز کر لیا۔ اس حقیقت کے بیان کرنے سے برطانیہ کی دو رخی پالیسی پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ خود برطانوی حکومت تو اپنے ملک میں وسیع پیمانے پر نیشنلائزیشن کی پالیسی پر عمل پیرا تھی لیکن ایرانی حکومت کے ویسے ہی اقدام پر سراپا احتجاج بن گئی۔ گھر میں سوشلزم جبکہ باہر استعماریت۔ برطانیہ اور امریکہ نے مصدق حکومت کے اقدام کے ردعمل میں جو کچھ بھی ان سے بن پڑا وہ کیا۔ ایران کے لئے یہ صورتحال خاصی سنگین ہو گئی جب برطانیہ نے اپنے ان تیکنیکی ماہروں کو واپس بلا لیا جو کہ تیل نکالنے کے عمل کا بنیادی کردار تھے۔ علاوہ ازیں آبادان کی آئل ریفائنری کو بھی جولائی 1951ء میں بند کر دیا گیا۔ علی ھذالقیاس تیل کی ترسیل اور بیرونی ممالک میں اور بین الاقوامی منڈی میں اس کی فروخت میں بھی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔

اس واقعے نے خطے میں مغربی طاقتوں کی فوجی اہلیت میں واضح کمی کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا تھا۔ اگر اس پہلو کو مغربی طاقتیں پہلے سے ذہن میں رکھتیں اور عملی اقدامات کر لیتیں تو ممکن ہے کہ صورتحال مختلف ہوتی۔ اگرچہ سفارتی سطح پر ایران پر جتنا بھی ہو سکتا تھا دباؤ ڈالا گیا۔ برطانیہ نے نیشنلائزیشن کے معاملے کو انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں بھی اٹھایا' اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھی! لیکن کوئی

خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانیہ نے خلیج فارس میں اپنے بحریہ کے یونٹوں کو متعین کیا اور 3,000 چھاپہ ماروں کو قبرص بھیجا تاکہ ایران میں ممکنہ فوجی کاروائی کی صورت میں فوری اقدام کیا جا سکے۔ (Ramazani, 1975:205-206) لیکن اس تمام تر کاروائی سے عملی فائدہ کچھ نہ ہوا۔ دراصل برطانیہ اس پوزیشن ہی میں نہ تھا کہ فوجیوں کی بڑی تعداد کو متحرک کر کے ایران پر چڑھائی کر سکتا اور نہ ہی اسے فوجی اڈوں کی سہولت میسر تھی جنہیں کام میں لا کر ایران کو سبق سکھایا جا سکتا۔ پہلے وقتوں میں اگر ایسی صورتحال جنم لیتی تو برطانیہ ہندوستان سے اپنی افواج کے ذریعے ایران کے خلاف موثر کاروائی کر سکتا تھا اور خوزستان کے ایرانی صوبے اور آبادان میں ایرانی ریفائنری پر قبضہ بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اب برطانیہ کو پرانا استعماری آپشن دستیاب نہ تھا جسے استعمال میں لا کر وہ ہندوستان سے اپنی افواج کے ذریعے ایران پر براہ راست حملہ کر دیتا۔ چنانچہ برطانیہ نے جو کچھ بھی اس کے بس میں تھا کیا لیکن ایرانی حکومت کی طرف سے کی جانے والی تیل کی نیشنلائزیشن برقرار رہی۔

مغربی طاقتوں کو ایران میں وقوع پذیر ہونے والے اس واقعے سے جو سبق حاصل ہوا وہ یہی تھا کہ اس خطے میں "طاقت کا خلا" (Power Vaccum) پایا جاتا تھا ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد برصغیر سے برطانیہ کے انخلاء کی وجہ سے ان حالات نے جنم لیا تھا۔ برطانوی ہندوستان کی فوج محض اسی ملک میں انگریزوں کے قبضے کو برقرار رکھنے کے لئے ہی استعمال نہ ہوتی تھی بلکہ وہ اصل میں استعماری فوج تھی جو کہ پورے براعظم ایشیا میں برطانوی استعماریت کو دوام بخشنے کی غرض سے استعمال میں لائی جاتی تھی۔ تب ہندوستانی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی داخلی سلامتی کے لئے افواج (Internal Security Troops) اور باقاعدہ فوج یا فیلڈ آرمی (Field Army)_ موخرالذکر کے اخراجات تو ہندوستانی ذرائع سے مہیا کئے جاتے تھے لیکن فوج کا یہ حصہ برطانیہ کے وسیع تر استعماری مفادات کی تکمیل کے لئے سب سے اہم کردار ادا کرتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان ہی وہ مرکز تھا جہاں سے برطانیہ سنگاپور سے سویز اور اس سے بھی پار تک پھیلی ہوئی سلطنت کو کنٹرول کرتا تھا۔ اب جبکہ ہندوستان اور

پاکستان آزاد ہو چکے تھے تو یہ مرکز بھی نہ رہا تھا اس وقت تک اس مسئلے کا ادراک ہی نہ کیا جا سکا تھا کہ مشرق وسطی سے نکلنے والے تیل پر مغربی طاقتوں کے کنٹرول کی بابت ایسی صورتحال بھی جنم لے سکتی ہے۔ ایران کے تیل کے قومی تحویل میں لے لئے جانے سے پیدا ہونے والے بحران کا تب کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت تک اولاف کیرو (Olaf Caroe) جو کہ ایک وقت میں شمال مغربی سرحدی صوبے کا گورنر رہ چکا تھا اس نے اس مسئلے کی نشاندہی کی تھی اور مغربی طاقتوں بالخصوص برطانیہ اور امریکہ کو راہ سجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ مشرق وسطی کے ضمن میں اپنی فوجی حکمت عملی کو مرتب کرتے ہوئے پاکستان کو وہی اہمیت دیں جو کہ اس سے پہلے برطانوی مفلوات کی نگہداشت کے حوالے سے ہندوستان کو حاصل رہی ہے (1951 (Caroe, لیکن اس وقت اس کی اس تنبیہہ پر کسی نے توجہ نہ دی۔

سٹریٹجک صورتحال میں اس قدر واضح اور بنیادی تبدیلی پر کہ جس کا عام طور پر نوٹس نہیں لیا گیا تھا برڈووڈ (Birdwood) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "اگر برطانوی کامن ویلتھ 1947ء میں وقوع پذیر ہونے والی عظیم تبدیلی کی اہمیت سے کچھ زیادہ آگاہ نہ تھی تو باقی دنیا تو اس کے بارے میں مکمل طور پر بے علم تھی۔ اس کی توجہ محض ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات' مسئلہ کشمیر اور نئے ہندوستانی آئین کے قابل عمل ہونے یا نہ ہونے' وغیرہ جیسے سیدھے سادھے مسائل پر مرکوز تھی۔ چنانچہ یہ حقیقت کہ شمالی افریقہ سے لے کر چین سے متصل سمندروں تک کے علاقے سے متعلق پالیسی میں اس قدر سرعت سے تبدیلی واقع ہو گی عمومی توجہ حاصل نہ کر سکی۔ مثال کے طور پر ان تمام تر واقعات سے جو کہ ایرانی تیل کے کنوؤں اور آئل ریفائنری (جس کی مالیت 300 ملین پاؤنڈ تھی) کے ہاتھوں سے نکل جانے پر منتج ہوئے کوئی یہ اندازہ نہ کر پا رہا تھا کہ ایسا اس وجہ سے ہوا کیونکہ تب ہندوستان میں ویسی افواج دستیاب نہ تھیں جو خوزستان میں ہمارے مفلوات کا تحفظ کرتیں (Bird wood, 1953:173)_

اس کے بعد برڈووڈ نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اپوزیشن میں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے تبدیلی لائی جا سکتی ہے کہ کیا پاکستان اپنی سرزمین سے باہر ہمیں اپنی

افواج مہیا کر سکتا ہے (Ibid., : 180) یہ وہ خیال تھا جو کہ پاکستان کے امریکہ کے ساتھ فوجی اتحاد کی بنیاد بنا۔ اس وقت امریکی سکالر اور مشیر بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی کتاب ڈیفنس آف دی مڈل ایسٹ میں لکھا "روایتی طور پر دونوں عظیم جنگوں میں مشرق وسطیٰ کے کلی دفاع کی ذمہ داری برطانیہ اور کامن ویلتھ کی افواج کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ اب یہ فطری امر ہے کہ انہی عناصر کو اس خطے کے دفاعی معاملات میں مرکزی کردار ادا کرنا چاہئے..... (Campbell: 1960:39)۔ ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے کیمبل نے اس شک کا اظہار کیا کہ کیا پاکستان اپنے اندرونی مسائل کے پیش نظر ایسے دفاعی نظام میں کوئی قابل ذکر کردار ادا کر سکے گا۔

بظاہر امریکہ نے برطانیہ اور ایرانیوں کے مابین پھوٹ پڑنے والے اس تنازع میں اپنی غیر جانبدارانہ حیثیت برقرار رکھی اور فریقین میں ایک دیانتدار ثالث کے فرائض سر انجام دینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن حقیقت میں ایرانی تیل کی نیشنلائزیشن سے اسے بھی بہت تشویش ہوئی تھی۔ جیسا کہ رمضانی نے رقم کیا "اس تشویش کی بنیادی وجوہات یہ تھیں (1) اینگلو ایرانی تنازعے سے امریکی اتحادیوں (مغربی ممالک) کو تیل کی ترسیل معطل ہو جائے گی (2) ایرانی تیل کی نیشنلائزیشن سے خلیج فارس میں معدنی تیل سے متعلق امریکی مفادات کو بھی زک پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ جنوب سے برطانیہ کے مکمل انخلاء کے باعث علاقے سے مغرب کے اثر و رسوخ کے کم ہو جانے کا واضح امکان بھی موجود تھا اور (4) ایرانی سیاست میں جنم لینے والے عدم استحکام کے باعث وہاں کی معیشت میں بھی ابتری آ جانے کا خدشہ تھا اور خاص طور پر روز افزوں تودہ پارٹی کے اثر و رسوخ کے نتیجے میں وہاں کیمونسٹ انقلاب برپا ہو جانے کے امکانات کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (Ramazani, 1975:242) وہ مزید کہتا ہے کہ "جب آئزن ہاور کی حکومت قائم ہوئی (دو سال بعد) تو واشنگٹن نے ایڈن (Eden) کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ جس کے مطابق "ہمیں مصدق ہی کو رام کرنے کی کوششوں کی بجائے اس کے متبادل تلاش کر لینا چاہئے۔" (Ibid.,: 244-5)۔ چنانچہ سی آئی اے اور آپریشن اے جیکس (Ajax) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کچھ زیادہ وقت نہ لگا۔ 19 اگست 1953ء کو مصدق کی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا اور شاہ ایران کو امریکی آلہ کار کی حیثیت سے

بحال کر دیا گیا اور مکمل اختیارات سونپ دیئے گئے۔ سی آئی اے نے اپنی اس کاروائی پر فخر کرتے ہوئے انقلاب کے خاتمے کے اس عمل کو انتہائی آسان قرار دیا۔ ٹلی (Tully) رقم کرتا ہے کہ "ایسا کرنا نہ صرف امریکہ کی سلامتی کے لئے بلکہ پورے مغربی دنیا کے مفاد کے لئے اشد ضروری تھا' وہ مزید کہتا ہے "یہ شروع سے لے کر آخر تک امریکی آپریشن تھا۔"

(Tully, 1962:96-cf. also Barnet, 1969, pp 226-7)

امریکی تعاون اور پشت پناہی کے ساتھ مشرق وسطی کے لئے ایک فوجی حکمت عملی کو تشکیل دیا گیا جو کہ امریکہ کے مقامی حکوتوں کے ساتھ فوجی اتحاد پر مبنی تھی۔ اس فوجی حکمت عملی میں پاکستان اور ترکی کو کلیدی کردار ادا کرنا تھا۔ حکومت پاکستان کو بھی اس ضمن میں اس کے لئے مختص رول کو ادا کرنے کے لئے فوجی قوت کو بڑھانے پر آمادہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ امریکہ اور مغرب کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی اس ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ پاکستان کے فوجی اخراجات میں غیر معمولی اضافہ کیا جائے جو کہ پاکستان کے لئے برداشت کرنا ناممکن تھا۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت میں جس میں وزیراعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین بھی شامل تھے۔ فوجی اخراجات میں اتنے زیادہ اضافے پر قطعاً" خوش نہ تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ان اخراجات کا مشرقی پاکستان کو بالکل کوئی فائدہ نہ ہو سکتا تھا۔ بنگال کے سیاستدانوں کو ایسی فوج کا اتنا طاقتور ہونا بھی ناگوار گذر رہا تھا جس میں غیر بنگالیوں کی واضح اکثریت تھی۔ چنانچہ جب امریکہ اور پاکستان کے فوجی اتحاد کی بات چلی تو وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے اس کی مخالفت کی۔ اس کی اس مخالفت میں مشرقی پاکستان کے اجتماعی احساسات صاف جھلکتے دکھائی دے رہے تھے۔ خواجہ ناظم الدین کی پریشانی کا بنیادی سبب یہی تھا کہ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی منصوبوں پر کام کی رفتار اس وجہ سے بہت ست تھی کیونکہ ان کے لئے فنڈز دستیاب نہ ہو سکے تھے جبکہ غیر بنگالی فوج کے لئے اخراجات میں عمودی اضافہ کر دیئے جانے پر غور کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ وقت کی ضرورت یہ تھی کہ ناظم الدین کو راستے سے ہٹا دیا جائے جو کہ سد راہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس سے پہلے ہی ناظم الدین لیاقت علی خان کے اکتوبر 1951ء میں قتل ہو جانے

کے بعد گورنر جنرل کے قلمدان کو چھوڑ کر وزارت اعظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں گورنر جنرل کی جگہ خالی ہو جانے کی وجہ سے اس عہدے کے لئے مختلف امیدواروں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ اس کشمکش میں میدان ملک غلام محمد کے ہاتھ آیا جو کہ اس سے پہلے وزیر خزانہ تھا۔ گورنر جنرل کی کرسی پر متمکن ہو کر وہ پاکستانی ریاست کا طاقتور ترین شخص بن گیا۔ بیوروکریسی اس کے مکمل کنٹرول میں تھی جبکہ فوج اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ امریکہ کا بھی پسندیدہ تھا۔ جو کہ اب گورنر جنرل بن گیا تھا جس کے پاس دور رس آئینی اختیارات کے علاوہ حکومت کو اپنا دست نگر بنائے رکھنے کی طاقت بھی تھی۔ جب جناح گورنر جنرل تھے تب گورنر جنرل کا عہدے میں تمام اختیارات کا ارتکاز ہو گیا تھا لیکن جب جناح کی وفات کے بعد ناظم الدین گورنر جنرل بنا تو کاروبار حکومت کو چلانے کے لئے تمام ضروری اختیارات وزیراعظم لیاقت علی خان کو مل گئے اور گورنر جنرل کا عہدہ فورمل (Formal) ہو کر رہ گیا۔ لیکن غلام محمد کے گورنر جنرل بنتے ہی یہ عہدہ ایک مرتبہ پھر تمام اختیارات کا سرچشمہ بن گیا۔ اب غلام محمد حکومتی کاروبار چلانے اور پالیسی تشکیل دینے میں مرکزی کردار' ادا کرنے لگا تھا اور یہی امریکی مفاد کے لئے کارآمد تھا۔ اب تین ایسے افراد پاکستان کے اہم ترین عہدوں پر فائز ہو چکے تھے جو پوری طرح سے امریکہ کے آلہ کار بن گئے ہوئے تھے یعنی غلام محمد گورنر جنرل' جنرل سکندر مرزا سیکرٹری دفاع جبکہ جنرل ایوب خان فوج کا کمانڈر انچیف بن چکا تھا۔ اب ریاستی امور کو مکمل طور پر اپنی دسترس میں لانے کے لئے سب سے پہلے وزیراعظم ناظم الدین کو راستے سے ہٹانا اگلا مرحلہ تھا۔

چنانچہ مزید کوئی تاخیر کئے بغیر امریکی ایجنسیوں نے اس "تین کے گروہ" کے ساتھ مل کر ناظم الدین حکومت کو کمزور کرنے کے کام کا آغاز کر دیا تاکہ ایسی حکومت کے قیام کو ممکن بنایا جا سکے جو مکمل طور پر امریکہ کی دست نگر ہو۔ لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے طرح طرح کے احتجاجی مظاہرے' فسادات اور بحران وجود میں لائے گئے۔ ان میں احمدیوں کے خلاف چلنے والی تحریک بھی شامل تھی جو کہ پنجاب میں خونریزی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور جس کے نتیجے میں وہاں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔

لیکن اس عرصے میں وہ گر جو سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوا وہ "خوراک کے بحران" سے متعلق کیا جانے والا جھوٹا پراپیگنڈہ تھا۔ جس نے ہر طرف متوقع قحط کا خوف طاری کر دیا۔ پاکستانی عوام میں آنے والے قحط سے جنم لینے والے خدشات کو دوچند کر دینے کی غرض سے یہ بات بار بار دہرائی جانے لگی کہ 52-1951ء کے دوران مغربی پاکستان میں خشک سالی کے باعث گندم کی پیداوار میں شدید کمی واقع ہونے کا قطعی امکان ہے۔ گندم کی پیداوار میں کمی کی یقین دہانی کے لئے یہ بھی بارہا" کہا جانے لگا کہ ہندوستان نے نہری پانی کا رخ موڑ دیا" ہے جس کی وجہ سے زرعی اراضی کو سیراب کرنے کے لئے پانی کی معقول مقدار میسر نہ آ سکی (یاد رہے کہ نہری پانی کے تمام تر ذرائع مشرقی پنجاب میں واقع تھے)۔ نہری پانی کے رخ کو تبدیل کر دینے کے ہندوستانی عمل کو خاص طور پر پروپیگنڈے کے ذریعے بار بار اچھالا گیا اور بہت حد تک پانی کی فراہمی میں رکاوٹ ڈالنے ہی کو فصلوں کی ناکامی اور پیش آمدہ قحط کی وجہ بتایا گیا۔ اس پروپیگنڈہ کا اثر یہ ہوا کہ ذخیرہ اندوزوں (Speculatous) نے غلہ ذخیرہ کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں اس کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوا غلے کی قیمت میں غیر معمولی اضافے سے عوام کو اس پروپیگنڈے پر پورا یقین ہونے لگا جو کہ اس سے پہلے قحط اور فصلوں کی ناکامی کے متعلق بڑے زور و شور سے کیا گیا۔ مارچ 1953ء میں اپنی بجٹ تقریر کے دوران چوہدری محمد علی نے اس سال گندم کی مجموعی پیداوار میں کم از کم ایک ملین ٹن کمی کا خدشہ ظاہر کیا تھا جو کہ مجموعی اوسط پیداوار کا تقریباً ایک چوتھائی بنتا تھا۔ جبکہ گندم کی مجموعی کمی کا تخمینہ تقریباً ڈھائی ملین ٹن لگایا گیا۔

اس متوقع قحط کا سدباب کرنے کے لئے ناظم الدین حکومت نے اضطراری طور پر خوراک کی فراہمی کے لئے مختلف ممالک کو اپیلیں کرنا شروع کر دیں۔ حکومت پاکستان نے ان اپیلوں کے ذریعے خاص طور پر امریکہ کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس مشکل گھڑی میں پاکستان کو خوراک فراہم کرے۔ لیکن امریکہ نے انتہائی سرد مہری سے کام لیا۔ البتہ آسٹریلیا اور کینیڈا نے فوری طور پر 160,000 ٹن گندم پاکستان بھیجی لیکن یہ گندم پاکستان میں متوقع مجموعی کمی کا محض 6 فیصد تھی۔ امریکہ سے خوراک کی صورت میں مدد حاصل کرنے میں ناکامی کے باعث ناظم الدین حکومت

مستعفی ہونا پڑا۔ اس طرح امریکی عزائم کی تکمیل کا وقت آن پہنچا۔ امریکہ نے پاکستان کو گندم فراہم کرنے کا وعدہ کر دیا لیکن اس کے عوض پاکستان سے اس امداد کی فراہمی کی قیمت بھی مانگی۔ امریکہ نے گندم کے عوض اپنے آلہ کار محمد علی بوگرہ کو جو کہ ان دنوں امریکہ میں پاکستان کا سفیر تھا اپریل 1953ء میں پاکستان کا وزیراعظم بنوا دیا۔ لیکن حکومت پر اصل کنٹرول ملک غلام محمد ہی کے پاس رہا۔ اور بوگرہ اس کے ہاتھوں محض کٹھ پتلی تھا۔ غلام محمد کے لئے سیاسی طور پر بوگرہ کو وزیراعظم کے طور پر قبول کر لینا ویسے بھی مفید تھا کیونکہ بوگرہ کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور بظاہر سربراہ حکومت وزیراعظم کی حیثیت سے وہی تھا یہ علیحدہ بات ہے کہ اصل عنان اقتدار غلام محمد کے ہاتھوں میں تھی۔ وہی بوگرہ کی کابینہ کے ارکان کو منتخب کرتا حتیٰ کہ ان کو محکمہ جات بھی وہ خود ہی عطا کرتا تھا۔ جبکہ محمد علی بوگرہ بے اختیار اور برائے نام سربراہ حکومت تھا۔

جونہی نئی حکومت نے اقتدار سنبھالا امریکہ نے خوراک کی صورت میں امداد فراہم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ابھی تک امریکہ کی طرف سے 700,000 ٹن گندم مہیا کرنے کی محض پیشکش ہی کی گئی تھی اس کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ پاکستان کو مزید 300,000 ٹن گندم دے دے گا۔ لیکن اس زبانی کلامی وعدے کو ایفاء ہونے میں سال کا بیشتر حصہ بیت گیا اس وقت تک پاکستان میں گندم کی اگلی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ اس سال پیداوار بھی بہت زیادہ ہوئی۔ تب تک یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ "خوراک کا بحران" محض من گھڑت اور سراسر جھوٹ پر مبنی منصوبہ تھا جو صرف اور صرف ناظم الدین کو حکومت سے الگ کر دینے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ قحط نام کی چیز سرے سے وجود ہی نہ رکھتی تھی لیکن یہ تمام تر سازش کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اور جب امریکی گندم پاکستان پہنچی تو اس وقت پاکستان کو اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی چنانچہ اسے گوداموں میں ڈال دیا گیا جہاں وہ پڑی پڑی گل سڑ گئی۔ اس طرح جب یہ گندم انسانی استعمال کے قابل نہ رہی تو اسے یورپی منڈی میں جانوروں کی خوراک کے طور پر فروخت کرنا پڑا۔ جبکہ پاکستان کو اس گندم کی ادائیگی یو ایس پی ایل 480 پروگرام کے تحت روپوں میں کرنی پڑی۔ اس طرح یہ اقدام ملک کے لئے نہ صرف معاشی اعتبار سے بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی بہت مہنگا ثابت ہوا۔

بارنڈس (Barnds) کا خیال ہے کہ محمد علی بوگرہ مشرقی پاکستان کے سیاست دان کی حیثیت سے ان عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ جن کے بارے میں مشرقی پاکستان کے عوام غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ چنانچہ بوگرہ نے بھی ملٹری اتحاد اور فوجی اخراجات میں اضافے کو پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھا۔ لیکن وہ غلام محمد اور اس کے حواریوں کا ایک طرح سے قیدی تھا۔ بارنڈس (Barnds) رقم طراز ہے "وزیراعظم محمد علی اقتصادی اور سیاسی معاملات پر اپنی زیادہ تر توجہ مرکوز کئے ہوئے تھا اور اس کے لئے امریکہ اور پاکستان کے درمیان طے پانے والے اس اتحاد سے رائے عامہ پر مرتب ہونے والے اثرات خاصی تشویش کا باعث تھے۔ 1953ء کا آغاز ہوا تو محمد علی بوگرہ نے امریکہ کی طرف سے دی جانے والی فوجی امداد کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ فوجی امداد کی بجائے پاکستان کو اقتصادی امداد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اسے یہ اندیشہ تھا کہ اسلحہ کی شکل میں دی جانے والی امداد اقتصادی امداد کی قیمت پر دی جائے گی اور اس کا یہ بھی اثر ہو گا کہ جنرل ایوب خان (فوج کا کمانڈر انچیف) اور فوج حکومتی کنٹرول سے آزاد ہو کر خودمختار حیثیت اپنا لے گی۔ (Barnds : 1972:102) لیکن وزیراعظم بے اختیار تھا جس کی وقعت برائے نام تھی۔ وہ اس موقع پر کسی بھی طرح کی تبدیلی کا باعث نہ بن سکتا تھا نہ ہی وہ پاکستان کو امریکہ کی سرپرستی میں جانے سے روکنے کی پوزیشن میں تھا۔

چنانچہ اس عرصے کے دوران فوجی معاہدوں کا پورا ایک سلسلہ وجود میں آیا جس کی معراج 11 جنوری 1955ء کو طے پانے والا "میوچول سیکیورٹی : ڈیفنس سپورٹ اسسٹنس ایگریمنٹ"

(Mutual Security : Defence Support Assistance Agreement) تھا جس کے ذریعے مشرق وسطی سے متعلق امریکہ کی نئی فوجی حکمت عملی وجود میں آئی۔ اس فوجی حکمت عملی کا انحصار پاکستان پر تھا کیونکہ اس خطے میں ضرورت پڑنے پر امریکہ اور اس کے دیگر اتحادیوں کو فوجی فراہم کرنے کی ذمہ داری پاکستان کو ملی۔ پاکستان کو اس صورت میں فوجی مداخلت کے لئے فوجی مہیا کرنے تھے اگر مغرب کی کسی بھی دست نگر حکومت کو بیرونی حملے کا خطرہ ہو یا پھر اسے ملک کے اندر ہی سے قوم پرست یا انقلابی

تحریکوں کا سامنا ہو تو اس مقصد کے لئے امریکہ نے پاکستانی افواج کو اسلحہ سے لیس کرنے کے لئے فوجی امداد فراہم کرنی شروع کر دی لیکن اس کے لئے یہ شرط رکھی گئی کہ یہ اسلحہ صرف امریکی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس بات پر باہمی رضامندی طے پائی تھی کہ اگر مثال کے طور پر شاہ ایران کو ایرانی قوم پرستوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو پاکستان یا پھر ترکی سے افواج ایران میں داخل ہو کر امریکی آلہ کار (شاہ ایران) کو روس کی سرپرستی میں ہونے والی کمیونسٹ شورش سے تحفظ فراہم کر سکتی تھیں۔

اس طرح پاکستان اور ترکی کی شراکت میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ایران سے لے کر مشرق وسطی کے علاقے کی کہ جہاں سے تیل نکالا جاتا تھا احاطہ بندی کر دی۔ 1953ء کے آخر تک پاکستان اور ترکی کے مابین مذاکرات شروع ہو گئے (ان دونوں نے 2 اپریل 1953ء کو امریکہ کے ساتھ سلامتی (Security) کے ضمن میں دوستی اور تعاون کے معاہدے پر دستخط کئے تھے) اس کے کچھ ہی عرصے بعد یعنی مئی 1953ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی امداد کے ایک سمجھوتے پر بھی دستخط ہوئے۔ "اس سمجھوتے کا ایک حصہ پاکستان کے علاقائی دفاع کے لئے تعاون کرنے سے متعلق تھا (Campbell, 1960:51) جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ پاکستان وہاں امریکی مفادات کا اور خاص طور پر اس کے تیل سے وابستہ مفادات کا تحفظ کرے گا۔

ترکی اور عراق کے مابین باہمی سلامتی اور دفاع کے لئے تعاون کا معاہدہ 24 فروری 1955ء کو کیا گیا۔ اس معاہدے کو بغداد پیکٹ کا نام دیا گیا۔ برطانیہ نے اپریل 1955ء میں بغداد پیکٹ میں شمولیت اختیار کی۔ جبکہ پاکستان ستمبر 1955ء اور شاہ ایران اسی سال اکتوبر میں اس میں شامل ہوا۔ اس طرح یہ پانچ رکنی معاہدہ مکمل ہو گیا۔ بظاہر امریکہ بغداد پیکٹ میں شامل نہ ہوا لیکن یہ معاہدہ اسی کی رضا سے انجام پذیر ہوا اور اس نے فوجی امداد فراہم کر کے بغداد پیکٹ کی معاونت کی۔ امریکہ بغداد پیکٹ میں اس لئے شامل نہ ہوا کیونکہ اس کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سعودی عرب اور مصر سے ابھی بھی اچھے تعلقات کے قیام کی کوشش میں تھا اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ سوویٹ یونین کی مشرق وسطی کی طرف خواہ مخواہ توجہ مبذول کروائے۔ مزید برآں وہ اسرائیل کو بھی

ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس نے پیکٹ کی صریحاً" مخالفت کی تھی اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے لئے سینٹ سے پیکٹ میں باقاعدہ شمولیت کی توثیق کے حصول میں بھی خاصی مشکل پیش آ سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ امریکہ کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی گھریلو سیاست کی پر پیچ دنیا ہی میں الجھ کر رہ جاتی۔ (Campbell, 1960:60)۔ لہٰذا اس خطے کے لئے امریکہ کی فوجی حکمت عملی بہت سوچ بچار کے بعد مضبوط بنیادوں پر استوار کی گئی۔

پاکستان کے حکمران طبقے نے اس فوجی اتحاد کا پاکستانی عوام کے سامنے جواز پیش کیا کہ اس کی بدولت پاکستان کو ہندوستان سے تحفظ حاصل ہو گا حالانکہ یہ سراسر جھوٹ تھا۔ کیونکہ اس اتحاد کے ضمن میں یہ بات صریحاً" واضح کر دی گئی تھی کہ پاکستان کو دی جانے والی تمام سہولتیں اور جنگی سامان بھارت کے خلاف ہرگز استعمال نہ ہو گا۔ امریکہ نے بھارت کے شکوک اور خدشات کو رفع کرنے کی غرض سے ابتداء ہی میں دہلی حکومت کو ہر طرح کی یقین دہانی کرا دی تھی کہ پاکستان کو فراہم کی جانے والی امداد بھارت کی خلاف استعمال نہیں کی جائے گی۔ امریکہ نے سیٹو (SEATO) کے معاہدے میں یہ شرط باقاعدہ طور پر شامل کی تھی۔ البتہ بغداد پیکٹ میں اس قسم کی شرائط کو عائد نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس معاہدے میں امریکہ بذات خود شامل نہ تھا اس کے باوجود اس کی پیش بندی ہر ممکن طریقے سے کر لی گئی کہ پاکستان کو دیا جانے والا اسلحہ ہندوستان کے خلاف استعمال نہ ہونے پائے۔

چنانچہ پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اور اس بات کو یقینی بنانے کے لئے امریکہ نے باقاعدہ ادارے کی سطح پر انتظامات کئے تھے تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ یہ فوجی امداد ہندوستان کے خلاف تو استعمال نہیں ہو رہی۔ یو ایس ملٹری اسسٹنس پروگرام (MAP) کے تحت پاکستانی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ ایم اے پی (MAP) کہلایا جبکہ دوسرے کو نان ایم اے پی (Non-MAP) حصہ کہا جانے لگا۔ اب امریکی فوجی امداد صرف (MAP) کے فوجی یونٹوں کے لئے ہی سختی سے مخصوص کر دی گئی۔ (MAP) کے فوجی دستے پاکستان کی مغربی سرحدوں پر متعین کئے گئے تاکہ ضرورت پڑنے پر

امریکہ کی طرف سے مشرق وسطی میں مداخلت کر سکیں۔ یہ فوجی ساز و سامان (MAP
Non) کے فوجی دستوں کو استعمال کرنے کی قطعاً" اجازت نہ تھی۔ یہ فوجی دستے عموی
طور پر ہندوستان کی سرحدوں کے قریب ہی متعین کئے جاتے تھے خاص طور پر انہیں
کشمیر اور مشرقی پاکستان میں فوجی خدمات پر مامور کیا جاتا تھا۔ اس ساری کاروائی کی امریکی
افسران کڑی نگرانی کیا کرتے تھے جو راولپنڈی میں جی ایچ کیو میں مقیم ہوتے تھے۔

1953ء کے آخر میں پاکستانی آرمی پلاننگ بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بورڈ
خالصتاً" فوجی افسروں پر مشتمل تھا جبکہ ان افسران کے مشیر امریکی تھے۔ اس بورڈ کے
قیام کا مقصد پاکستانی فوج کی تشکیل نو' منصوبہ بندی کی نئے سرے سے ترتیب اور اس
کی کمٹ منٹ کو نئی جہت فراہم کرنا تھا۔ امریکن ملٹری سروے کمیشن فروری 1954ء
میں پاکستان پہنچا اور اس سال اکتوبر کے دوران راولپنڈی میں جی ایچ کیو میں یو ایس
ملٹری سروے ایڈوائزری گروپ یعنی US Military Survey Advisory Group
(MAAP) براجمان ہو گیا۔ میگ (MAAG) 1965ء میں جب اسے تحلیل کر دیا گیا تو
وہ بے انتہا اثر و رسوخ کا حامل تھا۔ اس کے ذریعے پاکستانی فوج اور پینٹاگون کے
درمیان باقاعدہ تعلق استوار ہو گیا تھا جو کہ تمام تر حکومتی و دیگر سویلین واسطوں
(Channels) کو نظر انداز کر کے وجود میں لایا گیا تھا۔ جن میں وزیراعظم اور پاکستانی
کابینہ وغیرہ شامل تھی۔ 1956ء میں جناب زاہد حسین نے جو اسٹیٹ بنک آف پاکستان
کے پہلے گورنر تھے راقم سے اس ضمن میں نہایت ہی گہرے خدشات کا اظہار کیا زاہد
حسین کا موقف تھا کہ مختلف وزراء بھی ان کی (زاہد حسین کی) طرح اس بات پر انتہائی
متفکر تھے کیونکہ امریکہ پاکستانی فوج کے ساتھ براہ راست معاملات طے کر رہا تھا اور
حکومتی اہلکاروں کا کردار مکمل طور پر منہا ہو گیا تھا۔ وزراء کو تو قطعاً" علم نہ تھا کہ کیا
کچھ ہو رہا ہے جبکہ پاکستانی فوج کی صفوں میں امریکی اثر و رسوخ پوری طرح سے
سرایت کر چکا تھا۔ پاکستانی فوج کے مورخ میجر جنرل فضل مقیم خان نے پاکستانی فوج
افسران کے نظریات..... پاکستانی کمانڈروں اور سٹاف..... فوجی حکمت عملی کے ماہرین پر
مرتب ہونے والے امریکی روابط' امریکہ کی سرپرستی میں تربیتی کورسوں اور امریکہ کے
مطالعاتی دوروں کے اثرات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ ان دنوں امریکی تربیتی ٹیمیں

اور بعض امریکی افسر اپنی انفرادی حیثیوں میں پاکستانی افواج کے مختلف یونٹوں اور جی۔ ایچ۔ کیو سے منسلک رہے (Khan, 1963:159)

اپنے اپنے فرائض سے عہدہ برآء ہونے کی اہلیت کے حصول کے لئے پاکستانی افواج میں توسیع کی گئی۔ امریکہ نے فوج کے پاکستانی نظام سیاست میں کردار کو موثر بنانے کی بھی بہت اہمیت دی۔ "سمری پریزینٹیشن آف دی (یو ایس) میوچل سیکیورٹی پروگرام"

(Summary Presentation of the (US) Mutual Security Program) جو کہ 1957ء میں شائع ہوئی اس میں کہا گیا کہ "سیاسی نقطہ نظر سے بھی امریکی فوجی امداد نے پاکستانی مسلح افواج کو مضبوط اور اہمیت کا حامل بنا دیا ہے جو کہ وہاں ایسی واحد اور عظیم ترین قوت ہے جو ملکی استحکام کی ضامن بن سکتی ہے علاوہ ازیں امریکی امداد ہی کے باعث پاکستان مشترکہ دفاعی معاہدوں میں شریک ہوا ہے۔" اس تمام تر پیش رفت ہی کی وجہ سے پاکستانی سیاسی لیڈرشپ خاصی غیر موثر ہو گئی حالانکہ ملک میں براہ راست فوج کی حکومت نہ تھی۔

چونکہ پاکستان نے امریکہ کی طرف سے عائد کی گئی ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کو امریکہ کی طرف سے وسائل کی فراہمی جاری کر دی گئی۔ اگر ہم فوجی اخراجات کی بیلنس شیٹ کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ امریکی امداد کے علاوہ پاکستان کو اپنے وسائل کو استعمال میں لا کر مغرب سے کئے گئے فوجی اتحادوں کی دفاعی ضروریات کو پورا کرنا پڑا۔ اس طرح پاکستان نے گھریلو دفاعی اخراجات میں اضافہ کر کے ان دفاعی اتحادوں کی ضروریات کے پیش نظر اپنی فوجی گنجائش اور اہلیت میں وسعت دی۔ علاوہ ازیں امریکی امداد سے قائم ہونے والی توسیع شدہ فوجی تنصیبات مقامی دفاعی اخراجات میں بھی غیر معمولی اضافے کا سبب بنیں۔ یہ اضافی اخراجات مغربی ممالک کے ساتھ طے پانے والے دفاعی اتحاد کی ضروریات (آمدورفت، رہائشی سہولیات وغیرہ) کو پورا کرنے کے لئے ناگزیر ہو گئی تھیں۔ امریکہ نے تو پاکستان کے ایم اے پی (MAP) فوجی دستوں کے لئے صرف ہتھیار ہی مہیا کئے تھے۔ (یاد رہے کہ ایم اے پی (MAP) فوجی دستے مذکورہ بالا فوجی

اتحاد ہی کے لئے بھرتی کئے گئے تھے) لیکن پاکستان کو ان دستوں کی تنخواہوں کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا تھا اور انہیں دیگر سہولیات بھی مہیا کرنا پڑتیں تھیں جن سے پاکستانی معیشت پر مالی بوجھ دوچند ہو گیا تھا۔ اقتصادی بحران کے دوران بھی اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ ایم اے پی (MAP) دستوں پر آنے والے اخراجات میں کمی واقع نہ ہونے پائے۔ اگر کبھی فوجی اخراجات میں تھوڑی بہت کمی کا سوال زیر بحث آیا بھی تو نان ایم اے
پی
(Non MAP) افواج کے اخراجات کو کم کر دینے کی بات کی گئی جو کہ پاکستان کے اپنے دفاع کے لئے متعین تھیں۔ 1960ء میں جب بیرون ملک سے فوجی ساز و سامان خریدنے کے لئے غیر ملکی کرنسی پر حد بندی عائد کی گئی تب بھی نان ملٹری اسسٹنس پروگرام (Non MAP) سے متعلقہ افواج ہی متاثر ہوئیں۔ (Jordan, 1962) اس طرح غربت کے مارے ہوئے پاکستان نے مشرق وسطی میں مغربی ممالک کے تیل سے وابستہ مفادات کی نگہداشت کے لئے اس قدر اقتصادی بوجھ برداشت کئے رکھا۔ کسی بھی آزاد قوم کے لئے اس طرح کی پالیسی کو اپنا لینا غیر معمولی عمل تھا۔

ان تمام تر حالات و واقعات سے امریکہ کا خوش ہونا فطری امر تھا۔ جیسے امریکہ کے سیکرٹری آف ٹریژری (Secretary of Treasury) نے امریکی سینٹ میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا "جہاں تک فوجی امداد کے جاری رہنے اور اس کی مقدار کا تعلق ہے تو جیسا کہ میرا خیال ہے' اس (فوجی امداد) کے عوض ہمارے مفادات کس قدر سرعت اور عمدگی سے پایہ تکمیل تک پہنچتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم کو دوسرا طریقہ کار یا حکمت عملی اپنائیں ہر لمحے مسئلہ اپنی ترجیحات اور طریقہ کار کے تعین کا ہوتا ہے اور اگر آپ کسی بھی طریقہ کار سے پیسہ بچا سکتے ہیں تو میں اس طریقہ کار کا حامی ہوں۔ اور اگر کسی طریقہ کار کو اپنا لینے سے آپ انسانی جانیں بچا سکتے ہیں تو میں اس کا ہر طرح سے حامی ہوں۔" بالکل اسی طرح کانگرس کے ایک رکن واریز (Vorys) نے 1956ء میوچل سیکیورٹی ایکٹ کے سلسلے میں ایوان نمائندگان میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا "پچھلے برس بندوق کے بغیر ایک امریکی فوجی کو ملک سے باہر امریکہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے بھیجنے پر 5,900 (ڈالر) خرچ ہوئے۔ جبکہ اس پروگرام کے تحت ایک آدمی پر 744

(ڈالر) خرچ آ رہے ہیں اور اس کے پاس بندوق بھی ہے اور وہ باہمی تحفظ اور سلامتی کے لئے جہاں بھی ہمارا جائنٹ چیف مناسب سمجھتا ہے متعین کر دیا جاتا ہے۔" ان بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سودا ہر لحاظ سے یک طرفہ تھا۔ اس سے امریکہ کو اقتصادی فائدہ ہی نہیں پہنچ رہا تھا اور نہ ہی یہ کہ سانولی (Brown) جانیں گوری جانوں سے ارزاں تھیں بلکہ اس تمام تر کاروائی کے پس منظر میں نہایت ہی گہری سوچ بچار کارفرما تھی بالفرض پاکستانی افواج کو ایران میں امریکی آلہ کار شاہ ایران کی مدد کے لئے ایران میں عملی طور پر مداخلت کرنا پڑتی تو بین الاقوامی سیاست میں اس کے امریکی افواج کی براہ راست مداخلت کی نسبت بالکل مختلف اثرات (رد عمل) مرتب ہوتے۔ امریکی افواج کی براہ راست مداخلت کی صورت میں ایران میں نوآبادیاتی نظام کے مخالف جذبات برانگیختہ ہو جاتے اور اس کی وجہ سے قوم پرستی پر مبنی شاہ کے خلاف بغاوت مزید مضبوط ہو جاتی۔ اس لئے بالواسطہ مداخلت کی حکمت عملی کہیں زیادہ عیارانہ ثابت ہو سکتی تھی اور زیادہ کارگر بھی!

فوجی اتحاد تشکیل دینے کی امریکی حکمت عملی کے کچھ ناقدین بھی تھے جن میں سے بعض سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں کافی اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ ان میں سی۔ بی مارشل سب سے زیادہ بیباکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ وہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پالیسی پلاننگ سٹاف کا رکن تھا اور پاکستان کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی کا سیاسی مشیر بھی رہ چکا تھا۔ مارشل کا خیال تھا کہ سیاسی نظام کی کمزوری اور اندرونی عدم استحکام کی وجہ سے پاکستان ضرورت پڑنے پر ان فرائض کی بجاآوری کا اہل نہیں ہے جن کی امریکہ اس سے توقع کئے بیٹھا ہے۔ چنانچہ کیمبل بھی کم و بیش اسی طرح کے خیالات کا حامی تھا۔ وہ رقم طراز ہے "پاکستان..... ایک ایسی قوم ہے جسے ابھی تک سیاسی استحکام حاصل نہیں ہو سکا..... چنانچہ اس سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ یہ مشرق وسطی میں کوئی بڑا کردار ادا کر سکے گا۔" (Campbell, 1960:289)

اتحادوں کی اس حکمت عملی کی آزمائش کا لمحہ اس وقت آیا جب 1958ء میں عراق میں انقلاب برپا ہوا۔ اس آزمائش پر یہ حکمت عملی پوری نہ اتر سکی۔ قاسم کی طرف سے عراق میں انقلاب برپا کرنے کے فوراً" بعد انقرہ میں بغداد پیکٹ کے رکن ممالک

(عراق کے علاوہ) نے ایمرجنسی اجلاس میں وہاں فوجی مداخلت کا فیصلہ کیا لیکن کئی وجوہات کی بنا پر فوجی مداخلت کی اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا ان میں سے سرفہرست پاکستان میں بگڑتی ہوئی سیاسی صورتحال تھی جس کا انجام چند ماہ بعد سکندر مرزا۔ ایوب خان کے اکتوبر 1958ء میں اقتدار پر قابض ہو جانے کی صورت میں نکلا۔ اس آزمائش میں ناکامی کے بعد یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہی تھی کہ فوجی اتحادوں پر مبنی یہ حکمت عملی قابل عمل نہیں ہے لہٰذا امریکہ نے فوری طور پر اسے ترک کر دیا۔ اگرچہ بغداد پیکٹ کو سینٹو کا نیا روپ دے دیا گیا لیکن اس تنظیم سے زندگی کی رمق جاتی رہی۔

اس ناکامی کے بعد امریکہ نے مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اپنی تازہ فوجی حکمت عملی مرتب کرنا شروع کی جس میں پاکستان کے کردار کو منہا کر دیا گیا۔ امریکہ کی پالیسی میں اس تبدیلی کے نتیجے میں پاکستان سے دوری اختیار کر لی گئی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات میں بہتری لانے کے لئے امریکی محکمہ خارجہ پوری طرح سے سرگرم عمل ہو گیا۔ اس سے قبل امریکہ نے پاکستان کو اس امید کے ساتھ اپنا اتحادی بنایا تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اس کے آلہ کار کے طور پر نہایت ہی اہم کردار ادا کرے گا۔ پاکستان کے فوجی اتحاد کی خاطر امریکہ ہندوستان سے اپنے تعلقات کو خطرے میں ڈال دینے پر تیار ہو گیا تھا جن کی بدولت اسے نہ صرف بہتر اقتصادی مواقع حاصل ہو سکتے تھے بلکہ امریکہ ہندوستان کی ایشیا میں غیر معمولی ساکھ اور رسوخ سے بھی مستفید ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا سوویت یونین کے ساتھ بڑھتا ہوا قرب بھی امریکہ کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔ چنانچہ اس کی تبدیل شدہ ترجیحات میں ہندوستان کو سوویت یونین کے چنگل سے آزاد کرانا بھی شامل ہو گیا تھا۔ اب جبکہ امریکہ اور پاکستان کا فوجی اتحاد ناکامی سے دوچار ہو چکا تھا تو امریکہ نے ہندوستان کے ساتھ تعلقات میں تبدیلی لانے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ اتفاق سے وہ وقت بھی اس تبدیلی کے لئے نہایت موزوں تھا کیونکہ ہندوستان کا دوسرا پنج سالہ منصوبہ 1959ء تک بحران کا شکار ہو گیا تھا اور خوراک کی صورت میں امریکی امداد کی اشد ضرورت نے ہندوستان کی غیر جانبداری (non-alignment) میں بھی لچک پیدا کر دی تھی اگرچہ غیر جانبداری کا غلغلہ ابھی بھی فضاؤں میں موجود تھا ان حالات کے علاوہ

1959ء میں وقوع پذیر ہونے والے ہندوستان اور چین کے سرحدی جھگڑے نے امریکہ کے لئے ہندوستان سے دوستانہ تعلقات کے قیام کے لئے مزید راہ ہموار کر دی۔

1962ء میں چھڑ جانے والی ہند۔ چینی جنگ (جس میں فاتح چینیوں نے یکطرفہ طور پر جنگ بندی کر کے ہر ایک کو حیران کر دیا تھا) ایسا فیصلہ کن لمحہ لے آئی جس نے امریکہ کے لئے ہندوستان کے ساتھ فوجی اور اقتصادی امداد کے ذریعے تعلقات استوار کرنے کا تازہ موقع فراہم کر دیا۔ امریکہ کے لئے یہ اس قدر سنہری موقع تھا کہ اسے ضائع کرنا ہرگز مناسب نہ تھا۔ اس پس منظر میں پاکستان امریکہ کے نزدیک محض ایک غیر ضروری بوجھ تھا چنانچہ اسے امریکہ نے نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ اب امریکہ کی جنوبی ایشیا کے حوالے سے تمام تر توجہ ہندوستان پر مرکوز ہو چکی تھی۔ اسی دوران نہرو نے ہندوستان میں متعین امریکی سفیر ‘جے’ کے گالبرائتھ (J. K. Galbraith) کو یہ بتایا کہ روسی حکومت نے اسے اشارہ دیا ہے کہ اگر ہندوستان چاہے تو اسے امریکہ سے فوجی امداد حاصل کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر کہ جب ہندوستان اور چین کی باہمی مخالفت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی نہرو نے امریکہ سے فوجی امداد کے علاوہ بھی بہت کچھ مانگا تھا۔ جیسا کہ نیول مکسویل (Neville Maxwell) بتاتا ہے ‘نہرو نے فوری اپیل کرتے ہوئے امریکہ سے بم بردار اور لڑاکا سکواڈرنوں کے ساتھ چین پر حملہ کرنے کو کہا تھا..... یہ اپیل تمام تفصیلات کے ساتھ کی گئی تھی جس میں سکواڈرنوں کی تعداد (15) کا بھی ذکر کیا گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ نہرو نے فوجی ماہرین سے ضرور مشورہ کیا تھا البتہ اس نے اپنی کابینہ کو اس سلسلے میں نہ ہی بتایا اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا مشورہ کیا۔ (Maxwell, 1970:410)

گالبرائتھ (Galbraith) نے صدر کینڈی سے اپنے براہ راست روابط کو استعمال میں لا کر ہندوستان کو امریکی امداد دلانے میں بیحد اہم کرار ادا کیا۔ اس نے اپنی ڈائری میں نقل کیا ہے کہ غیر وابستہ تحریک اب متروک ہو چکی ہے (Galbraith, 1969:486)۔ بدلتے ہوئے ان حالات میں پاکستان نے اپنا رخ چین کی طرف موڑ لیا۔ علاوہ ازیں اس نے سوویت یونین کے ساتھ اپنے تعلقات کو بھی دوستانہ شکل دینا شروع کی اگرچہ سوویت یونین کی اس وقت تک ہندوستان کے ساتھ

نہایت ہی گہری وابستگی ہو چکی تھی یہی عزم لئے مارچ 1965ء میں ایوب خان نے ماسکو کا دورہ کیا تاکہ سوویت رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے غلط فہمیاں دور کی جاسکیں اور دونوں ممالک میں تعلقات کو بہتر بنایا جاسکے۔ اسی دوران پاکستان نے پشاور ایئر بیس سے یو ٹو (U-2) جاسوسی طیارے کے ذریعے روس کی جاسوسی کرنے کی وہ سہولت جو اس سے پہلے امریکہ کو حاصل تھی واپس لے لی۔ اس کے باوجود ایوب خان نے امریکہ کو نئے سرے سے یقین دہانی کرائی کہ پاکستان کا امریکی مفادات کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ایک دست نگر ملک کے طور پر پاکستان کے حکمران طبقے کو اس بات کا پوری طرح سے اندازہ تھا کہ امریکی امداد کے بغیر پاکستان معاشی بدحالی کا شکار ہو جائے گا لہٰذا اس کے باوجود کہ امریکہ نے پاکستان کو بری طرح سے دھتکار دیا تھا پھر بھی وہ اسی کی دہلیز پر سوالی بنے رہے۔

امریکہ کی پالیسی میں آنے والی تبدیلی کے نتیجے میں پاکستان ایک مرتبہ پھر دنیا کے منظر نامے پر تن تنہا ہو گیا۔ اس کے امریکہ کے ساتھ تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ 1962ء میں جب چین اور ہندوستان کے مابین سرحدی تنازعے کے نتیجے میں جنگ ہوئی تو اس کے بعد ہندوستان کی فوجی طاقت میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ اس اضافے کا بنیادی سبب امریکہ کی طرف سے فراہم کی جانے والی فوجی امداد تھی۔ بھارت کی فوجی پوزیشن میں یکدم آنے والے استحکام اور مضبوطی نے پاکستان کو زبردست تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پاکستانی افواج یہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان طاقت کا توازن قائم نہیں رہا اور ہندوستان کو اس ضمن میں واضح طور پر برتری حاصل ہو گئی ہے۔ اسی اثناء میں ایوب خان نے ستمبر 1965ء میں اضطراب اور عجلت میں آکر بذریعہ طاقت ہندوستان سے کشمیر چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن ایوب خان نے ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان فوجی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ لیکن تب "ابھی یا کبھی نہیں" والی صورتحال درپیش تھی چنانچہ پوری طرح سے سوچ بچار کے بغیر عجلت میں فوج کو حرکت دے دی گئی بعد میں جس کے باعث پاکستان کو پچھتانا پڑا۔ پاکستان کی طرف سے کی جانے والی اس کاروائی پر امریکہ نے شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فوجی ساز و سامان کی ترسیل روک دی مزید برآں پاکستان کو دی جانے والی مالی امداد بھی بند کر دی گئی۔

پاکستان کے امریکہ کے ساتھ تعلقات کشیدگی کی اس سطح تک پہلے کبھی نہ پہنچے تھے اس کے باوجود ایوب خان نے امریکی (goodwill) کو برقرار رکھنے کی جتنا بھی ممکن تھا کوشش کی۔ اسی دوران پاکستان نے چین کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ کچھ ہی عرصے میں فرانس کے ساتھ چین پاکستان کو اسلحہ سپلائی کرنے والا سب سے اہم ملک بن گیا۔ اس بحرانی کیفیت میں ایوب خان نے عزم و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستانی خارجہ پالیسی کو "دو طرفہ" (Bilateralism) کا نام دیا۔ 1970ء کی دہائی کے دوران جب بھٹو کی حکومت قائم تھی تو تیل کی دولت سے مالا مال مشرق وسطی کے ممالک سے دوستی کے لئے خصوصی کوششیں کی گئیں۔ مشرق وسطی کے ممالک کو پاکستان نے افرادی قوت فراہم کی جو کہ اب تک زر مبادلہ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ عرب ممالک نے پاکستان کو مالی امداد بھی فراہم کرنا شروع کی۔ اس کے عوض کچھ وقت کے لئے پاکستان نے سعودی عرب کو وہاں کی حکومت کی مدد کے لئے فوجی دستے بھی مہیا کئے۔ اس تناظر میں پاکستان نے ان ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کے لئے اسلامی نظریے سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنا شروع کیا۔ مشرق وسطی کے ممالک سے پاکستان کے تعلقات کے قیام اور ان کے استحکام کی امریکہ نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ گو کہ پاکستان اور امریکہ کے دو طرفہ تعلقات میں گرم جوشی کا فقدان محسوس کیا جا سکتا تھا پھر بھی پاکستان نے کئی طرح سے امریکی مفادات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور پر 1969ء میں جب یحیٰی خان برسر اقتدار تھا تو امریکہ اور چین میں سفارتی تعلقات کے قیام کے لئے مذاکرات کو ممکن بنانے میں پاکستان ہی نے ثالث کا کردار ادا کیا تھا۔

1979ء کے بعد جب پاکستان میں جنرل ضیاء الحق اور امریکہ میں رونالڈ ریگن کی حکومت تھی تو امریکی پالیسی میں دوبارہ تبدیلی آئی اور پاکستان ایک مرتبہ پھر امریکہ کا منظور نظر بن گیا۔ امریکہ کی پالیسی میں آنے والی اس تبدیلی کے پس منظر میں دو اسباب کار فرما تھے۔ ایک تو افغانستان میں سوویت افواج کی آمد تھی جبکہ دوسرا سبب ایران میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب سے امریکی مخاصمت تھی۔ اسلامی انقلاب نے امریکی آلہ کار یعنی شاہ ایران کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ دونوں اسباب ایک دوسرے سے

باہم ملے ہوئے تھے۔

امریکہ نے نہ صرف روسیوں کو افغانستان سے نکال باہر کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا بلکہ افغان مقامی اصلاحی کیمونسٹ حکومتوں کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اس کی ترجیحات میں سے تھا۔ امریکہ کے ان عزائم کا جنرل ضیاء کو بیحد فائدہ ہوا کیونکہ مذکورہ بالا امریکی مقاصد کے حصول کے لئے جنرل ضیاء وسیلہ بنا اور اس کی حکومت کو پوری فراغ دلی سے فوجی امداد مہیا کی گئی۔ جنرل ضیاء نے افغانستان میں تو اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جس کے لئے اس کی امریکہ کی پوری آشیر باد حاصل تھی۔ افغانستان میں روسی افواج کے خلاف کاروائیوں کے لئے امریکہ اور چین نے پاکستانی سرزمین کو بغیر کسی حیل و حجت کے استعمال کیا۔ مسلمان بنیاد پرست گوریلوں کو اسلحہ اور امداد دی گئی۔ جن میں حکمت یار کی زیر قیادت حزب اسلامی سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ حزب اسلامی پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کا پروردہ بنیاد پرست پختون گروہ تھا جسے جنرل ضیاء اور امریکہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے۔ لیکن ہر طرح کی فوجی اور مالی امداد کے باوجود حکمت یار اور اس کا گروہ کامیابی حاصل نہ کر سکے کیونکہ حزب اسلامی اور حکمت یار کا اثر و رسوخ صرف غلزئی پختون قبیلے تک ہی محدود تھا جو ڈیڑھ صدی سے افغان حکومتی ڈھانچے میں ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسے پورے افغانستان میں پذیرائی حاصل نہ تھی چنانچہ حکمت یار اور اس کے غلزئی حامی کچھ ہی عرصے میں پس منظر میں بھیج دیئے گئے اور ان کی جگہ ان کے حریف درانی قبائل میں اثر و رسوخ رکھنے والے طالبان پیش منظر پر نمودار ہو گئے جنھوں نے آئی ایس آئی کی مدد سے ڈرامائی کامیابی حاصل کی۔ سیاسی طور پر طالبان سے وابستگی رکھنا پاکستان کے لئے نظریاتی خطرے کا سبب بنا۔

عمومی طور پر آئی ایس آئی اور امریکی سی آئی اے طالبان کو جو کہ 1994ء کے بعد سے افغانستان میں غالب قوت ہے معرض وجود میں لانے اور انہیں عروج دلانے کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ ان حالات سے متعلق کہ جو اس تنظیم کے وجود میں آنے کا باعث بنے بیشک کوئی بھی رائے کیوں نہ قائم کر لی جائے لیکن اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ طالبان کی کامیابی میں آئی ایس آئی کی طرف سے دی جانے والی فوجی

امداد اور اس کی طرف سے ان کی اہم مہموں کے لئے پیشہ ورانہ تربیت کے اہتمام نے کلیدی کردار ادا کیا۔ افغانستان میں طالبان کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار آئی ایس آئی پر ہی رہا ہے کیونکہ نیم خواندہ طالبان بذات خود کسی قابل نہیں۔

طالبان ہوش و حواس سے بیگانہ تنظیم کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے جس کے ارکان گولی چلاتے وقت دوست اور دشمن میں فرق کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ طالبان خطرناک حد تک غیر لچکدار' شدت آمیز اور تنگ نظری پر مبنی مذہبی نظریے سے وابستہ ہیں جو کہ نیم خواندہ افراد کے پختگی سے محروم تصورات سے ماخوذ ہے۔ طالبان عملاً خاصے متلون مزاج ہیں اسی لئے ان کے سرپرستوں کے لئے انہیں قابو میں رکھنا ایک دشوار عمل ہے۔ طالبان کے رویے نے عجیب نوعیت کے تضادات کو بھی جنم دیا ہے۔ ان کی بالخصوص ایران کے ساتھ عداوت نے پاکستانی خارجہ پالیسی کے لئے پریشان کن الجھنیں پیدا کر دیں۔ طالبان کی ایران سے روز افزوں عداوت کچھ حد تک اس کے بڑے سرپرستوں یعنی امریکہ اور سعودی عرب کی خارجہ پالیسی سے بھی میل نہ کھاتی تھیں کیونکہ یہ دونوں ممالک ایران کے ساتھ اپنے سرد مہری پر مبنی تعلقات میں لچک اور بہتری لانے کے لئے کوشاں تھے۔ افغانستان کے حوالے سے پاکستان کی پوزیشن بالکل غیرواضح ہے اس کی نہ تو کوئی سمت ہے اور نہ ہی مقصد : طالبان اور اس کے مشیر بہت کامیابی کے ساتھ پاکستان کی مرکزی حکومت' صوبائی حکومتوں اور طاقت کے دیگر مراکز کے درمیان پائے جانے والے تضادات سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ حکومت پاکستان بذات خود بھی اپنے لئے اس ضمن میں کوئی سمت متعین نہ کر پائی۔ اس حکومت کا سربراہ ایک ایسا وزیراعظم ہے جو رومانی تصورات اور مخیرالعقول خیالات کے سہارے کاروبار حکومت چلاتا ہے۔ جس سے پالیسی تشکیل دینے کا عمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تادم تحریر دونوں اطراف میں Predictability کا شدید فقدان پایا جاتا ہے اس لئے حالات کافی غیر یقینی بلکہ پیچیدہ سے ہیں۔

پاکستان کا طالبان کی حمایت اور سرپرستی کرنا کئی طرح سے پاکستان کے لئے مہنگا ثابت ہوا۔ اس دلیل سے قطع نظر کہ پاکستان کے لئے ایران کے ساتھ اچھے تعلقات کو

استوار کرنا اور انہیں برقرار رکھنا اس کی اپنی ضرورت تھی اور طالبان کی ایران سے عداوت ان دو ممالک کے باہمی تعلقات پر منفی انداز میں اثر انداز ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسے پہلو تھے کہ جو طالبان کے ظہور کی وجہ سے پاکستان کے لئے وجہ تشویش بن گئے۔ طالبان کی بنیاد نسلی پختون عصبیت ہے۔ یہ افغانستان کے دوسرے نسلی گروہوں سے سخت مخاصمت رکھتے ہیں۔ جو اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس بدقسمت ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت طویل عرصے تک رہے گی اور پاکستان کے لئے مسلسل بنیادوں پر افغانستان میں الجھنا قطعاً" خوش آئند نہیں۔ پاکستان افغانستان میں ملوث ہونا ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں پاکستان کے لئے اس صورت میں ایک اور خطرے والی بات ہو گی کہ اگر طالبان کو افغانستان میں مکمل فتح حاصل ہو جاتی ہے تب طالبان پاکستان کی پختون عوام کو بھی اس بات پر ابھار سکتے ہیں کہ وہ پاکستان سے قطع تعلق کر کے ان کے ساتھ مل جائیں۔

افغان طالبان دینی (دیو بندی) مدرسوں کی پیداوار تھے۔ انہوں نے 1980ء کی دہائی کے دوران جنگی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ پاکستان میں بھی طالبان کی بڑی تعداد ایسے ہی دیو بندی دینی مدارس جو کہ جمیعت العلمائے اسلام کی سرپرستی میں منظم کئے گئے تھے ایک قوت بن کر منظر عام پر آئے تھے۔ جمیعت العلمائے اس وقت تک ایک غیر اہم بنیاد پرست سیاسی جماعت تھی لیکن اپنی تخلیق (طالبان) کی کامیابیوں کے طفیل جمیت العلمائے اسلام کو نئی اہمیت ملنے لگی ہے۔ جے یو آئی (جمیعت العلمائے اسلام) کو پاکستان میں سینکڑوں دینی مدرسوں پر کنٹرول حاصل ہے۔ جہاں پر نیم خواندہ طلباء کے ناپختہ ذہنوں کو متشددانہ فرقہ واریت پر مبنی نظریات کی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ کسی بھی تعمیری کام کے لئے نااہل ہونے کی وجہ سے دینی مدرسوں کے یہ نیم تعلیم یافتہ نوجوان فرقہ وارانہ مسلح تنظیموں میں شامل ہو کر پاکستان میں خوف و ہراس پھیلانے کا بڑا ذریعہ بن گئے ہیں۔ جے یو آئی کے انتظام انہی مدرسوں سے نکلے ہوئے نوجوان طالبان کے فوجی دستوں میں شامل ہوتے ہیں جہاں انہیں طاقت اور مقام دیا جاتا ہے۔ لیکن طالبان کی لیڈرشپ زیادہ تر جنگ و جدل کا وسیع تجربہ رکھنے والے سابقہ مجاہدین ہی سے مہیا ہوتی ہے اس کے علاوہ افغان کمیونسٹوں کے دھڑے "خلق" کے سابقہ ارکان بھی

طالبان کی رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ طالبان کی لیڈر شپ مجموعی طور پر درانی قبائل ہی سے آتی ہے جنہوں نے افغانستان پر پچھلی ڈیڑھ صدی سے غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔

مولانا فضل الرحمان جو کہ جے یو آئی کے رہنماء ہیں انہوں نے طالبان کو ایک مضبوط و منظم قوت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے میجر جنرل (ر) نصیر اللہ بابر جو کہ خود بھی پٹھان ہیں اور جن کا زیڈ۔ اے۔ بھٹو اور بینظیر بھٹو کے ادوار حکومت میں افغان پالیسی مرتب کرنے میں مرکزی رول تھا۔ انہوں نے طالبان جیسی مرکز گریز قوت کو یکجا کرنے میں فضل الرحمان کا ساتھ دیا۔ فضل الرحمان نے طالبان کے لئے مالی امداد مہیا کرنے کے لئے مختلف ملکوں سے رابطہ کیا اور بشمول سعودی عرب دیگر مسلمان ریاستوں سے اس قوت کی معاونت کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حکمت یار گروپ کی ناکامی کے بعد طالبان کو پاکستان کی آئی ایس آئی نے مالی اور پیشہ ورانہ امداد فراہم کرنا شروع کر دی جو کہ ان کی کامیابی کے لئے اشد ضروری تھی۔

طالبان کی کامیابیوں کے پاکستان معاشرت اور سیاست پر نظریاتی حوالے سے بڑے مضر اثرات مرتب ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ خاص کر پنجاب میں متحارب اسلحہ سے لیس مذہبی تعصب کے حامل گروہ کچھ عرصے سے دہشت گردی اور قتل و غارت کے لئے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ نواز شریف کی حکومت بے بس ہو کر رہ گئی ہے جبکہ فرقہ وارانہ تعصب سے لبریز یہ گروہ پاکستان میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ ہمیں طالبان کے ظہور کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نیم خواندہ اور ایک مخصوص نظریاتی نہج پر ڈھلے ہوئے لوگوں نیز دینی مدارس سے فارغ التحصیل افراد کے نزدیک ''ہیرو'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء پاکستانی معاشرے کے لئے تباہ کن امکانات لئے ہوئے ہیں۔ ان کے مذہبی تعصب نے نہ صرف پاکستان بلکہ اس پورے کے پورے خطے کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ طالبان کی موجودگی سے پاکستان کے ہمسایہ ممالک بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ جہاں تک صرف پاکستان کا تعلق ہے تو یہاں کے عوام جب ملک میں رائج سیاسی نظام،

ریاستی نظام کے مکمل طور پر خاتمے' کرپشن کے عفریت اور تیسرے درجے کی سیاسی لیڈرشپ سے اکتا جائیں گے تو ملک میں مذہبی تعصب کی حامل طاقت کی فتح کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کچھ ہی عرصے میں پاکستان کو افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہونا پڑا۔ جس میں پختونوں کے ساتھ شمالی علاقے کے دیگر افغان نسلی گروہوں کے بھی نمائندگی حاصل ہو۔ ایسی صورت میں طالبان کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں کا بھی سدباب کیا جا سکتا تھا لیکن پاکستانی ارباب اقتدار کی تمام تر مساعی اس وجہ سے دھری کی دھری رہ گئیں کیونکہ انہیں افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کا خیال کافی دیر سے آیا اور اس ضمن میں جو کوششیں ہوئیں ابھی تو وہ ادھوری ہیں جن میں مکمل کمٹ منٹ کا فقدان ہے۔ مزید برآں پاکستانی حکام کی مساعی طالبان کی مسلسل فتوحات اور بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے نتیجہ خیز ہونے کا رہتا سہتا امکان بھی ختم ہو گیا ہے بلکہ پاکستان کے لئے خود بھی ان کے نظریاتی اثر سے دامن بچانا مشکل ہو گیا ہے جس سے کہ متشددانہ مذہبی جارحیت جنم لیتی ہے۔ آجکل حکومت پاکستان کی پالیسیوں کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو وہ کسی حد تک طالبان کے نظریات میں رنگی ہوئی دکھائی دیں گی اور ایسا اس لئے ہے کہ طالبان کی طرف سے پاکستانی حکومت کو مذہبی جنونیت سے لاحق خطرے کو بے اثر کرنے کے لئے اسے خود مذہب کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ اس طرح حکومتی سطح پر اس حوالے سے مکمل نااہلی کا ثبوت دیا جا رہا ہے اور اس کے لئے اس بات کا ادراک ممکن ہی نہیں رہا کہ کیا چیز ملکی مفاد میں ہے اور کیا نہیں۔ طالبان کے نسلی عصبیت پر مبنی دوسرے پختون گروہوں سے تعلقات اور پاکستان میں جے یو آئی سے ان کے روابط نے پاکستان کے حال و مستقبل کو افغانستان کی تقدیر کے ساتھ جیسے باندھ سا دیا ہے۔

امریکہ کی افغانستان میں دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ اس کے لئے وسطی ایشیا میں تیل اور گیس کی پائپ لائنیں اس ملک ہی سے گذار کر لانا ممکن تھا۔ توانائی حاصل کرنے کے ان ذرائع کو بلوچستان سے متصل ساحل سمندر اور یا پھر ہندوستان تک لے جانے کا کوئی متبادل انتظام اس کے علاوہ نہ ہو سکتا تھا چنانچہ امریکہ کو ہر صورت میں افغانستان

ہی کا انتخاب کرنا پڑا کہ جہاں سے پائپ لائن کو گذارا جائے کیونکہ اگر امریکہ کے لئے کوئی متبادل راستہ تھا بھی تو وہ ایران کا راستہ تھا جس سے امریکی تعلقات کی نوعیت کو مذکورہ بالا سطور میں قلمبند کیا جا چکا ہے۔ خاص طور پر یونوکل (Unocol) جو کہ امریکی کمپنی ہے افغانستان میں پائپ لائن کے بچھائے جانے کے عمل سے اس کے مفادات وابستہ تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان پر امریکی دباؤ تھا کہ وہ افغانستان میں اس کے مفادات کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہے۔ لیکن طالبان کے غیر یقینی اور سخت گیر مذہبیت سے مشکل کردار و عمل کی وجہ سے نیز ان کے وسط ایشیائی ممالک سے بگڑتے ہوئے تعلقات کے باعث امریکہ اور یونوکل نے یہی مناسب خیال کیا کہ افغانستان میں پائپ لائن کے بچھائے جانے کے منصوبے کو ترک کر دیا جائے۔ افغانستان پر کروز میزائل کے پھینکے جانے سے اس منصوبے کے قابل عمل ہونے کے تمام امکانات معدوم ہو گئے ہیں۔ اس وقت جبکہ یہ سطور رقم کی جا رہی ہیں طالبان کی قائم حکومت کے غیر منطقی طرز عمل اور پاکستانی حکومت کے طالبان کی جانب سے پاکستان کو لاحق خطرے کے سامنے بے بس اور مجبور نظر آنے سے مستقبل اور زیادہ غیر یقینی نظر آنے لگا ہے۔

اس تمام تر غیر یقینی کیفیت کے باوجود خلیج فارس سے قرب میں واقع ہونے کی وجہ سے علاوہ ازیں اس علاقے میں بوقت ضرورت اشیاء کی سپلائی کے لئے اڈوں (Bases) کی فراہمی کے حوالے سے بھی امریکہ کے لئے پاکستان غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ایران کے مشرق میں ایک اہم ملک کے طور پر پاکستان امریکہ کی فوجی حکمت عملی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ اس میں شک نہیں اس کا پاکستان سے برتاؤ وقتاً" فوقتاً" خاصا خراب رہا ہے۔ خاص طور پر جب 1950ء کے دوران اپنائی جانے والی حکمت عملی ناکام رہی تو پاکستان امریکہ کی ترجیحات کی فہرست پر بہت نیچے چلا گیا اور امریکہ نے خلیج فارس کے علاقے میں اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی بابت اپنی پالیسی کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ 1960ء کی دہائی میں امریکہ نے اس علاقے میں اپنی افواج کو تعینات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے باوجود ایران میں امریکی آلہ کار "شاہ ایران" کا تختہ الٹ دیا گیا اور امریکہ کی طرف سے متعین کردہ فوجی دستے اسے تحفظ فراہم کرنے

اور اس کا اقتدار بچانے میں ناکام رہے اس تمام تر ناکامی کے باوجود امریکہ نے اپنے سیونتھ فلیت (Seventh Fleet) یعنی ساتویں بحری بیڑے پر انحصار کرتے ہوئے اسے بحر ہند میں متعین کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ سنگاپور سے سویز تک کے علاقے میں بوقت ضرورت وہ فوجی مداخلت کر سکے۔ امریکہ کے بحری آپریشنوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک بحری مستقر کی مستقل بنیادوں پر ضرورت تھی چنانچہ موریشیس سے "ڈیگو گارشیا" کا جزیرہ برطانیہ میں ولسن کی حکومت کے تعاون سے ہتھیا لیا گیا اور اس پر امریکہ نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ جو تھوڑے بہت لوگ وہاں سکونت پذیر تھے انہیں موریشیس بھیج دیا گیا۔ اس طرح ڈیگو گارشیا امریکی بحریہ کی بحر ہند اور خلیج فارس میں کاروائیوں کے لئے اشیائے ضروریہ و اسلحہ کی سپلائی کا اہم ترین مرکز بن گیا۔

خلیج فارس اور اس سے متصل خطے میں واقع ممالک کی کمزور حکومتوں کو فوری طور پر فوجی امداد بہم پہنچانے کے لئے ڈیگور گارشیا زیادہ مناسب مقام نہ تھا کیونکہ یہ خلیج فارس سے ذرا زیادہ فاصلے پر واقع تھا۔ اس لئے مارچ 1980ء سے امریکی فوجی حکمت عملی میں ریپڈ ڈیپلائی منٹ فورس (Rapid Deployment Force) کے عنصر کا اضافہ کرنے کے تصور نے جگہ بنانی شروع کی۔ آر۔ ڈی۔ ایف کو موثر بنانے کے لئے اسے اشیائے ضروریہ اور اسلحہ کی سپلائی کے لئے کسی مرکز کی موجودگی بہت ضروری تھی جس کے لئے ڈیگو گارشیا اپنی دوری کی وجہ سے کار آمد نہ ہو سکتی تھی۔ اس مقصد کے لئے پاکستان میں اڈے اور دیگر سہولتیں خاص طور پر مکران کا ساحل بہت موزوں تھا۔ اگرچہ عراق سے 92-1991ء میں جنگ کے بعد سے امریکہ کو کویت اور سعودی عرب کے علاوہ دوسرے علاقوں میں اڈے اور دوسری فوجی نوعیت کے تمام سہولتیں میسر آ گئی ہیں جس کی وجہ سے بلوچستان میں واقع مکران کے ساحل سمندر کی اہمیت اس قدر نہ رہی جتنی کہ 1980ء کی دہائی کے دوران تھی لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خلیج میں ہونے والی جنگ کے بعد بلوچستان کی اہمیت امریکہ کے نزدیک بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی ہے یہ خطہ ابھی بھی فوجی نقطہ نظر کے حوالے سے امریکی توجہ کا مرکز بننے کے اہل ہے کیونکہ پاکستان کا خلیج فارس کے قرب میں واقع ہونا ایسی حقیقت ہے جس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر امریکہ اسے بالکل نظرانداز نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں حکومتی سطح پر بلوچستان میں مکران کے ساحل پر امریکی اڈوں کی موجودگی سے کئی مرتبہ سختی سے انکار کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کے لئے یہ اچنبھے کا باعث تھا۔ مکران کے ساحل پر گوادر کے نزدیک ایرانی سرحد کے 50 میل کے فاصلے پر اس قدر حساس اور اعلیٰ نوعیت کی فوجی installations قائم ہیں۔ بلوچ قوم پرست عناصر کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس مقام کے نزدیک خشکی یا بحری راستے کے ذریعے سے آنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں اعلیٰ نوعیت کی فوجی installations کے قیام کی پاکستان کے دفاع کے حوالے سے بہت ہی معمولی اہمیت ہو سکتی ہے کیونکہ جن سرحدوں پر پاکستان پر حملے کا امکان ہو سکتا ہے وہ ساحل مکران سے بہت دور واقع ہیں۔ گوادر کے نزدیک ان ٹاپ ملٹری انسٹالیشن (Top Military Installation) کے مقصد اور نوعیت کے بارے میں قطعی طور پر ابھی تک محض اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ البتہ ایک بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ ملٹری انسٹالیشن (Military Installation) امریکہ کے لئے انتہائی مفید اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ گوادر اور اس کی نزدیکی بندرگاہوں کا امریکہ کے لئے ایک مصرف یہ بھی ہے کہ وسطی ایشیا سے گیس اور معدنی تیل کے ذخائر کو پائپ لائنوں کے ذریعے یہاں لا کر دوسری جگہوں کو منتقل کئے جا سکیں۔

امریکہ کی خلیج فارس کے خطے کے حوالے سے مرتب کردہ علاقائی حکمت عملی میں پاکستان کو اگرچہ بالکل ہی نظرانداز تو نہ کیا گیا لیکن امریکہ کی نظر التفات کا رخ اسی وقت ہوتا ہے جب اسے پاکستان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے گویا یہ تعلق خاطر مطلقاً یک طرفہ ہے۔ "امریکہ کے خلیج جیسے مسلم علاقے سے وابستہ مفادات کے پس منظر میں پاکستان آپشن خاصا منطقی محسوس ہوتا ہے..... اس سے امریکہ کے ترکی سے تعلقات کی بھی تکمیل ہوتی ہے کیونکہ ترکی اور پاکستان دونوں کے ایران کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں (Kuniholm, 1987:335)_ علاوہ ازیں اس سلسلے کا نمایاں ترین پہلو خلیج فارس سے پاکستان کا جغرافیائی قرب ہے۔ چنانچہ خلیج فارس اور بحرہند سے ملحقہ علاقے سے متعلق امریکی فوجی حکمت کا کام CENT COM کو سونپا گیا اس حوالے سے لف شلز (Luf Shulz) جو کہ اس موضوع پر بہت باعلم اور مستند تبصرہ نگار گردانا جاتا ہے

CENTCOM کے تحت کئے جانے والے انتظامات کے بارے میں بہت ہی مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ (Luf Shulz, 1986) CENTCOM کے تحت پاکستان کو سونپے جانے والے نئے کردار کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ پاکستان امریکی فوجی امداد حاصل کرنے والا تیسرا بڑا ملک تھا۔ یاد رہے کہ لف شلز اس وقت کی بات کر رہا ہے جب پاکستان پر ضیاء کی حکومت تھی اور افغانستان میں سوویت یونین کی موجودگی کے خلاف افغانوں کی گوریلا جنگ اپنے زوروں پر تھی ان حالات کے پیش نظرپاکستان کو جو کہ افغان گوریلوں کی مکمل طور پر پشت پناہی کر رہا تھا بہت ہی بڑے پیمانے پر امریکی فوجی امداد مہیا کی جانے لگی تھی۔ لف شلز 1985ء کے دوران کانگرس میں ہونے اولی ایک کاروائی کے دوران ریکارڈ کی جانے والی ایک امریکی مندوب کی شہادت کا حوالہ رقم کرتا ہے جو کہ کچھ یوں ہے "جنرل کنگسٹن اور سنٹرل کمانڈ کو امید ہے کہ پاکستان ایسے سمجھوتوں میں فریق بن جائے گا جن کے برصغیر پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے کیونکہ پاکستان CENTCOM کے تحت مرتب کی جانے والی دفاعی حکمت عملی میں شریک ہے ..... P-3 ASW طیارے کبھی کبھار پاکستانی ہوائی اڈوں کو استعمال میں لاتے ہیں لیکن ایسی سہولت کی فراہمی زیادہ کثرت سے ہونی چاہئے۔ (Ibid., : 73)

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں وقتاً فوقتاً نشیب و فراز آتے رہے ہیں۔ کسی مخصوص وقت میں ان دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کیسے ہوں گے اس کا زیادہ تر انحصار امریکی مفادات کے تقاضوں پر ہوگا۔ عراق کے خلاف خلیج کی جنگ کے بعد سے جب امریکہ کو کویت اور دوسرے خلیج سے متصل علاقوں میں فوجی سہولتیں حاصل ہو گئیں تو اس کا امکان تھا کہ امریکہ کی مشرق وسطی سے متعلق فوجی حکمت عملی میں پاکستان کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے گا لیکن امریکہ نے پاکستان کے آپشن (Option) کو نظر انداز ہرگز نہ کیا اگرچہ جیسا کہ مختلف تجربات اس بات کے شاہد ہیں کہ امریکہ پاکستانی مفادات کو کسی بھی طرح خاطر میں لانے پر تیار نہیں۔ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ یک طرفہ معاملہ رہا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات میں نئے اتحاد وجود میں آ رہے ہیں اور پاکستان تیزی سے اپنے دیرینہ ہمنواؤں کو کھوتا جا رہا ہے۔ اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ امریکہ نے

پاکستان جیسے پرانے اتحادی کا 1960ء کی دہائی کے دوران ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جس کے بعد سے اسے متبادل ساتھی یعنی چین پر پوری طرح انحصار کرنا پڑا۔ لیکن حال ہی میں نہ صرف چین اور امریکہ کے تعلقات میں بہتری دیکھنے میں آئی ہے بلکہ ہندوستان اور چین کے تعلقات میں پہلے پائی جانے والی سرد مہری اب دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ حالانکہ بھارتی وزیر دفاع خارجہ فرنینڈس نے اس کے ملک کی طرف سے کئے جانے والے ایٹمی دھماکوں کی وجہ "چین سے ممکنہ خطرے" کو قرار دیا تھا۔ گو کہ چین نے جارج فرنینڈس کے بیان پر کسی بھی واضح ردعمل کا اظہار نہ کیا تھا البتہ بھارتی حکومت کو فوری طور پر اپنے وزیر دفاع کے متذکرہ بیان کی تردید کرنا پڑی جو کہ ان کی نئے سرے سے مرتب شدہ خارجہ پالیسی سے ہرگز مطابقت نہ رکھتا تھا۔ چین اور بھارت کے حوالے سے ایک بات تو حتمی اور واضح ہے کہ چین کے لئے پاکستان کی بجائے ہندوستان سے بہتر تعلقات اقتصادی' سیاسی اور سماجی لحاظ سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد جذبات پر نہیں رکھی جاتی۔ گو کہ پاکستان کے لئے چین کے حکومتی ایوانوں میں ابھی بھی نیک خواہشات پائی جاتی ہیں چنانچہ حکومت پاکستان کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ چین میں ان نیک خواہشات سے جتنا بھی فائدہ حاصل کر سکتی ہے کر لے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ چین اور پاکستان کے تعلقات کی وہ نوعیت اب نہیں رہی جو کہ ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ پاکستان بین الاقوامی دنیا میں جس قدر تنہائی کا اب شکار ہو گیا ہے پہلے کبھی نہ تھا۔

پاکستان کو اب دنیا کو نئی طرح سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس بات پر پوری طرح سے دھیان دینا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس کے اپنے مفادات کس طرح بہتر طریق سے تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ یہ تو واضح ہے کہ امریکہ اور ہمارے مفادات ضروری نہیں کہ ایک دوسرے سے یکسانیت رکھتے ہوں۔ امریکہ "پاکستان آپشن" کو تبھی استعمال میں لاتا ہے جب ایسا کرنا اس کے لئے فائدہ مند ہو۔ اس طرح یہ مطلقاً یک طرفہ معاملہ ہے اس کے سواء کچھ نہیں۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکہ اکثر اوقات پاکستان' اس کے نمائندوں اور وزرائے اعظم کے ساتھ تضحیک آمیز سلوک روا رکھتا ہے۔ اس امر کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ ہم بحیثیت قوم اپنا سر فخر

سے اس وقت تک بلند نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی آزادانہ خارجہ پالیسی اپنا سکتے ہیں جب تک اپنی قوت ارادی اور حوصلے کو کام میں لا کر ان گھمبیر اقتصادی اور زرعی مسائل کو حل کر لینے میں کامیاب نہیں ہو جاتے جو ہمیں اس وقت درپیش ہیں۔ ایسا کر کے ہی ہم امریکہ کے چنگل سے نکل سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اپنے گھر کو سدھارنا ہو گا۔ جس کے لئے ہمیں نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ زرعی پالیسی میں بھی بنیادی تبدیلی اشد ضروری ہے خصوصاً زرعی ٹیکس کو بھی لازمی طور پر لاگو کیا جائے اور حکومتی اخراجات پر بھی نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ان امور پر کہ جن پر اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں لیکن وہ منافع بخش نہیں یا عوام کے لئے ان کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں مثلاً موٹر وے اور اس جیسے دیگر منصوبے وغیرہ ختم کر دیئے جائیں تو حالات کچھ بہتر ہو سکتے ہیں اسی طرح کرپشن کو ہر سطح سے ختم کرنے کی سعی بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن پاکستان میں چونکہ جاگیردار طبقے کو سیاسی غلبہ حاصل ہے اس لئے اس کا امکان بہت کم ہے کہ یہ تمام اقدامات بروقت اور نیک نیتی سے اٹھائے جا سکیں۔ چنانچہ ترقی کی منازل طے کرنے کے لئے ہمیں صحیح معنوں میں زرعی اصلاحات کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے لیکن پھر وہی خدشہ ہے کہ موجودہ حکمران طبقے کی موجودگی میں حالات میں بہتری لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

REFERENCES CITED

Barnds, W. J. — India, Pakistan and the Great Powers, Council on Foreign Relations & Pall Mall Press, London, 1972

Barnet, Richard — Intervention and Revolution. World Publishing Co., New York, 1969

Birdwood, Lord — A Continent Decides, Robert Hale, London, 1953

Campbell, Jhon c.	Defense of the Middle East. Council on Foreign Relations, New York, revised edition, 1960
Caroe, Olaf	Wells of Power. Macmillan, London, 195
Galbraith, J. K.	Ambassador's Journal, London, 1969
Jordan, Col. A. A.	Foreign Aid and the Defense of South East Asia 1962.
Khan, Maj. Gen. Fazal Muqeem	The Story of the Pakistan Army. OUP, Karachi 1963
Kuniholm, Bruce R	'A Political/Military Strategy for the Persian Gulf and South West Asia' in Samuel F. Wells and Mark A Bruzonsky (eds) Security in the Middle East. Westview Press, Boulder, 1987
Lifschultz, Lawrence	From U2 To P3: The US Pakinstan Relationship New Left Review, No. 159, Sept-Oct, 1986
Maley, Wiliam (ed)	Fundamentalism Reborn: Afghanistan and Taliban, Vanguard, Lahore, 1998
Maxwell, Neville	India's China War, London 1970
Ramazani, R. K.	Iran's Foreign Policy: 1941-73, University of Virginia Press, Charlottesville, 1975
Tully, Andrew	CIA: The Inside Story, William Morrow, New York, 1962
Venkataramani, M.S.	The American Role in Pakistan: 1947-59, Vanguard Books, Lahore, 1984

فرقہ وارانہ تشدد اور تشخص کی تبدیلی

ہربنس مکھیا/رشید ملک

پدری نظام کی طرح تشدد بھی "کامیابی" کے سرمایہ دارانہ تصور سے ماخوذ ہے۔ ملکوں کی فتوحات پر مستزاد ہر طرح کا سیاسی تشدد تشخص کی اس قسم کی تبدیلی کی توثیق کرتا ہے۔

سائمونا شورانی (Simona Shorani) (1) کی حالیہ کتاب کا عنوان ہے: "فوجی جارحیت اور جنسی امتیاز کی سیاست: اسرائیلی اور فلسطینی فوجی تصادم۔" ان کی دلیل ہے کہ "جہاں ہر شخص فوجی سپاہی ہو وہاں ہر عورت ایک مفتوحہ علاقہ تصور کی جاتی ہے۔" اگر سائمون کو ایک زنانہ جسم کی علامتی تقلیب میں دیکھنے والی پہلی مصنف نہ بھی تسلیم کریں تو بھی ان کے استدلال میں ایک پرجوش جذبہ نظر آتا ہے۔ اس سے پیشتر بیٹی ریئرڈن (Betty Reardon) نے ایک طرف فوجی جارحیت' جنسی امتیاز اور پدری نظام اور دوسری طرف امن اور نسوانیت میں بڑی صاف ستھری مساوات قائم کی تھی۔ (2) اصل میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایڈگر ڈیگاس (Edgar Degas) نے اپنی ایک تصویر میں جس کا عنوان ہے (1865) Seene de guerre au moyed age- (3)

زمانہ وسطی میں جنگ اور ملکی فتوحات کو اسی جنسی استعارے میں پیش کیا تھا۔ اس تصویر میں جنگ میں شکست خوردہ مفتوحہ' اور ذلیل و خوار ہونے والی عورتوں کے ساتھ چند مردہ عورتوں پر بھی گھڑسوار سپاہی تیر اندازی کرتے دکھائے گئے ہیں۔ خواتین پر غلبہ اور ان کی ذلت ان کے برہنہ جسموں میں منعکس کی گئی ہے۔ چند خواتین اپنے ستر کو چھپانے کی ناکام کوششوں سے اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بچاتی نظر آتی ہیں۔ اس امر کی تائید کی ڈیگاس کی یہ تصویر ذاتی یا نجی ہونے کی بجائے ایک سماجی استعارہ ہے'

ایمپریشنسٹ سکول کے اس کے ساتھی شاوانیس (Chavannes) (4) کی تصویر سے ہوتی ہے جس کا عنوان ہے La Guerre (1868) گو اس کا سیاق و سباق قرون وسطی نہیں بلکہ ہمعصر دور ہے۔ اس تصویر میں بھی جنگ کو فتح مند مردوں اور مغلوب اور برہنہ عورتوں کے پیکروں میں منعکس کیا گیا ہے۔

اس مقالے میں یہ دلیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تشخص کی تقلیب بڑی لچکدار ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جوع الارض کے لئے جنگ کے علاوہ ہر قسم کا سیاسی تشدد اسی یا کسی اور قسم کے تشدد کی توثیق کرتا ہے۔ یہ مقالہ مزید یہ نقطہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ پدرانہ نظام کی طرح تشدد بھی سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے "کامیابی" کے تصور سے ماخوذ ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ کامیابی کا تصور صرف سرمایہ دارانہ نظام سے ہی مخصوص نہیں۔ سرمایہ داری سے قبل کے معاشروں میں جوع الارض کے لئے جنگ میں کامیابی کا تصور اتنا ہی متحرک تھا جتنا کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں اقتصادی پیداوار کا تصور۔ لیکن پیداوار کے پیمانے کی وسعت نے اس کی نوع کو ہی تبدیل کر دیا ہے۔ زمانہ وسطی کے معاشرے کامیابی کے تصور کو اپنے حکمرانوں اور جنگجوؤں کی سطح تک محدود رکھتے تھے لیکن سرمایہ داری نظام نے ایکسچینج اور پیداوار کی صلاحیتوں میں بڑھتی ہوئی ترقی کے ذریعے تواتر سے بڑھتے ہوئے منافع یا اشیاء کی عمومی پیداوار نے اس آئیڈیالوجی کے میدان عمل کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ معاشرے میں اس کے اثرات سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔ مسابقت کی قاتلانہ روح کے ذریعے کامیابی کا حصول جو گرامچین (Gramscien) تصور میں عقل عامہ کی شکل اختیار کر چکا ہے' تشدد کے لئے ایک اہم ترین نقطہ آغاز ہے۔ اس کے اظہار کی کئی صورتیں ہیں جو پدری نظام کو نہ صرف منعکس کرتی ہیں بلکہ اسے مستحکم بھی کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم اس طرف رجوع کریں گے۔

میں اس تشدد سے آغاز کروں گا جسے ہندوستان کے سیاق و سباق میں فرقہ وارانہ فسادات کہتے ہیں۔ اس سے میری مراد وہ قاتلانہ تشدد ہے جس کا ارتکاب کسی دوسری ریاست سے محاذ آرائی کے بغیر ایک ہی ریاست میں ایک مذہب کے پیروکار دوسرے

مذہب کے ماننے والوں پر بڑے وسیع پیمانے پر فسادات کی صورت میں کرتے ہیں۔

اپنے فرقے کے لوگوں کو تشدد پر آمادہ کرنے کا آزمودہ طریقہ کار ان میں ہینڈ بل کی تقسیم ہے جو فسادات سے پہلے اور فسادات کے دوران اشتعال انگیز عبارت پر مشتمل ہوتے ہے۔ 1969ء میں احمد آباد میں ہونے والے فسادات کے سلسلے کے دوران ہندوؤں کو بھڑکایا گیا کہ "ان لوگوں کو نیست و نابود کر دو جنھوں نے تمہاری ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں لوٹیں تھیں۔ انہیں یہ سمجھا دو کہ مسلمان ہندوستان میں نہیں رہ سکتے کیونکہ انہوں نے ہندو دھرم کی توہین کی تھی اور ہماری ماؤں اور بہنوں پر دست درازی کی تھی۔"

ہینڈ بل کے ایک واحد فقرے میں نسوانی جسم، عصمت، مذہب، تاریخ اور علاقے میں تطابق پیدا کر کے اور پھر انہیں باہم مدغم کر کے دو تصور پیش کئے گئے ہیں: پہلا نسوانیت جو غیر محفوظ ہے اور دوسرا مسلم کمیونٹی جو لنگم کی علامت ہے۔ ان میں سے کسی ایک جرم کے لئے پوری مسلم کمیونٹی کو سزا کا مستوجب ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن دونوں کے بیک وقت ثابت ہونے پر ان کے بچ نکلنے کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے اور انہیں سانس لینے کے لئے بھی کوئی جگہ نصیب نہیں ہو سکتی۔ تاہم مردانگی پر تشدد کی دو چند تاکید ہے: بے حرمتی کے مرتکب مسلمان کا تصور اور بدلہ لینے والے ہندو کا تصور۔ نسوانیت کو مذہب، عزت یا علاقے سے تشبیہ دی گئی ہے جسے مرد یا تو پامال کرتا ہے یا پھر اس کی حفاظت کرتا ہے۔

سادھویاں

یہ جنسی استعارہ صرف مردوں ہی کا تشکیل کردہ نہیں۔ چند سال پہلے ہندوستان میں بے لگام انبوہ کو برانگیختہ کرنے والی سب سے زیادہ زہریلی تقریریں ایک نوجوان خاتون سادھوی رتھمبرا نے کی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے نام کے دو حصے ہیں۔ سادھوی کے معنی تارک الدنیا یعنی زاہدہ ہے اور رتھمبرا اس کا اپنا نام ہے۔ ہندو اساطیر میں رتھمبرا ایک اپسرا ہے جو اپنے حسن و شباب سے ان رشیوں کی تپسیا کو بھنگ کرتی ہے جو دیوتاؤں کے قائم کردہ نظام کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ ایک دفع

بھنگ ہو جانے پر تپسیا کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور ان رشیوں میں شہوانی جذبہ ابھر آتا ہے۔ سادھوی کی تقریریں ہزاروں کا مجمع سنتا ہے اور اس پر مستزاد' بازار میں بکنے والی کیسٹوں کے ذریعے مزید کئی ہزار سنتے ہیں۔ ان کی تقریروں میں نامردی ایک غالب عنصر ہے جس کے ذریعے وہ ان لوگوں کی مردانگی کو چیلنج کرتی ہیں جو فسادات میں مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتے اور انہیں قتل نہیں کرتے۔ باقاعدہ ریہرسلوں کے بعد بلند سے بلند تر ہوتی ہوئی آواز میں تارک الدنیا ہونے کی بنا پر ایک غیر شادی شدہ خاتون کی طرف سے برسرعام ایسا چیلنج آیا ہو تو یہ اشتعال کی دوہری طاقت رکھتا ہے کسی مرد کو برانگیختہ کرنے کے لئے نامردی کے طعنے سے زیادہ اور کوئی بات اتنی اشتعال انگیز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ قابل فہم ہے کہ ابتدا میں "بہنوں اور بھائیوں" (1) کو خوش آمدید کہنے کے بعد اس سادھوی کی تقریر میں بہنوں کی طرف شاذ ہی کوئی اشارہ ہوتا ہے۔ (2)

تشدد کے لئے سادھوی کی اشتعال انگیز کرختگی دو شناختوں کی تقلیب کرتی ہے: اول' ایسے شخص کو جس کا دنیا سے' بالخصوص سیاسی معاملات سے دور کا تعلق بھی نہ ہو' اسے ایک سیاسی کارکن میں تبدیل کرنا جو انتخابات کے ذریعے دائیں بازو کی ایک فرقہ پرست سیاسی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کو اقتدار میں لانے کے لئے کوشاں ہو اور دوم' متحمل مزاج ہندوؤں کو ایک جارح کمیونٹی میں بدلنا جو سیاست اور تاریخ کے پیدا کردہ ناانصافیوں کا بدلہ چکانا چاہتی ہو۔ (یہ جارحیت ماضی اور حال کی مسلم شخصیت بی جے پی کے اوراک کو منعکس کرتی ہے) تاہم ان دونوں شناختوں کی اگر تقلیب ہو رہی ہے تو پدری نظام ان دونوں پر سایہ فگن ہے۔

عصمت کا تحفظ' تاریخ سے انتقام' مذہب کا دفاع اور جنسی تشدد کے خلاف عورتوں کی حفاظت---- یہ سب مردوں ہی کا دائرہ کار ہے۔ کوئی خاتون زیادہ سے زیادہ مردوں کی تھوڑی بہت مدد کر سکتی ہے یا سادھوی کی طرح ان کو برانگیختہ کر سکتی ہے۔ لیکن اصل کام تو بھائیوں نے ہی کرنے ہوتے ہیں۔ (5) چنانچہ ہندوتوا (ہندوؤں کو متحرک کرنے کا منصوبہ) ان کے انتخابات جیتنے اور صوبوں اور مرکز میں حکومتیں قائم کرنے کے فوری مقاصد سے اور آگے چلا جاتا ہے جو بذات خود بڑے اہم ہیں۔ تیزی

سے حرکت کرتے ہوئے معاشرے کے دوران پدری نظام کی کشمکش میں یہ اس نظام کو بہت تقویت دیتا ہے۔ یہ ایران جیسا بنیاد پرست اسلامی ماڈل ہے جس میں خواتین کو مردوں کے طابع کرنا ایک اہم جزو ترکیبی ہے۔ یہ امر کہ خود خواتین مردانہ اتھارٹی کی حمایت کرتی ہیں' مردوں کی تحکم پسندی کو کسی طرح بھی کم نہیں کرتا۔ (6)

سادھوی رتھمبرا یقیناً واحد تارک الدنیا نہیں اور نہ ہی وہ واحد تارک الدنیا خاتون ہیں جسے سیاسی اکھاڑے میں دھکیل دیا گیا ہو۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو مردوں کے مقابلے میں اس قسم کی خواتین کی تعداد قابل رحم حالت تک کم ہے۔ سادھوں کو متحرک کرنا بذات خود دو شناختوں کی تقلیب اور ان کا باہمی انضمام ہے۔ ان دونوں شناختوں کا مخرج مذہب ہی ہے۔

ہندو مذہب میں اور اسلام میں بھی اگر تارک الدنیا لوگ یعنی سادھو سنت مذہب کے ایک سرے پر کھڑے ہیں تو پنڈت اور ملا دوسرے سرے پر۔ تارک الدنیا لوگ تمام دنیاوی خواہشات اور مال و منال کو تج کر اور اس پر مستزاد ریاست اور اس کے اداروں سے الگ تھلگ رہ کر اپنی اخلاقی قوت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے عین برعکس پنڈت اور ملا اپنے آپ کو حکمران اور سیاسی اداروں سے اس شدت سے وابستہ کرتے ہیں کہ متشکک اور منحرف لوگوں کے خلاف ان میں شدید جارحیت در آتی ہے۔

سادھو

گزشتہ پانچ چھ برسوں میں سادھوں کو اس تحریک کا ہراول دستہ بنا دیا گیا ہے جس نے 2 دسمبر 1992ء کے منحوس دن ایودھیا میں بابری مسجد کو منہدم کیا تھا۔ اس طرح ایک طرف تو سادھوؤں کے تشخص کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ ریاست کی انتظامیہ' مقننہ اور اس پر مستزاد عدلیہ کو دعوت مبارزت دیں اور دوسری طرف سادھوؤں کو ایسا جارح مذہب پرست بنا دیا گیا تھا جو حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے بڑا بیتاب ہو۔ جب رام جنم بھومی (ایودھیا جہاں رام ایک ملین سے دو ہزار برسوں کے دوران کبھی پیدا ہوئے ہوں گے) کی تحریک کے دوران سادھوؤں نے بار بار اعلان کیا کہ وہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے پابند نہیں ہوں گے جہاں یہ مقدمہ زیر سماعت تھا۔ اس اعلان سے وہ

دراصل ریاست کی حاکیت سے تارک الدنیا لوگوں کے روایتی استثنا کے طالب تھے۔ مگر جب یہ سادھو پارلیمانی انتخابات میں شریک ہوئے اور کئی نشستیں حاصل کر لیں تو پنڈتوں اور ملاؤں کی طرح وہ بھی ریاست سے خوب خوب مفادات حاصل کرنے میں پیش پیش تھے۔ اگر مسجد کے انہدام کا ڈھیٹ مقصد سامنے نہ ہوتا تو پارلیمانی جمہوریت کے پیدا کردہ وسائل اور ریاست کے تاریخی طور پر منظور شدہ دائرہ کار کی حدود کے ملاپ میں یہ عیاری واقعی قابل ستائش تھی۔

جنسی موضوع کی طرف لوٹنے پر یہ بہت اہم معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تقریباً چھ سو برس کی حکمرانی کے دوران فارسی میں لکھے گئے بے شمار درباری وقائع میں جنسی تشدد کا تصور نظر نہیں آتا۔ ان فاتحوں نے ہندوستان کے مفتوحہ علاقے کو ایک ایسی اجنبی مفتوح عورت کے پیکر میں نہیں دیکھا جسے شہوت کا نشانہ بنایا جا سکتا ہو۔ فتوحات میں دھیما سا رنگ مفتوحہ عورتوں کو کبھی کبھار فاتح لوگوں میں جن میں اکثر عام سپاہی شامل ہوتے تھے' تقسیم کر دینے میں نظر آتا ہے۔ اور تیرہویں صدی کے آخری برسوں میں ایک موقعے پر ان عورتوں کو خاک روبوں میں بھی تقسیم کیا گیا۔ (7) لیکن ایسے موقعوں پر جنگ کسی غیر علاقے کے لئے نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ حکمران سے وفاداری یا اس سے بغاوت یا اطاعت گزاری اور غیر اطاعت گزاری کی بنا پر ہوتی تھی اور لڑنے والے دونوں طرف اکثر مسلمان ہی ہوتے تھے۔ حقیقت میں ایک مغل حکمران شہنشاہ اکبر (1605-1576) نے مقامی حاکموں کی بیٹیوں سے شادیاں کیں لیکن اس نے بڑے غور و فکر کے بعد اپنی حکمرانی کو دینیاتی اسلام سے کافی دور کر لیا تھا۔ اس کے لئے یہ شادیاں مقامی صاحب اقتدار عناصر تک رسائی اور انہیں شہنشاہی اقتدار میں شامل کرنے کا ایک ذریعہ تھیں۔ بالجبر مجامعت فتح اور ذلت کی حامل ہے لیکن اس کے مقابلے میں شادی ایک پروقار روایت ہے۔

ہندوستان کی قرون وسطیٰ کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مخاصمت کا اظہار اگر عالمگیر نہیں تو غیر معمولی بھی نہیں تھا اور نہ ہی ریاست کا اسلامی تشخص خصوصاً بحرانوں کے دوران غیر نمایاں تھا۔ اس مقصد کے لئے کئے گئے اقدامات میں چند مسلمان فاتحوں کے ہاتھوں خاصی تعداد میں مندروں کا انہدام بھی شامل تھا۔ کم از کم دو

موقعوں پر اورنگ زیب (1705-1650) کے حکم پر متھرا اور وارانسی میں دو مندر گرائے گئے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ تاہم فتح کے اوعا نے شہوانی ایمجری کو بھی متحرک نہیں کیا۔ ہندوستان میں شہوانی ایمجری کا ادراک قرون وسطی کے بعد کی پیداوار ہے۔

تاہم وسطی دور میں "ہم" اور "تم" کی تفریق ایسے ہی موجود تھی جیسے یہ آج کل ہے۔ یہ تفریق صرف مذہب کے ساتھ ساتھ نہیں چلتی تھی بلکہ اس کی توسیع پوری کمیونٹی میں بھی ہو جاتی تھی اور اس عمل میں کئی سطحوں پر معیاری رشتوں کی نوعیت بھی بدل جاتی تھی۔

1979ء میں جمشید پور میں جب ایک ہندو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنے ماتحت عملے کو فسادیوں سے سختی سے نبٹنے کا حکم دیا تو ایک ہینڈ بل میں اسے ہندو دشمنی کے طعنے دیئے گئے اور ہینڈ بل لکھنے والوں نے ماتحت عملے کو ثابت قدم ہندو کہہ کر ان کی ہمدردی اور اعانت حاصل کرنا چاہی۔ اس طرح اس مقام پر دو قسم کی کئی تفریقیں پیدا کی جا رہی تھی۔ پولیس کو ایک فعال فورس میں متحد رکھنے والے ڈسپلن اور اطاعت کے معیاری اصول کے برعکس ماتحت عملے کو اپنے سربراہ کے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا' افسر اور ماتحت کے فرق کو بھی اپنے حق میں ابھرا جا رہا تھا اور ہینڈل بل لکھنے والے پولیس کے نظام مراتب یعنی اعلیٰ حکام کے مقابلے میں ماتحت سپاہ کے حامیوں کے طور پر ابھرے' ہندوؤں کے پولیس میں شمولیت کے باوجود قانون نافذ کرنے والے کارندوں کے تشخص کی بجائے مسلمان شہریوں کے خلاف ان کے ہندو تشخص کو نمایاں کیا جا رہا تھا۔ اس عمل میں ہندوؤں کے تشخص کو ایک اکائی کی صورت دی جا رہی تھی یعنی ایک جارح لنگم کا تصور۔

ایک فرقے کے لوگوں کا دوسرے فرقے کے لوگوں کو جو بیشتر غریب ہوتے ہیں' ان کی بیویوں کے سامنے قتل کرنے اور اس کے بعد ان کی خواتین کی بے حرمتی کرنے میں جارح لنگم کے پیکر کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ فسادات میں ایسا اکثر اجتماعی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی موضوع کی دوسری صورت شوہروں کے سامنے ان کی بیویوں کی عصمت کو پامال کرنا اور پھر شوہروں کو ان کے سامنے قتل کرنا ہے۔ (8) یہاں زنا بالجبر کی ہیئت

ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ عصمت دری بذات خود شہوت یا سیڈازم کے مظاہرے کی بجائے مجسے اس کا مرتکب پوشیدہ رکھتا ہے' ایک سیاسی بیان' اپنے ہی شہریوں کے خلاف ایک جنگی ہتھیار اور فتح یابی کے وسیلے میں بدل جاتی ہے۔ (9) یہ ایک فرد واحد کے گھناؤنے فعل کی بجائے جس کا ارتکاب رات کی تاریکی یا پردوں کے پیچھے چھپ چھپا کر کیا جاتا ہے' جب لوگوں کے سامنے ہوتا ہے تو دیکھنے والے بھی شریک جرم ہو جاتے ہیں۔ اس سے فتح پانے والے لوگوں میں یک جہتی پیدا ہوتی ہے مگر مفتوح لوگوں کی یک جہتی کی مکمل طور پر حوصلہ شکنی اور ان کی عزت جو ان عورتوں کے جسم میں ملفوف سمجھی جاتی ہے' بچانے کی بر سر عام مکمل بے بسی کی بنا پر منہدم ہو جاتی ہے۔ یوں بر سر عام زنا کاری نجی رسوائی کی بجائے ایک جشن کی صورت اختیار کر لیتی اور اس کا مرتکب ہیرو بن جاتا ہے۔ ایودھیا میں ہندوؤں کے مذہبی راہنما یعنی سادھوؤں کے بھڑکانے پر مسجد کے انہدام اور عصمت دری کے درمیان ایک استعاری ربط ہے اور اس کے مرتکب کو خدا پرستی کا ہالہ عطا کر دیا جاتا ہے۔

جارحیت کا نقطہ عروج عصمت کی پامالی' قتل اور فسادات ہیں جو فسادات کے شروع ہونے سے پہلے ہی ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پچاس کی دہائی میں فرقہ وارانہ فساد چھرا گھونپنے کی اکا دکا وارداتوں کی صورت میں بھڑکے مگر 1970ء کے بعد اعلیٰ درجے کی تنظیمی مہارت نے فعال یا غیر فعال عناصر کو بھی فسادات میں مجموعی شمولیت کے لئے متحد کر دیا۔ 1990ء کی دہائی میں اعلیٰ درجے کی ہائی ٹیکنالوجی سے تیار شدہ سمعی اور بصری کیسٹوں اور کار سٹیریوز کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ ان کیسٹوں میں فسادات کے شکار لوگوں کی آہ و بکا اور چیخ و پکار کی نقلیں ہوتی ہیں اور فسادات کے متوقع مقامات پر ان کو تیز رفتار گاڑیوں کے ذریعے نشر کیا جاتا ہے۔ یہ عمل حقیقت کی نقل کرتی ہوئی فینٹسی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ یوں اس فینٹسی کے لئے حقیقت کا روپ اختیار کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ فینٹسی کے اندر ایک سوچی سمجھی ذو معنویت ہوتی ہے جس میں نشر کرنے کی رفتار مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ اس سے یہ پوری کاروائی تجارتی اشتہار بازی کی طرح عارضی اور گریز پا ہو کر زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے۔ ان آوازوں کے ذریعے یہ تاثر پیدا کیا جاتا

ہے کہ ہندو مردوں' عورتوں اور بچوں کے ایک گروہ پر وحشیانہ حملہ ہو رہا ہے۔ یہ "دوسرے فرقے" کو حملے کی "دعوت" دینے کے تقریباً مترادف ہے۔ یوں یہ عمل مسلمانوں پر اسی قسم کے جوابی حملے کا جواز فراہم کر دیتا ہے اور حملے کی مذکورہ نقل حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ مذہبی اور سیاسی راہنماؤں کی انتہائی جذباتی تقریریں پر مشتمل ویڈیو کیسٹوں کا ہدف لوگوں کی وسیع تعداد ہوتی ہے جو انہیں دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ یہ بڑے اطمینان سے دکھائی جاتی ہیں۔ اس ساری کاروائی کا مقصد ایک طرف تو سیاست اور مذہب میں حد فاصل کو مٹانا ہے اور دوسری طرف ہجوم کا ساتھ دینے میں جھجک محسوس کرنے والوں میں ان کی اہمیت میں کمی کا احساس پیدا کرنا ہے۔ سیاسی فیصلہ سازی کے عمل میں شرکت اور مذہبی خدا ترسی میں بھی اہمیت کے کم ہو جانے کا احساس ابھرنے لگتا ہے۔ یوں ایک محرومی دوسری محرومی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اجتماعیت کسی فعل کو جسے انفرادی سطح پر تو جرم سمجھا جاتا ہے' سماجی کاروائی کا حصہ بنا کر اور اس طرح اس کا جواز پیدا کر کے ریاست کی طرف سے قانونی کاروائی کے خلاف تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اجتماعیت یقین کا یہ احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ کوئی ایک فرد اس عوامی (اور یوں جمہوری) قوت کا حصہ ہے جو ریاست کے اوارے کو جھکا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی شرکت کے یقینی ہونے کے بنا پر فسادات کی اس قدر منصوبہ بندی ہوتی ہے کہ دنوں بلکہ ہفتوں پہلے ان کے متعلق افواہیں اڑنے لگتی ہیں۔ کئی موقعوں پر ان کے واقع ہونے کی تاریخوں پر شرطیں لگانے کی سنگی وارداتیں بھی ریکارڈ پر آ چکی ہیں۔ (10)

سیاسی تیاریاں

خواہ یہ ایودھیا پر مرکوز تحریک ہو یا فرقہ وارانہ فسادات ہوں حالیہ ہنگامی اشتعال انگیزی کی لہر کا مقصد ہندوستان کے سیاسی عمل میں مذہبی جنون کو ایک طاقتور سیاسی ہتھیار بنانا ہے۔ مطلب یہ نہیں سیاسی عمل میں ایک جزو ترکیبی کے طور پر یہ جنونی کیفیت پہلے سے کبھی موجود نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ واقعات کے اس سلسلے میں جو اگست 1948ء کو ملک کی تقسیم پر منتج ہوا' دونوں طرف سے زبردست جنونی کیفیت کا

زور دار اظہار ہوا لیکن اگلی دونوں دہائیوں میں جنہیں کہنے کو دائیں بازو اور بائیں بازو کی آئیڈیالوجی اور پلیٹ فارمز کہا جا سکتا ہے' اس کے درمیان اقتصادی اور طرز حکومت کے حلقوں میں مقابلے ہوئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد 1962ء میں ہند اور چین کے درمیان مسلح تصادم میں جس میں ہندوستان کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا' اس برافروختگی کو سیاسی محاذ آرائی کے لئے دوبارہ متحرک کیا گیا۔ بائیں بازو سے وابستہ تمام چھوٹی بڑی جماعتیں اس برافروختگی کا ہدف تھیں۔ تاہم یہ برافروختگی صرف الفاظ تک ہی محدود رہی اور اس کی قربان گاہ پر خون کی بلی نہیں دی گئی۔

متاخر آٹھویں دہائی سے ہندوستان کی پارلیمانی سیاست کی بالخصوص اور معاشرے کی بالعموم تشکیل کے لئے بڑے بے مثال پیمانے پر تزویراتی مداخلت کو منظم کیا گیا۔ کسی حد تک اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اشتراکی حکومتوں کے زوال پذیر ہونے سے اقتصادی ترجیحات بڑی تیزی سے سکڑنے لگیں اور ہندوستان میں لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن کہلانے والی تحریکوں کی فتح مندی سے مسابقت پر مبنی اقتصادیات نے ہر قسم کی سیاسی آرا کو ایک توافق کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اس طرح سیاست اور اقتصادیات ایک دوسرے سے دور ہونے لگیں اور بالاخر ایک دوسرے سے الگ ہو کر قائم بالذات ہو گئیں۔ اب اقتصادیات کی مدد سے بے نیاز ہو کر سیاست کو اپنے مسائل کا حل خود ہی ڈھونڈنا پڑا۔ مزید اور زیادہ اہم شاید یہ توقع تھی کہ جدیدیت کے تحرک اور پسماندگی کے جمود کے درمیان واضح طور پر بٹے ہوئے معاشرے میں مذہبی جنون معقول ترجیحات کو نظروں سے اوجھل کر دے گا۔ پدری نظام کے مقابلے میں زن و مرد کے درمیان مساوات' ذات پات کے نظام مراتب کے مقابلے میں سب کے لئے یکساں اقتصادی مواقع' سیکیولر ریاست کی بجائے فرقہ وارانہ سیاست اور معاشرہ جیسے مسائل کو مذہبی جنون میں غیر ضروری مشغولیت رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل کر دے گی۔ چنانچہ اس عمل میں کچھ مفادات کے لئے دوسرے مفادات کو لازمی طور پر جگہ خالی کرنی پڑتی ہے لیکن ایجنڈا اس کا اپنا ہی ہوتا ہے۔

ہینڈ بلز کے مشمولات میں صرف مقامی واقعات اور ساختوں ہی کا حوالہ نہیں ہوتا۔ ان میں کئی دفعہ عظیم الشان شیطانی ڈیزائن کی بین الاقوامی سازش کا حوالہ بھی ہوتا ہے

جو تمام بڑی بڑی شناختوں کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔ ایک خوشحال مغربی صوبے مہاراشٹر میں 1982ء کے ہینڈ بل میں بڑے پراسرار طریقے سے کہا گیا ہے کہ "ملک میں مسلسل فسادات کے پس منظر میں ایک بڑی منظم سازش کار فرما ہے۔ مراکو اور ملائشیا کے درمیان صرف ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جس میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ حکومت کی خاندانی منصوبہ بندی کو رد کر کے مسلمان زیادہ بچے پیدا کر کے ایک سے زیادہ بیویاں رکھ کر اور ہندو آبادی کو مسلمان کر کے اپنی آبادی کو بڑھانے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جمہوریت سے فائدہ اٹھا کر وہ مسلمان حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ یعنی ہندی مسلمان عرب ملکوں کے ساتھ سازش میں شریک ہیں۔" اس بیان سے قوم کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ ایک عظیم سازش میں شریک ہیں جس کا مقصد ملک کی موجودہ شناخت کو تباہ کرنا ہے۔ ہندوستان کی طرز حکومت کو ملوث کرنے کے اس عمل سے اسے بھی مشتبہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ جنگی منظر نامہ اپنی حفاظت کے تمام اقدامات اور تمام جمہوری اداروں سے دست برداری کے لئے جواز فراہم کرتا ہے۔ تاہم ہندوتوا یعنی ہندویت جیسا کہ اس کے حلیف کہنا پسند کرتے ہیں مگر جس کا اصل مقصد سیاسی اور سماجی مقاصد کے لئے ہندو اجتماعیت کو متحرک کرنا ہے' ایسا نہیں کہ اس کے منصوبہ میں کوئی اندرونی تحرک یا کشاکش نہیں ہے۔ اس منصوبے کے پارلیمانی محاذ یعنی بی جے پی کے تیز عروج کا مشاہدہ کرنے والوں نے دیکھا ہے کہ چھوٹی ذات کے ہندوؤں نے اس کی بھرپور امداد کی۔ ایودھیا کی تحریک میں ایسی تمام ذاتوں کے لوگوں کے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے یہ تاثر اور بھی گہرا اور طاقت ور ہو گیا اور اس سے سب ششدر رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی بندھی ٹکی صورت میں بی جے پی اور اس کی ساتھی تنظیمیں اونچی ذات والے ہندوؤں کی آئیڈیالوجی کے لئے مشہور ہیں اور نچلی ذات والے ہندوؤں میں اس کی حمایت بہت کم ہے۔ بی جے پی کی نچلی ذات والے ہندوؤں میں نسبتاً کامیابی کی ایک وجہ نچلی ذات والوں کا خود ہندو ہونے پر اصرار ہے جو انہیں اپنی اپنی ذاتوں سے ورا لے جاتا ہے۔ اس تاثر سے انہیں اپنی ذات سے بلند تر ذات کی طرف حرکت کرنے اور اونچی ذات والوں سے علامتی برابری کا موقعہ میسر آ جاتا ہے۔ یہ علامت اس وقت کئی

گنا زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے جب ایک شیطانی پیکر یعنی مسلمانوں کو تمام ہندوؤں کے لئے خطرہ قرار دیا جاتا ہے۔ بیرونی خطرہ تمام ہندوؤں کو متحد کر دیتا ہے اور اندرونی اختلافات کو ختم کر دیتا ہے۔ شاید دسمبر 1992ء اور جنوری 1993ء کے فسادات میں اونچی ذات والوں کے مقابلے میں نچلی ذات کے ہندو ایک فیصلہ کن تزویری مداخلت کے طور پر کہیں زیادہ متحرک تھے۔ ان پر اعتماد کرنے سے وہ نچلی ذات سے اونچی ذات میں بدل گئے۔

ناکام منصوبہ

کٹر اور براہمنی زاویہ نگاہ کی حامل تنظیموں میں نچلی ذات والے ہندوؤں کی شمولیت اور ان کے مرتبے میں اضافہ خواہ کتنا ہی علامتی کیوں نہ ہو' ان تنظیموں کے اتحاد کے لئے ایک خطرہ ضرور ہے۔ ان تنظیموں کی منظم بیرونی سطح پر رونما ہونے والی دراڑوں' نچلی ذات کے لوگوں کا ان تنظیموں میں محض علامتی تعداد سے زیادہ شمولیت کے خلاف مزاحمت' استعیفوں اور ان کو چھوڑ کر جانے والوں پر ہندوستان کے اخبارات اور جرائد میں بڑے مفصل تبصرے اور تجزیئے شائع ہوئے ہیں۔ مذہبی جنون کے ذریعے بی جے پی کا اقتدار میں آنا اس اقتدار کو استعمال کرنے اور اپنی حلیف جماعتوں کو اس میں شامل کرنے کی نسبت کہیں زیادہ آسان تھا۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ گنجان آباد صوبے میں جو اس کا گڑھ بھی ہے' انتخاب کے ذریعے اقتدار سے الگ ہونا کسی کے لئے اور خود بی جے پی کے لئے بھی کسی اچنبھے کا باعث نہ تھا۔ تمام ہندو کمیونٹی کو ایک واحد اور ہم نوع سماجی ہم آہنگی میں تبدیل کرنے کے منصوبے سے غیر متوقع نتائج بر آمد ہوئے۔

مذہبی معاملات میں بھی ایسی سماجی ہم آہنگی کی تشکیل کے خلاف مزاحمت پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے رد عمل میں بھی ایسی مزاحمت پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ جب دسمبر 1992ء اور جنوری 1993ء کے دوران ملک میں یکے بعد دیگرے فسادات ہو رہے تھے تو یہ خبر آئی کہ مختلف علاقوں میں ہندو اور مسلمان مقامی سطح پر اکٹھے ہو کر فسادات میں گرائے جانے والے مندروں اور مسجدوں کو دوبارہ تعمیر کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں اور

ان میں اپنے علاقوں کو مستقبل میں ہونے والے فسادات سے مشترک طور پر بچانے کے عہد و پیمان بھی ہوئے ہیں۔ سیاسی اور سماجی مسائل کو ابھارنے اور انہیں پھیلانے کے لئے مذہب کو استعمال کرنے کے برعکس ان اقدامات نے مذہب ہی سے بے پناہ قوت حاصل کی۔ یہ ایسا چیلنج تھا جو بھارتیہ جنتا پارٹی کے اپنے ہی گھر سے آیا تھا۔

اس کے برعکس مسجد کے گرائے جانے اور فسادات کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل اپنی کٹر قیادت کو آڑے ہاتھوں لینا تھا۔ انہوں نے فسادات کے جواب میں تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی تنقید اس امر پر منحصر تھی کہ مسلمانوں کی بقا الگ تھلگ اور روٹھے رہنے میں نہیں۔ ان کا تحفظ آگے بڑھ کر سیکیولر ہندوؤں سے مل کر جن کی ہندوؤں میں اکثریت ہے' ایک مشترک ترقی پسند تشخص قائم کرنے میں ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مسلمان دانشوروں کے کئی اجلاس (اور کچھ تو فسادات کے چند ہفتوں بعد ہی) منعقد ہوئے اور انہوں نے پرانی قیادت کو اپنے دفاع پر مجبور کر دیا۔ نومبر 1993ء میں پانچ صوبوں کے انتخابات میں مسلمانوں نے مجموعی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تین صوبوں میں بی جے پی کو ہرا دیا۔ چوتھے صوبے میں یہ جماعت بمشکل بچ سکی۔ مسلمانوں کا ملک کے جمہوری اداروں پر اور ہم خیال ہندوؤں کے ساتھ مل کر پرامن جمہوری طریقوں سے تبدیلی کے امکان پر یقین کی یہ واضح شہادت تھی۔ اس ادعا کی تکرار سے نہ کٹر مسلمان قیادت کو خوشی ہوئی اور نہ ہی بی جے پی کو۔

اس طریقے کار کی اہمیت صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ یہ ہندوتوا کی سیاست کو بھی مجروح کرتا ہے جس کی بقا کا مدار مسلمانوں کو ایک ایسے شیطانی پیکر میں پیش کرنا ہے جو ہر لحاظ سے کٹر' ماضی پرست اور جارحیت پر آمادہ ہے اور جس کی علت غائی ہندوؤں کو ختم کرنا ہے۔

یہ منظر نامہ شاید جنگ کی صورت حال پیدا کرے یا نہ کرے' فرقہ وارانہ انگیخت پر فسادات کرائے یا نہ کرائے مگر یہ تشدد کے ذریعے موجودہ شناختوں میں تبدیلی کے امکانات کی نشان دہی ضرور کرتا ہے جو اس تبدیلی کے محرک کے لئے بڑے سود مند ہو سکتے ہیں جیسے کوئی ریاست یا ایسی ممکنہ سیاسی جماعت یا گروہ جو اپنی نظریں اقتدار پر گاڑے ہوئے ہو۔

ہندوستان کے ٹیکنیکی اور اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ علاقوں میں لنگم کی جارحیت زیادہ شدید ہوتی ہے۔ دسمبر 1992ء اور جنوری 1993ء میں فرقہ وارانہ تشدد کی لہر بڑی خوفناک تھی۔ اس نے مہاراشٹر اور گجرات کے انتہائی ترقی یافتہ علاقوں اور بمبئی' سورت اور وڑوڈا جیسے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہاں ٹیکسٹائل' آٹو موبائلز' پیٹرو کیمیکلز اور ہیرے کی فیکٹریاں ہیں۔ ان صنعتوں میں خواتین انتظامیہ اور صنعت کاری کی افرادی قوت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ یہی وہ صنعتیں ہیں جن میں اقتصادی اور ٹیکنیکی ترقی کے محرک کے طور پر مرد کا ایک متحارب پیکر موجود ہے جو اقتصادی پیداوار اور یوں سرمایہ داری معاشرے میں "کامیابی" کا ذمہ دار ہے۔ دخول' فتح یابی اور قدرتی وسائل پر برتری کے حصول کے پیمانے پر "کامیابی" کی پیائش ہوتی ہے۔ یہ خواتین کے متعلق مرد کے جنسی واہمہ یا فینٹسی کے مترادف ہے۔

متحارب صورت حال سے قطع نظر تشدد مختلف صورتوں میں اچانک پھوٹ پڑتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ علی الاعلان خون بہانا ان میں سے صرف ایک ہے۔

حوالہ جات

(یہ مقالہ جون 1994ء میں

Violence et Politique Centre Culturel Internationale de Cerssy-la-Salle

نارمنڈی فرانس میں پیش کیا گیا)

-1 Journal of Gender Studies 1. 4. 1992. pp 447.62.

-2 Sexism and the War System. New York.1985.

-3 اب موزے دی آر سی' پیرس میں

-4 اب فلاڈیلفیا میوزیم آف آرٹ

-5 رتھمبرا کے بیانات / تقریروں میں موجود پدری تناظر کا کم کم سنگاری نے اپنے مقالے Consent Agency and Rhetorics of Incitement کے عنوان سے Economic and Political Weekly میں بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔

6- راشٹریہ سیوائم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) جو نا تھسی ولنٹیئر تنظیم کے ماڈل پر منظم کی گئی ہے' کے زنانہ بازو میں پدری آئیڈیالوجی کے نفوذ کے تجزیئے کے لئے ملاحظہ ہو ایس ایس تانیکا سرکار کا مقالہ

Women's within Authoritarian Communalism : The RashtrasevikaSamiti and Ramajanma-bhoomi

مطبوعہ گیانندرا اور دیگر (ایڈیٹر)

Hindus and Others: The Question of Identity in India Today, Delhi, 1993 pp.24-44.

مسلمانوں کی بنیاد پرست آئیڈیالوجی کے لئے ملاحظہ ہو صادق الاعظم کا مقالہ

The Muslim Fundamentalism, A Critical Outline of Problems, Ideas and Approaches, Part 1

مطبوعہ

South Asia Bulletin, 13, 1-2. 1993 pp. 93-121.

7- ضیاء الدین برنی : تاریخ فیروز شاہی مرتبہ سر سید احمد خان' کلکتہ' 1862' ص 253- مصنف کا ملاحظہ ہے دہلی میں شوہروں کے جرم کے لئے عورتوں اور بچوں کو سزا دینے کا اس سے پہلے کوئی رواج نہیں تھا۔

Jan Bremant-Muslam Program Economic and Political Weekly -8
28,16 17 April 1999 pp. 737-41

9- برعظیم کی آزادی پر ملک کی تقسیم کے موقعے پر مجنونانہ فسادات کے دوران مخالف فرقے کی بے شمار خواتین کے بازوؤں' چھاتیوں اور پیشانیوں پر ان مردوں نے اپنے نام کھدوائے جنھوں نے ان کے ساتھ زنا بالجبر کیا تھا۔ ملاحظہ ہو بیگم انیس قدوائی : آزادی کی چھاؤں میں' نئی دہلی' 1990- ص 156-158

10- اوما چکرورتی : *Khurja Riots* (خورجا کے فسادات) مطبوعہ اکنامک اینڈ پولیٹکل ویکلی' 28 18 : ص 956 تا 965

طبقہ امراء عہد سلطانی میں

بنارسی پرشاد سکسینہ

قرون وسطیٰ کے سیاسی نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تین طبقوں پر مشتمل تھا۔ اول سلطان اور اس کی اولاد' دوئم امراء' سوم حکام اعلیٰ و ادنیٰ۔ ان تینوں طبقوں میں دوسرا بلحاظ وقعت و ثروت کے اہم ترین تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت دہلی کی تاریخ میں سلاطین اور خاص کر ایسے جو اس خطاب کے فی الواقع شایاں ہیں' ان چمکدار ستاروں اور سیاروں کے مثل ہیں جو طلوع ہو کر تھوڑی دیر کے لئے لوگوں کو حیرت میں ڈال کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ قطب الدین ایبک' شمس الدین التمش' غیاث الدین بلبن' علاء الدین خلجی' محمد تغلق' سکندر لودی وہ مشہور و معروف ہستیاں ہیں جن کے کارنامے حشر تک کالعدم ہونے والے نہیں۔ مگر تین سو سال کے طول طویل عرصہ میں یہ پانچ یا چھ نام ستون راہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بھی تو امیری سے ہی ترقی کر کے تاج داری تک پہنچے تھے۔ پس اگرچہ سلسلہ سلطنت کو قائم رکھنے کا سہرا ان کے سر ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ وہ سلطان تھے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ امیر تھے اور ایسے امیر کہ جنہوں نے کارہائے نمایاں کر دکھائے' یہاں تک کہ لقب سلطانی کے اہل ثابت ہوئے۔

موجودہ دور کے مبصرین کا ازمنہ وسطیٰ کے تواریخی کتب پر یہ اعتراض ہے کہ یہ عوام الناس کے حالات سے خالی ہیں۔ جمہوریت کی اٹھتی ہوئی لہر کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراض کسی حد تک جائز تصور کیا جا سکتا ہے مگر قرون وسطیٰ کی فضا کے لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ جب کہ سیاسی امور میں عوام الناس کا کوئی دخل نہ تھا۔ جب کہ ہر قسم کے قوانین کی پابندی کرنا ان کا فرض تھا اور حاکم کی فرماں برداری کرنا ان کا شیوہ' پھر

بھلا اگر مورخین نے ان کے حالات کو نظرانداز کر دیا تو اس میں گلے کی کیا بات ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ طبقہ امراء کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی مورخوں نے ان کے حالات قلمبند کرنے میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ اصل میں تو قرون وسطی کی تاریخ امیروں کے کارناموں سے بھی بھری ہوئی ہونا چاہئے تھی نہ کہ سلاطین کے حالات سے کیونکہ فی نفسہ امیر ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سلطنت کی بنیاد کو پائدار و مستحکم بنایا۔ یہ اراکین سلطنت کہلاتے تھے۔ ان میں اور سلطان میں لازم و ملزوم کا علاقہ تھا۔

پس طبقہ امراء کی امتزاجی ہیئت' اس کی دستوری حیثیت' اس کا سیاسیات پر اثر اور اس کی اقتصادی و معاشرتی اہمیت پر کسی قسم کی بحث بعید از دلچسپی نہ ہو گی۔ مگر قبل اس کے کہ ان مسائل پر کوئی مزید روشنی ڈالی جائے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرداً" فرداً" اس طبقہ کے لوگ ایک پایہ کے نہ تھے۔ بہتوں نے تو اپنی زندگی کا افتتاح غلامی سے کیا تھا اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے مناصب اعلیٰ تک پہنچ گئے تھے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ممالک غیر کے شہزادے افلاس و تنگدستی سے عاجز آ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوتے۔ جب سلطان کو پتہ چلتا تو وہ ان کو طبقہ امراء میں داخل کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی کوئی فوجی سردار قوت بازو سے تاج و تخت کا مالک بن بیٹھتا تو بمقتضائے موقع و وقت اپنے عزیز و اقربا کو امیر بنا دیتا تھا۔

اس عہد میں سلطان کی بلا مرضی کوئی امیر نہیں بن سکتا تھا۔ وجہ یہ کہ اس رتبہ کے واسطے فوجی عہدہ کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ اس عہدہ کا عطا کرنا یا نہ کرنا یہ امر خالصاً" سلطان کی رائے پر مبنی تھا۔ اس کے متعلق ایک اور دلچسپ بات ہے اور وہ یہ کہ باوجود اس امر کے کہ کسی شخص کا فوجی عہدہ پر تقرر ہو گیا ہو یہ ضروری نہ تھا کہ وہ فوجی خدمات انجام بھی دے۔ سرکاری نوکر اور خاص کر ایسا کہ جس کی کچھ قدر و منزلت ہو وہی ہوتا تھا کہ جو فوجی ملازمت میں داخل ہو گیا ہو۔ حسب دستور یہ عہدے شخصی ہوتے تھے نہ کہ ارثی۔ یہ لازم نہ تھا کہ کسی امیر کا لڑکا اپنے والد کے شغل و خطاب کو پا ہی لے یہ دوسری بات تھی کہ کسی امیر کی خدمات سے خوش ہو کر کوئی سلطان اس کے لڑکے کو اپنے والد کا شغل و خطاب عطا کر دے مگر اس کو کرم سلطانی کہتے تھے جس کا کہ کوئی علاقہ "حق" یا دستوری حقوق سے نہ تھا۔ اس زمانہ میں لفظ

"حق" بالکل مہمل تھا۔ چنانچہ سلطان کو پوری آزادی تھی کہ کسی امیر کو اس کے عہدے سے معزول کر دے اور اس کی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر لے۔ امیروں کو ایسے طرز عمل کے خلاف چون و چرا کرنے کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ اس دور میں امیر چار تدریجی درجوں کے ہوتے تھے۔ درجہ اول کا امیر خاں کہلاتا تھا اور ان میں سب سے اعلیٰ کا خطاب الغ خاں اعظم ہوتا تھا۔ دوسرے درجہ کے امیر ملک کہلاتے تھے۔ اور تیسرے درجہ کے امیر کے نام سے منسوب ہوتے تھے۔ ان کے بعد فوجی افسروں کا نمبر آتا تھا مثلاً سپہ سالار، سرخیل وغیرہ۔ ہر درجہ کی مناسبت شغل و خطاب، اور اقطاع سے ہوتی تھی۔ خطابوں کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ ہر سلطان اپنی مرضی و خواہش کے مطابق خطاب ایجاد کو لیتا تھا جیسے خواجہ جہاں، خان جہاں، خان خاناں، قدر خاں، عمادالملک، قوام الملک، نظام الملک، اعظم الملک، قتلغ خاں، الغ خاں، صدر جہان وغیرہ وغیرہ۔

دستوری نقطہ نظر سے امیر تین قسم کے ہوتے تھے اول وہ جن کو یہ عہدہ وراثتاً ملا ہوا تھا۔ دوسرے وہ جو سلطان الوقت کے بنائے ہوئے تھے اور تیسرے وہ جو نیچے درجے سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اس عہدہ تک پہنچ گئے تھے۔ عہد سلطنت کے آغاز میں تیسری قسم کے امیروں کی تعداد بمقابلہ اول دو کے زیادہ تھی وجہ یہ کہ فرماں رواؤں کو اپنے غلاموں پر پورا اعتماد تھا وہ ان کی تعلیم و تربیت کے واسطے مناسب انتظام کرتے تھے اور حتی المقدور ان کی آسائش و آرام کا خیال رکھتے تھے۔ انہیں غلاموں میں سے جو ہونہار ہوتے وہ ترقی کر جاتے تھے اور ملک پر جان نثار کر دینے کے واسطے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے۔ محمد غوری نے جو سلوک اپنے غلاموں کے ساتھ کیا وہ شہرہ آفاق تھے۔ ان غلاموں نے بھی اپنے کارناموں سے اپنے مالک کی عزت و ناموس کو قائم رکھا۔

مگر غلاموں کو امیر بنانے کا دستور عہد سلطنت کے اول حصہ میں ہی زوروں پر رہا۔ جب تخت نشین ہونے کے بعد قطب الدین ایبک کو اپنا پایہ مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے پہلے تو محمد غوری کے باقی ماندہ ہندوی افسروں کے ساتھ صلح کر کے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنایا۔ پھر اس نے بہت سے اور امیر بنائے جن میں بیشتر غلام تھے۔ ایسے امیروں کی ایک زندہ مثال التمش ہے۔ قاعدہ یہ تھا کہ جس غلام کو

امیر بنانا ہوتا تھا اسے آزاد کر کے پھر اس کے سپرد اقطاع یا شغل یا سپہ سالاری کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ آرام شاہ جس کو کہ آخیر میں سلطان کا اتنا قرب حاصل ہو گیا شروع میں غلام ہی رہا ہو۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملتا ہے۔ جب قطب الدین کے لا ولد مرنے پر تاج و تخت کی وراثت کا سوال پیدا ہوا تو لاہور میں تو کچھ امیروں نے آرام کا ساتھ دیا مگر دہلی میں سپہ سالار اسمٰعیل امیر داد نے التمش کو بداؤں سے بلا کر تخت نشین کیا لیکن قطبی اور مغربی امیروں نے اس کی سخت مخالفت کی حتیٰ کہ بدرجہ مجبوری التمش کو جنگ کرنا پڑی۔ کچھ تو دہلی کے گرد و نواح میں مارے گئے بقیہ جو آرام کے حمایتی بن کر لاہور سے بڑھے آ رہے تھے سلطان نے ان کا بھی قلع قمع کر دیا۔

قطبی اور معزی امیروں کی تباہی سے التمش کی بہت سی مشکلیں آسان ہو گئیں۔ اب اس کو پوری ازادی تھی کہ اپنے من مانے امیر بنائے۔ چنانچہ اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کی غرض سے و نیز اس خیال سے کہ تاج شاہی کی آبرو امیروں سے ہی ہوتی ہے التمش نے ایک نئے طبقے کی تکمیل کی جس میں کہ اس نے چالیس چیدہ چیدہ غلاموں کو شامل کیا اور ان کو چہل گان کے نام سے موسوم کیا۔ تاریخ ہند میں یہ اولین موقع تھا جبکہ کسی فرمانروا نے محض غلاموں ہی کو رکن سلطنت بنایا ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ التمش کا وزیر اعلیٰ نظام الملک کمال الدین ابو سعید جنیدی و نیز دیگر حکام بالا مثلاً ملک فیروز شہزادہ خوارزم و ملک جلال الدین شہزادہ ترک غلام نہ تھے مگر اصل میں سلطان نے اپنی قدرت و مکنت کا دار و مدار غلاموں پر ہی کیا۔ اس کی وفات کے تیس سال بعد تک یہ ہی چہل گان امور سلطنت کو انجام دیتے رہے۔ جو جو کاروائیاں ان سے ظہور میں آئیں ان کا مفصل و مشرح حال طبقات ناصری میں درج ہے۔

مگر غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی کے بعد سے چہل گان کا زور کم ہو گیا۔ اس نے ان کے گروہ کو تہ بالا کر دیا اور اس نے امراء کے متعلق ایک نئے دستور پر عملدر آمد کیا جس کا کہ صاف منشاء یہ تھا کہ کوئی ایسا شخص امیر نہ بنایا جائے جس کا حسب و نسب صحیح نہ ہو۔ یہ اصول اس بات کا شاہد ہے کہ بلبن کی سریر آرائی کے قبل کچھ ایسے لوگ طبقہ امراء میں داخل ہو گئے تھے جن کی بے عنوانیوں سے شاہی

وقار معرض زوال میں آگیا تھا۔ ریحان نے جو کچھ بلبن کے ساتھ سلوک کیا تھا اس کی یاد اس کو بھولی نہ تھی۔ مزید براں طائفہ چہل گان میں نقائص پیدا ہو گئے تھے۔ ان کے درمیان بغض و حسد کی آگ اتنے زوروں سے بھڑک رہی تھی کہ وہ خود اس سے جل کر خاک سیاہ ہوئے جا رہے تھے۔ اب یہ سلطنت کا بار سنبھالنے کے قابل نہیں تھے اور اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے سیاسی نظام کا شیرازہ بالکل درہم برہم نہ ہو جائے۔ بلبن میں بھلا اتنی تاب کہاں تھی کہ ایسی زبوں حالت کو چپ چاپ دیکھتا رہتا۔ چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس طبقے کو خس و خاشاک سے پاک کر دے' اس نے اس کام کو نہایت ہی دلیری سے انجام دیا۔ اس نے اپنے وزیروں کو تاکید کی کہ کسی حالت میں بھی سرکاری ملازمت کے واسطے وہ کسی مجہول النسب کو اس کے روبرو پیش نہ کریں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلطان نے اپنے وزراء سے کہا کہ وہ ایک ایسا آدمی تلاش کر لائیں جو کہ امروہہ کی متصرفی کے قابل ہو اس وقت ملک علاء الدین کشلو خاں امیر حاجب تھا اور ملک نظام الدین بزغالہ وکیل در۔ ان لوگوں نے کمال مہیار کو منتخب کیا اور امروہہ کی متصرفی کے لئے اس کو سلطان کے سامنے پیش کیا۔ جس وقت کمال مہیار خاک بوسی کر رہا تھا بلبن نے ملازمین سے کہا کہ اس سے لفظ مہیار کے معنی دریافت کرو کرین نے جواب دیا کہ مہیار میرے والد کا نام ہے وہ اصل میں ایک ہندو غلام تھا۔ یہ سننا تھا کہ سلطان آگ بگولہ ہو گیا اس نے فوراً ہی دربار برخاست کر دیا اور اپنے وزیروں کو تنہائی میں بلا بھیجا۔ ان کو لعنت ملامت کرنے کے بعد کہا کہ تم لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ میں افراسیاب کے خاندان سے ہوں۔ اللہ تعالٰی نے میرے مزاج میں وہ خاصیت پیدا کی ہے کہ میں کسی بد اصل کو سرکاری عہدے پر نہیں دیکھ سکتا ہوں' جس وقت میری نگاہ کسی ایسے شخص پر پڑ جاتی ہے جس کا حسب و نسب صحیح نہ ہو تو غصہ سے میرا جسم کانپ جاتا ہے' پھر بھلا مجھ کو یہ بات کب گوارا ہو سکتی ہے کہ میں کسی بد اصل اور کم ظرف کو سرکاری عہدہ پر مقرر کروں۔ یہی اصول اس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کے ذہن نشین کرنا چاہا مگر اس میں اس کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ تاہم جہاں تم ممکن تھا اپنے دور میں اس نے طبقہ امراء کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا۔ قسمت کو کیا کرتا اس کے پوتے کیقباد نے اپنے

باوا کی کی کرائی محنت رائیگاں کر دی۔ اسی لئے نہ صرف تخت بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھوئے۔

بلبن خاندان کے زوال کے بعد ایک نئے خاندان کا عروج ہوا۔ جس کا بانی جلال الدین فیروز خلجی تھا۔ تخت نشین ہونے سے قبل عرصہ دراز تک وہ غیاث الدین کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی ایک پارٹی بنائی۔ سرحدی صوبوں کی محافظت کا کام بلبن نے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ برنی کا قول ہے کہ جلال الدین نے اس عہدہ کے فرائض کو ایسی جوانمردی و دلیری سے انجام دیا کہ مغل اس کا لوہا مان گئے۔ چونکہ اس کا ایک پیر ہر وقت عرصہ کار زار میں رہا کرتا اس لئے اس کے پاس ایک عمدہ فوج بھی ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ اغلب ہے کہ اس کی فوج میں زیادہ تر سپاہی اس کے ہم قوم ہوں کیونکہ اس زمانہ میں فوجی ملازمت فرقہ وارانہ اصول پر ہوا کرتی تھی۔ ہر امیر اپنے فرقہ کے لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا کرتا تھا۔ یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہو گا کہ جلال الدین نے اپنے فرقہ والوں ہی کی امداد سے تخت حاصل کیا۔ حسب دستور اس کو بھی نئے امراء کی ضرورت پیش آئی۔ اول تو اس کو اپنی پارٹی مضبوط کرنا تھی دوسرے یہ کہ پرانے امیروں پر اعتبار کرنا خالی از خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ پہلے تو اس نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو اعلیٰ خطابوں سے سرفراز کیا مثلاً اپنے سب سے بڑے لڑکے کو خان خاناں دوسرے کو ارکلی خاں اور تیسرے کو قدر خاں کا خطاب عطا کیا۔ اپنے بھائی یغرش خاں اور اپنے دو بھتیجوں میں سے علاء الدین کو تو امیر توزک بنایا اور دوسرے الغ خاں کو ماخوربک کے عہدہ پر مامور کیا۔ جلالی دور کے افسران اعلیٰ کی فہرست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ تو پرانے لوگ تھے مثلاً وزیر خواجہ خطیرہ۔ احمد جپ نائب باربک وغیرہ۔ اور کچھ نئے بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اس وقت سے ہندی نژاد امراء کی بھی تعداد بڑھنا شروع ہو گئی۔ باوجود سعی بلیغ کے بلبن اس تحریک کو نہ روک سکا' کیونکہ ضیاء الدین برنی کا نانا سپہ سالار حسام الدین جو کہ غالباً ہندی تھا بلبن کا وکیل در اور باربک تھا۔ جلالی دور کے آغاز میں بھی ملک نصیرالدین کہرامی۔ ملک قطب الدین کیتھلی۔ ملک تاج الدین کہرامی ملک تاجو۔ ملک ہرنمار جو کہ بتدریج ترقی کر کے ان مناصب تک

پہنچے تھے بلا شبہ ہندی تھے۔ اس سلطان کے دربار میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے' ترکی' ہندی اور خلجی۔ اگرچہ برنی نے خلجی امیروں کی کوئی علیحدہ فہرست نہیں دی مگر جس ڈھنگ سے وہ فقرہ' امرائے خلج کو استعمال کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد کافی تھی "سلطان جلال الدین باکو کہ بادشاہی و جمعیت ارکان و اعوان ملک و امرائے خلج و معارف و حشم قدیم ایام ملکی و مخلصان معتمد دولت درون شہر رفت" (صفحہ 177)۔

سن رسیدہ بادشاہ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں عصائے شاہی کا مدت مدید تک رہنا دشوار تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کے معتمد و معترف بھتیجے علاء الدین نے در پردہ سازش کر کے اپنے مربی و سرپرست کو دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب روانہ کر دیا۔ اور خود تاج و تخت کا وارث بن بیٹھا۔ سلطان علاء الدین کی نگاہ قہر پہلے پہل طبقہ امراء پر پڑی۔ اس نے سرکش و باغی لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ باقی کو اپنا مطیع و تابعدار بنایا۔ جن جلالی امیروں نے رشوت لے کر اپنے آقا کے ساتھ نمک حرامی کی تھی ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ سلطان علاء الدین نے .بمصداق۔ ہر کہ آمد عمارتے نرساخت۔ امیروں کے ایک بالکل نئے طبقے کی ترتیب دی۔ اگر تاریخ فیروز شاہی میں دی ہوئی فہرستوں کا باہمی مقابلہ کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہو گا کہ علاء الدین کے امیروں میں ایسوں کی تعداد بہت کم ہے جو گذشتہ دور میں اس درجہ پر سرفراز تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کے عہد سلطنت میں ہندی نژاد امیروں نے بہت زور باندھا۔ علاء الدین والی فہرست میں کم از کم سات ایسے نام ہیں جن کے حسب و نسب کی بابت کوئی دوسری رائے قائم ہو ہی نہیں سکتی مثلاً علاء الملک' قاضی مغیث الدین' قاضی حمید ملتانی' عین الملک ملتانی' ملک کافور ہزار دینار ملک نائب' ملک کافور مرہت نائب و کیلدر' ملک فخرالدین کھند۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بقیہ ناموں میں بہت سے ایسے ہوں جو کہ ہندی لوگوں نے اپنی اصلیت کو پوشیدہ رکھنے کے لئے رکھ لئے ہوں۔ دربار میں ہندی مسلمانوں کی ترقی و تربیت کی ایک اور وجہ بھی تھی' وہ یہ کہ اول تو وسطی ایشیا میں مغل ہنگامے نے پرانی تہذیب کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اور چونکہ مغل خود ہندوستان کے سرحدی صوبوں میں لوٹ مار مچائے ہوئے تھے اس لئے ممالک غیر

سے اس طرف رخ کرتے ہوئے قابل لوگ گھبراتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ آتے بھی تھے وہ زیادہ تر ترک نژاد ہوتے تھے۔ اور ترکوں کی خلجی دربار میں بڑی بے قدری تھی۔ جلال الدین کے زمانہ سے ہی ترکوں اور خلجیوں کے درمیان زبردست کشیدگی رہنے لگی تھی۔ ترکوں کا یہ خیال تھا کہ خلجی لوگ غاصب ہیں۔ ہندوستان کی سلطنت کا حق صرف ترکوں کو حاصل ہے۔ تیسرے سیاسی اصولوں میں کچھ تغیر و تبدل۔ اگرچہ بظاہر اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے کہ شریعت اسلام کو دھکا لگتا۔ لیکن اس کے گفتار و کردار سے باہر کے لوگوں کو شک پیدا ہو جاتا تھا کہ اس نے مذہب اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ مولانا شمس الدین ترک ایک نہایت ہی بے نظیر عالم اور محدث تھے وہ مصر سے خشکی کے راستہ تشریف لائے۔ جب ملتان پہنچے تو وہاں ان کو پتہ چلا کہ بادشاہ وقت علاء الدین نہ تو نماز پڑھتا ہے اور نہ نماز جمعہ میں شریک ہوتا ہے۔ یہ سن کر مولانا شمس الدین نے دہلی جانے کا قصد فسخ کر دیا اور اپنے وطن واپس چلے گئے۔ وہاں سے فارسی میں ایک رسالہ لکھ کر علاء الدین کے پاس بھیجا۔ جس میں تحریر تھا کہ میں دور دراز سفر کی مشقت برداشت کر کے ملتان تک آیا مگر جب میں نے آپ کی اطوار و عادات کا چرچا سنا تو میں سیدھا واپس چلا گیا۔ مختصر یہ کہ علاء الدین کے دور کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً تمام دربار ہندی الاصل امیروں سے بھر گیا تھا۔ اس کے لئے کسی حد تک تو سلطان خود ذمہ دار تھا کیونکہ آخری وقت میں اس کو قابل اور جہاندیدہ لوگوں سے نفرت ہو گئی تھی اور جی حضوریوں سے انسیت۔ ایسے لوگ ہندی الاصل جماعت ہی میں مل سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کافور کو جو رتبہ حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بھی ہندیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا کافور نو مسلم تھا اس کو ضرورت تھی کہ اپنے حوصلوں کی تکمیل کے واسطے اپنے اردگرد اپنے ہی طرح کے لوگوں کو جمع کرے۔ جب سلطان نے ریاست کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں سونپ دی تو پھر اس کاروائی کا اس کو خوب ہی موقع مل گیا۔

ملک کافور نے علاء الدین کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو علاء الدین نے اپنے چچا کے ساتھ کیا تھا۔ مگر زیادتیوں نے اس کے نخل امید کو بار آور نہ ہونے دیا۔ چنانچہ وہ اپنی سازشوں کا خود ہی شکار ہوا اور اس کو تخت کے بجائے تابوت نصیب ہوا۔ قطب الدین

مبارک خلجی میں بھلا ایسا ہوتا کہاں تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کے بار کو سنبھال لیتا۔ بیکس و بے بس ہو کر اس نے اپنی کشتی کو عیش و عشرت کے بحر ناپیدا کنار میں چھوڑ دیا۔ جیسے اس کے والد نے ایک بد اصل کے ساتھ' رشتہ جوڑا تھا ٹھیک اسی طرح قطب الدین نے ایک کم ظرف کو اپنا معتمد و صلاح کار بنایا۔ خسرو خان کی فوری ترقی کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہندی اصل امیروں کا شاہی دربار میں بول بالا تھا۔ موقع ہاتھ آتے ہی خسرو خاں نے اپنے پیر نکالے۔ اپنے پرانے بھائی بندوں کو دہلی بلا لیا اور فوج میں بھرتی کر لیا یہی نہیں بلکہ ان کے واسطے شاہی محل میں آمدورفت کا دروازہ بھی کھول دیا۔ قطب الدین اپنے وزیر پر اتنا فریفتہ تھا کہ بہی خواہان سلطنت کے پیام آگاہی کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔ نتیجہ میں اس نے بھی معزالدین کیقباد کی طرح اپنے جان و مال سے ہاتھ دھو لئے۔ پانچ ماہ تک دہلی کا تخت نو مسلموں کے ہی ہاتھ میں رہا۔ سلطان ناصر الدین خسرو خاں نے اسلام کو ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ مسجدوں کے طاقوں میں بت رکھوا دیئے اور بتوں کے پیروں تلے قرآن شریف رکھوائے۔ شاید یہ تھا عوض ان ذلتوں اور خواریوں کا جو کہ التمش اور اس کے جانشینوں نے ہندو مذہب کو اور ہندوؤں کو پہنچائی تھیں۔ گجرات کے براوو شاید ابھی نہ بھولے تھے کہ شمس الدین التمش نے دھار میں مہا کال کے مندر کو نہ صرف مسمار و بے حرمت کیا تھا بلکہ بت کو لا کر دہلی کی جامع مسجد کے دروازہ پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا تھا تاکہ مسلمین اس پر پیر رکھ کر نکلیں۔ براوو کسی رذیل قوم کے نہ تھے یہ بات امیر خسرو کے تغلق نامہ سے ثابت ہے۔

بسے ہندو کہ گویندش براوو
شدہ یار از برائے فتنہ او
براوو وصف ہندوئیست سرباز
کہ ہم سرباز باشد ہم سرانداز
بوند ایں طائفہ درپیش رایاں
کہ جاں بازند بر فرمانروایاں

خسرو شاہ کے بے عنوانیوں سے ہر چہار جانب سنسنی پھیل گئی۔ بڑے بڑے امیر

مارے دہشت کے کانپنے لگے۔ لیکن یہ بات سب پر ظاہر تھی کہ جلد ہی کوئی انقلاب ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ چنانچہ غازی ملک نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ خاندان علائی کے دشمنوں سے بلا انتقام لئے چین نہ لے گا۔ دوسرے امیروں سے خط و کتابت کرنے کے بعد جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ اس کے ہم خیال بہت سے لوگ ہیں تو اس نے ایک جرار فوج اکٹھا کی۔ مار کاٹ کرتا ہوا وہ دہلی کے جانب بڑھا مگر اس بھونچال سے خسرو گھبرایا نہیں۔ اس نے روپیہ کو پانی کے طرح بہایا وہ اپنی فوج لے کر میدان میں آ ڈٹا۔ ایک بار تو اس نے غازی ملک کے چھکے چھوڑا دیئے مگر تقدیر کا ساتھ نہ تھا۔ جیتی جتائی بازی ہار گیا۔ بھاگ کر ایک باغ میں چھپ رہا۔ تین فاقوں کے بعد بیچارہ جب نکلا تو شاہی انگشتری نے اس کے راز کو طشت از بام کر دیا۔ گرفتار کر کے غازی ملک کے سامنے لایا گیا۔ اس کے گناہوں کی سزا اس کو بھگتنا پڑی۔

غازی ملک نے علائی امیروں اور بہی خواہوں کو اکٹھا کر کے ایک نہایت ہی زور دار تقریر کی۔ اتفاق رائے سے امیروں نے اسی کو تخت کا وارث قرار دیا گیا۔ غیاث الدین کو طبقہ امراء کی نئی ترتیب میں کئی باتوں کا لحاظ رکھنا پڑا۔ اول تو علائی خاندان کے حامی و مددگار ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ پرانے امیروں میں سے بھی کچھ کو اپنے ساتھ رکھے۔ خاص کر اس وقت تک جب تک کہ اس کا پایا مضبوط نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ہندی الاصل امیروں کو وہ یکدم معزول نہ کر سکتا تھا کیونکہ ابھی تک اس کو یہ امید نہ تھی کہ باہر سے قابل لوگ کافی تعداد میں آ کر حکومت کا کام چلا لیں گے۔ تیسرے اس کو مذہبی اصول ہر وقت سامنے رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اس نے مذہب اسلام کے آوازہ کو بلند کیا تھا اور تخت نشینی سے قبل یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اسلام کے بجھتے ہوئے چراغ کو از سرنو روشن کرے گا۔ چنانچہ غازی ملک کے امیروں میں وہی بات ملتی ہے جو کہ جلال الدین خلجی کے گروہ میں تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جلال الدین کو سیدھے اور سرکش۔ قابل اور نالائق میں تمیز نہ تھی برخلاف اس کے غیاث الدین تغلق کو فردا" فردا" ہر امیر کی لیاقت اور اس کے خیالات کا اندازہ تھا یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے امیروں سے کبھی بھی دھوکا نہیں کھایا اور اس کو حکومت کے کاروبار میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔

محمد تغلق کے آتے آتے فضا بدل گئی۔ خاندان تغلق کا دبدبہ تمام ہندوستان پر قائم ہو گیا تھا اور بظاہر ہر طرف سکون و اطمینان کے آثار نظر آتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان اور ممالک غیر کے درمیان دوبارہ ربط ضبط قائم ہو گیا۔ بقول امیر خسرو تغلق خاندان کے مورث بھی مغل تھے۔ شعر: معظم تغلق غازی ترا نام * مغل ہم نام تغلق داشت ز ایام۔ اس لئے محمد تغلق کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کو اسی امر کی کوشش کرنا چاہئے کہ اس کا طبقہ امراء یکسر غیر ملک والے لوگوں سے بھر جائے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ پردیسیوں پر اپنا خزانہ لگانے لگا۔ ترکی و فارسی الاصل لوگوں کو جو انعامات ملتے تھے ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "بادشاہ ہند محمد تغلق شاہ پردیسیوں کی تعظیم و تکریم بدرجہ غایت کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے۔ اور بڑے بڑے عہدے ان کو دیتا ہے۔ اس کے بڑے بڑے خواص اور حاجب اور وزیر اور قاضی اور داماد غیر ملک کے باشندے ہیں۔ اس کا حکم ہے کہ پردیسی کو ہمیشہ عزیز کے نام سے پکارا کریں چنانچہ باہر کے لوگ بجائے غریب کے سب عزیز کہلاتے ہیں۔ بدایونی اسی کے متعلق رقم طراز ہے' "درآں چند سال مردم از ولایت خراسان و عراق و سمرقند بامید بخشش سلطان در ہند آمدند کہ دریں دیار بغیر از ایشاں طائفہ دیگر کم بنظر درمے آمدند" برنی لکھتا ہے۔ "و در تمامی قرن بادشاہی خود عظما و کبرا و معتبران۔ و ماہران و استاذاں ہر ملکے و وہ نرے و بزرگزادہ و ہر واقعہ ، کشتی [illegible] کہ بامید [illegible] خواجہ محمد شاہی خراسان و عراق و ماوراء النہر و خوارزم و سیستان۔ و ہریو و مصر و دمشق در درگاہ آسمان جاہ اومی رسیدند باموال و اسباب مالا مال می شدند و نہ در آخر عہد سلطان جندیں مغلان و امیران تمن و امیران ہزارہ معارف مغلان و خاتونان بزرگ و اکابر مغلستان بندرگاہ سلطان محمد شاہ بہ بندگی و چاکری و اخلاص و ہوا خواہی می رسیدند' (p.462) ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ محمد تغلق کو پردیسیوں کا کتنا خیال تھا۔ ان لوگوں کو اعلیٰ اعلیٰ عہدے دینا مصلحت سے خالی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لائق لائق آدمی خراسان' ترکستان' عرب' و شام وغیرہ سے آکر اس کی ملازمت اختیار کریں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد تغلق نے اس رویہ کو کیوں جاری کیا۔ کیا ہندوستان میں قابل لوگ اس کو دستیاب نہیں ہوتے تھے جو اس کو پردیسیوں کو بھرتی کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ معلوم یہ ہوتا

ہے کہ سلطان کو ہندی اصل امیروں کا اعتبار جاتا رہا تھا۔ علاوہ بریں اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ربع مسکون میں بے مثل شہرت حاصل کر لے اور اپنے طرز حکومت کو عدیم المثال بنا لے۔ ان ارادوں کی تکمیل کا اس کو صرف یہی ذریعہ معلوم ہوا کہ پردیسیوں کے ساتھ رعایت کرے۔ ممکن ہے کہ پردیسی خون نے بھی اس کی رگوں میں کچھ جوش مارا ہو اور اس کو اسی طرز عمل کے طرف مائل کیا ہو۔ بلبن کے طرح اگر یہ بھی ہوشیاری اور سمجھ سے کام لیتا تو انجام بہتر ہوتا مگر زور میں آکر محمد تغلق نے پردیسیوں کی ایسی بھرمار کی کہ قابل اور نالائق' عقلمند اور جاہل' کار آمد اور بیکار کے امتیاز کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا۔ دربار تو پردیسیوں سے بھرا ہی تھا۔ خیر یہاں تک غنیمت تھا۔ لیکن محمد تغلق نے فوج اور دیگر شعبہ ہائے حکومت میں بھی پردیسیوں ہی کو جگہ دی۔ بالآخر جب یہ لوگ نالائق ثابت ہوئے تب محمد تغلق کی آنکھیں کھلیں۔ سراسیمہ ہو کر اس نے یکدم اپنے طرز عمل کو بدل دیا۔ کہاں تو پردیسیوں کی اتنی قدر و منزلت تھی کہاں اب وہی باغیوں کی فہرست میں گردانے جانے لگے۔ مجبوراً" ہندی الاصل لوگوں کو سلطان نے گروہ امراء میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اب اتنا موقع نہ تھا کہ وہ سوچ سمجھ کر کام کر سکتا۔ وہ تو غصہ کے مارے اندھا ہو رہا تھا۔ دوسرے یکدم اتنی تعداد میں قابل آدمیوں کا ملنا امر محال تھا۔ ناتجربہ کار اور بداصل لوگوں کا زور بندھا۔ نئے امیر کس قسم کے تھے اس کا اندازہ برنی کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ "سلطان در ولایت سنام و سامانہ لشکر کشید و متمردان و سرتابان آنجاے کہ منزلہا کردہ بودند و خراج نمیدادند و فسادھا می کردند و راہ می زدند سلطان محمد منزلہائے ایشان را نہب و تاراج فرمود و جمعیتہائے ایشان را متفرق گردانید و مقدمان و سران ایشان را در شہر آورد و بعضے از ایشان مسلمان شدند و گروہ گروہ را داخل امرا گردانید۔" ممکن ہے کہ برنی کے یہ الفاظ مبالغہ آمیز ہوں لیکن آئندہ واقعات سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ دیسی تحریک نے اسی زمانہ سے از سرنو زور باندھا تھا:

فیروز تغلق علماء و اکابر کی مدد سے تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانہ میں نو مسلمین کی طاقت انتہائی درجہ تک پہنچ گئی۔ اس کا وزیر خان جہاں مقبول ہندی نژاد تھا۔ وہ تلنگ کا باشندہ تھا اور اس کا اصلی نام کذو تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے اپنے ہم وطنوں کی سرپرستی

کی ہو گی۔ دوسرے بہت سے علماء باوجود اپنی پردیسی اصل کے ہندی ہی ہو گئے تھے۔ ان کی عزت' ان کی شہرت' ان کی مقبولیت' حتیٰ کہ ان کی ثروت کا دار و مدار باشندگان ہند پر ہی تھا۔ پھر بھلا وہ کب تک اپنے پردیسی حسب و نسب کو مایہ ناز بنائے رکھتے۔ تیسرے فیروز نے جود و سخا کے جوش میں آکر ایک علیحدہ محکمہ قائم کر دیا جس کا نام دیوان بندگان رکھا۔ اگر یہ بندگان التمش کے چہل گان کے مقابلہ کے ہوتے تو ممکن تھا کہ شاید ریاست کو کچھ فیض پہنچتا۔ مگر ان میں سب کے سب نو مسلم تھے اور وہ بھی ایسے" جو کہ بطور غلام کے جنگ و جدل میں گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ایسے لوگ کس قابل ہو سکتے تھے؟ اس کے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ فیروز نے ان غلاموں میں سے چیدہ چیدہ کے واسطے اعلیٰ قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا لیکن ـــــ
عاقبت گرگ زادہ گرگ شود۔

تیموری حملہ سے جو مغربی ہند کی سیاسیات میں تغیر و تبدل ہوا اس میں اہم ترین واقعہ تھا خاندان سید کا عروج۔ اس کا بانی مبانی خضر خاں تھا جس کی سیادت کی صحت کے ثبوت میں یحییٰ سہرندی نے متعدد واقعات پیش کئے ہیں۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد سید خضر خاں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ ایک ایسا گروہ بنائے کہ جس میں اس کے یار و مددگار شامل ہوں۔ سید ہوتے ہوئے بھی خضر خاں کی یہ ہمت نہ پڑی کہ پردیسیوں کو بلاتا۔ شاید موقع بھی نہ تھا۔ کیونکہ خراسان و فارس کے واسطے آل تیمور کی سرپرستی میں رہنا باعث فخر تھا۔ خضر خاں کوئی خود مختار سلطان نہ تھا۔ اس نے تو سلطان کا لقب بھی اختیار نہیں کیا وہ اپنے کو محض ایک تیموری حاکم تصور کرتا تھا۔ پھر بھلا پردیسی کیوں اس کے پاس آتے۔ چنانچہ اس کو ہندی نژاد لوگوں سے ہی ربط ضبط بڑھانا پڑا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اغلبا" وہ خود بھی ہندی ہی تھا۔ دہلی آنے کے بعد جن لوگوں کو اس نے ممتاز کیا ان میں سے چند نام ایسے ہیں جن کے ہندی ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں مثلاً ملک سروپ' ملک کالو' ملک داؤد' اختیار خاں وغیرہ۔ خضر خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔ بموجب قول مصنف تاریخ مبارک شاہی' امرا و ملوک وائمہ و سادات و قضات و ہرچہ کسے در عہد خدائگان مغفور خضر خاں از شغل و اقطاع و پرگلہ ودیہ و وظیفہ محدود تعین داشت برہمہ مقرر داشتن فرمود' مطلب یہ کہ

مبارک شاہ نے طبقہ امراء کے بنانے میں کوئی خاص تغیر نہیں کیا۔ اس کے بعد اس خاندان میں کوئی ایسا نہ ہوا جو کسی نئے طرز عمل پر کاربند ہونے کی ہمت بھی کرتا۔

سیدوں کے مقدر نے جب پلٹا کھایا تب لودیوں کا عروج ہوا۔ بہلول نے دوران ملازمت میں ہی اپنے ہم وطنوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا تھا۔ جس کی امداد سے حمید خاں کو اس نے ایسا دھوکا دیا کہ باید و شاید۔ حمید خاں کو خواب میں بھی یہ خیال نہ گذرا کہ جاہل افغان کسی وقت اس کی مشکیں کس لیں گے۔ قصہ کوتاہ اپنے ولی نعمت کو پیچ و تاب میں ڈال کر بہلول سلطان بن بیٹھا۔ مسند نشین ہوتے ہی اس نے اپنے ہم وطنوں کو پیاپے پیغام بھیجے کہ افغانوں کے واسطے سرزمین ہند میں نان و نمک کی کمی نہیں۔ اس خبر کا پہنچنا تھا کہ افغانوں کے دل بادل درہ سے اٹھ کر اس ملک پر چھا گئے' لودی' فرمونی' لوہانی' عیسیٰ خیل' کتاخیل' وغیرہ فرقوں کے لوگ آئے سلطان بہلول نے ان کی سرپرستی کی۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور تمام سلطنت کا کام انہیں کے سپرد کیا۔ چنانچہ لودی دور میں طبقہ امراء کی وہی ہیئت نظر آتی ہے جو کہ شمسی یا بلبنی عہد میں تھی۔ ان میں سے ہر فرد پردیسی تھا۔ ہر شخص جری اور حوصلہ مند۔ مرنے کٹنے کو تیار۔ وقتاً" فوقتاً" مالک کا وفادار۔ مگر ہر دم اپنی ذاتی شان و شوکت کا دلدادہ اور اس پر جان نثاری کے واسطے آمادہ۔

شمسی خاندان سے لے کر لودی عہد تک طبقہ امراء کے بنانے اور اس کی ہیئت میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کے بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً اس بات کا بھی اندازہ کر لیا جائے کہ ان لوگوں کا سیاسی امور پر کیا اثر پڑا۔ اچھے یہ سلطان اور امیروں کی طاقت میں ضدین کی نسبت تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ طاقتور ہوتا تھا اس زمانہ میں امیر کمزور ہوتے اور جب امیر طاقتور ہوتے تھے تو بادشاہ کمزور ہوتا تھا۔ امیروں کی طاقت کی پہلی مثال قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد نظروں کے سامنے آتی ہے لیکن چونکہ وہ لوگ اس وقت کی دو گروہوں میں تقسیم تھے اس لئے سیاسی امور پر ان کا کوئی دیرپا اثر نہ پڑ سکا مگر التمش نے جو طریقہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے نکالا وہ بالآخر بہت مفید ثابت نہ ہوا۔ وہی لوگ جن کو اس نے پستی سے اٹھا کر امیری کے درجہ تک پہنچایا تھا سلطان کی وفات کے بعد

اس بات کے در پے ہو گئے کہ تمام شاہی طاقت خود ہی غصب کر لیں۔ صاحب طبقات ناصری کے قول کے بموجب التمش نے مرتے وقت اپنے امراء و اکابر سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی رضیہ کو سلطان بنائیں گے۔ مگر مذہب اسلام کے مقلدین کو بھلا یہ کب گوارا تھا کہ ایک عورت کے سامنے اپنا سر جھکائیں قرون وسطی میں سیاسی اغراض کو پورا کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لینا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امیر لوگ قابل اور سمجھدار فرماں روا سے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی خود مختاری کے راستہ میں سد راہ بن جائے چنانچہ رضیہ کی مخالفت کی اصلی وجہ یہی تھی۔ لیکن بہ ظاہر امراء نے اپنی مخالفت کو مذہبی رنگ دے دیا۔ چنانچہ نظام الملک جنیدی کی ایماء سے جو کہ اس وقت طبقہ امراء کا سردار تھا' سلطان مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے رکن الدین فیروز کو وارث تاج و نگین قرار دیا گیا۔ اس کارروائی کی سیاسی نقطہ نظر سے خاص اہمیت یہ ہے کہ اب سے یہ طے ہو گیا کہ تخت و تاج کے متعلق حقوق کے فیصلہ کا جزوی و کلی اختیار امیروں کو حاصل ہے' ایسی فضا میں جب کہ بادشاہ محض ایک کھلونا بن گیا تھا یہ اصول دراصل نہایت ہی کار آمد تھا۔ لیکن وقت یہ آن پڑی کہ امیروں کے مابین بہت دنوں تک اتفاق رائے قائم رہنا دشوار تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ کس طرح سے اپنے ساتھیوں کو زیر کر کے ساری طاقت اپنے ہاتھ میں کر لے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبقہ امرا میں فرقہ بندی ہوئی اور وہ لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ جو فرقہ زور [illegible] تھا سلطان اسی کے قابو میں ہو کر کٹھ پتلی کی طرح ناچا کرتا تھا۔ لیکن کسی گروہ کا [illegible] زور رہنا غیر ممکن تھا۔ وجہ یہ کہ فرقہ بندی کی بنیاد تھی۔ خودغرضی' اور خود پسندی۔ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا امیر ہو جس میں کہ ایثار کا مادہ موجود ہو۔ پس چند روز تک تو نظام الملک جنیدی کی دھاک جمی رہی مگر بہت جلد خواجہ مہذب کی سرکردگی میں ایک مخالف پارٹی قائم ہو گئی جس نے کہ رضیہ کا ساتھ دیا۔ خواجہ مہذب کے بھی وہی حوصلے تھے جو نظام الملک کے' مگر اس کے بہ نسبت خواجہ شاید کچھ زیادہ ہوشیار تھا۔ اور اس نے ایسی چال چلی کہ رضیہ کو تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اب امیروں نے بہرام کو سلطان بنایا چونکہ یہ محض ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا اس لئے اس کے

مشورے کے واسطے ایک مجلسِ انتظامیہ قائم کی گئی۔ اس مجلس کا صدر تو وزیر خواجہ مہذب ہی تھا مگر اصلی اختیارات اختیارالدین اتیکین کو حاصل تھے۔ اپنے کروفر میں اضافہ کرنے کی غرض سے اتیکین نے سلطان کی مطلقہ بہن سے نکاح کیا وہ سہ گانہ نوبت بھی بجوانے لگا اور اس نے اپنے مکان کے دروازہ پر ایک ہاتھی باندھ لیا۔ اس کی اس فرعونیت سے اس کے دوست ناراض ہو گئے۔ بادشاہ نے ان کی صلاح سے اتیکین کو قتل کروا دیا۔ اس سانحہ کے بعد خواجہ مہذب کی طاقت دوبارہ بڑھ گئی۔ اس نے مکر و فریب سے تمام امیروں کو سلطان بہرام کی جانب سے بدظن کر دیا۔ اور انجام کار اپنے مالک کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ بہرام کے بعد تخت پر کس کو بٹھلانا چاہئے اس بات کا فیصلہ آسان نہ تھا۔ جب کہ خواجہ مہذب اور ان کے ساتھی اس اہم مسئلہ پر بحث کر رہے تھے ایک باحوصلہ اور دلیر امیر عزالدین بلبن کشلو خان موقع کو غنیمت جان کر محل شاہی میں جا کر سلطان بن بیٹھا تخت پر اس کا حق سلطان التمش کے داماد ہونے کے رشتہ سے تھا۔ لیکن التمش کی اولاد کے مقابلے میں دوسرے امیر کشلو خاں کے حقوق کو تسلیم کرنے کے واسطے تیار نہ تھے چنانچہ انہوں نے اس مرتبہ مسعود کہ سلطان بنایا مگر یہ لوگ اپنی خصلت و عادت سے مجبور تھے۔ بہت جلد مسعود سے بھی ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اس کے چچا ناصرالدین کو بہرائچ سے بلا بھیجا اور مسعود کو معزول کر کے اس دفعہ اسے بادشاہ بنایا۔ خوش قسمتی سے ناصرالدین کو بلبن جیسا وفادار اور ہوشیار وزیر مل گیا جس کی مدد سے 20 سال تک وہ سلطنت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں بھی ایک دفعہ امیروں نے سر اٹھایا اور سلطان کو اتنا ورغلایا کہ اس نے بلبن کو برخاست کر دیا اور عماد الدین ریحان کو اپنا معتمد اعلیٰ بنایا۔ لیکن عماد الدین سے وزارت کا کام چلائے نہ چلا۔ اس کے دوست اس سے برگشتہ ہو گئے اور ان کے کہنے سے سلطان نے بلبن کو اس کے عہدے پر بحال کر دیا اس کے بعد زندگی بھر اسی کی رائے سے فرائض منصبی کو انجام دیتا رہا۔ ناصرالدین کے بعد بلبن تخت نشین ہوا' اس نے پہلی اصلاح جس پر سب سے زیادہ زور دیا وہ طبقہ امراء کی روز افزوں طاقت کو کم کرنا تھا۔ اس کے واسطے اس نے جو سبیل اختیار کی وہ قابل ذکر ہے۔ اول تو اس نے چہل گان کے گروہ کو درہم برہم کر ڈالا۔ دوسرے اس نے سن رسیدہ و نیز کمسن امیروں کی جو کہ فوجی خدمت

انجام نہیں دے سکتے تھے پنشن مقرر کر دی۔ تیسرے اس نے نوجوان امیروں کی تنخواہ ان کی لیاقت کے بموجب تجویز کی۔ چوتھے اس نے چن چن کر کم اصل اور ناکارہ امیروں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ اس طرح سے بلبن نے طبقہ امراء کو پھر سے اس کے اصلی مرتبہ پر پہنچا دیا۔ اس نے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ امیر صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ سلطان کو مشورہ دیں اور اس کی اطاعت کریں۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی کام نہیں۔ جب تک وہ زندہ رہا کسی امیر کی ہمت نہ ہوئی کہ زبان سے کوئی بات نکالتا۔ فرقہ بندی کا خیال تو خواب میں بھی آنا محال تھا۔ مگر بلبن کے مرتے ہی پھر امیروں نے شاہی طاقت کو غصب کر لیا۔ اب ملک الامراء فخرالدین کے داماد نظام الدین کا ایسا زور بندھا کہ سلطان کو اس نے بالکل قابو میں کر لیا۔ اس کو دیکھ کر دوسرے امیر بہت برہم ہوئے۔ خاص کر وزیر سلطنت خواجہ خطیر کی ناراضگی کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی، بیکسی کے عالم میں اس نے سلطنت اور سلطان دونوں سے قطع تعلق کر لیا۔ اب ہر طرف نظام الدین ہی کی دھوم تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد اسے اپنے جگہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ نظام الدین کے بعد کاروبار سلطنت میں وہ ابتری پڑی کہ جس کا کچھ حساب نہیں۔ بگڑی ہوئی فضا کو سنبھالنے کی غرض سے سلطان نے جلال الدین سر جاندار کو سامانہ سے طلب کیا اور عرض ممالک کا عہدہ اس کے حوالے کیا۔ ابھی تک تو ترکی امیر آپس ہی میں برسرپیکار تھے مگر جلال الدین کی آمد سے ان کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عرض ممالک ان کی ہستی کو مٹا دے۔ چنانچہ آپس میں اتفاق کر کے ترکی امیروں نے یہ صلاح کی کہ چال بازی سے جلال الدین اور اس کے خلجی حوالی موالی کا قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن ان کا راز طشت از بام ہو گیا۔ بہت سے تو اس جماعت سے بھاگ نکلے اور انہوں نے جا کر جلال الدین سے رشتہ جوڑا۔ بقیہ نے حوصلہ کی خاطر اپنی جان گنوائی۔

جلال الدین فیروز خلجی ایک نہایت ہی سیدھا سادہ بادشاہ تھا۔ تاہم چونکہ اس نے تاج شاہی کو مکر و فریب سے حاصل کیا تھا اس لئے باشندگان دہلی اسے غاصب تصور کرتے تھے، کچھ دنوں تک وہ اس کی اطاعت سے منہ موڑے رہے۔ مگر ملک الامراء کے کہنے سننے سے انہوں نے اپنے خیالات کو بدل دیا۔ جب تک کہ دارالخلافت میں

سکون قائم نہ ہو گیا سلطان جلال الدین نے شہر نو یعنی کیلوکھری سے قدم باہر نہ نکالا۔ دہلی پہنچنے پر پہلے دولت خانہ میں گیا اور وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد وہ سلاطین ماضیہ کے تخت پر جلوس فرما ہوا۔ بعد ازاں وہ کوشک لعل کے طرف روانہ ہو جب پھاٹک پر پہنچا تو حسب دستور قدیم گھوڑے پر سے اتر پڑا۔ اس پر احمد چپ نائب باربک نے سوال کیا۔ خداوند عالم محل تو آپ ہی کا ہے پھر پھاٹک ہی پر آپ کیوں اتر پڑے؟' جلال الدین نے جواب دیا۔ 'اے احمد جو محل کہ میرے آبا و اجداد کا بنوایا ہوا ہو وہی میرا ہو سکتا ہے۔ یہ محل تو بلبن کا بنوایا ہوا ہے۔ میں نے تو اس پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے دراصل اس کی حق دار بلبن کی اولاد ہے' کیا ایسا بادشاہ جو اپنے کو ہر دم غلام و خدمتگار تصور کرتا ہو طبقہ امراء کو قابو میں رکھ سکتا تھا؟ چنانچہ بہت جلد یہ خبر مشتہر ہو گئی کہ جلال الدین بادشاہی کے قابل نہیں۔ ملک جھجو نے علم بغاوت بلند کیا۔ مگر آخر میں اس کو شکست ہوئی۔ باغی گرفتار کر کے سلطان کے روبرو پیش کئے گئے مگر اس نے ان سب کو رہا کر دیا' اس طرز عمل کو دیکھ کر امیروں کے دلوں سے اس کی رہی سہی عزت بھی غائب ہو گئی اور وہ علانیہ کہنے لگے کہ جلال الدین نکما آدمی ہے۔ ایک شب کو بہت سے امیر ملک تاج الدین کوچی کے مکان پر جمع ہوئے۔ شراب و کباب کے دور کے بعد عالم مستی میں بات چھڑی۔ ایک بولا کہ اے تاج الدین تاج شاہی کے شایاں تو ہی ہے نہ کہ سلطان جلال الدین۔ دوسرے نے کہا کہ خلجی لوگ امور سلطنت کے قابل نہیں اگر ان میں کوئی ہوشیار اور لائق ہے تو وہ احمد چپ ہے نہ کہ جلال الدین۔ سب کے سب نشہ میں چور تھے اور ہوا میں قلعے باندھ رہے تھے۔ اسی حالت میں سب امیروں نے مل کر تاج الدین کوچی کو سلطان منتخب کیا اور اس کے ساتھ بیعت بھی کر لی۔ اس کے بعد ایک ناعاقبت اندیش نے کہا کہ میں سلطان جلال الدین کو ایک ہی وار میں قتل کر دوں گا' سراغرسان موجود ہی تھے۔ انہوں نے جا کر سلطان سے تمام داستان مشرح و مفصل کہہ سنائی۔ جلال الدین نے سب امیروں کو طلب کیا اور ان پر لعن طعن کرنا شروع کیا' آخر میں وہ اتنا ناراض ہوا کہ اس نے اپنی کمر سے تلوار کھول کر امیروں کے سامنے پھینک دی اور کہا۔ 'اے بد مستو آپس میں تو خوب شیخی مارتے تھے اب تم میں سے کون ایسا جوانمرد ہے جو اس تلوار کو اٹھا کر وار کرنے کی ہمت کرے۔ اور کہاں

پیام کا اثر پڑا اس کا مشرح حال امیر خسرو نے لکھا ہے۔ بہرام ابیہ نے تو فوراً ہی اس کی تجویز کو منظور کر لیا مگر مغلطی کے پاس جب خط پہنچا تو وہ بہت بگڑا اور اس نے غازی ملک کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ جب مغلطی کے ان خیالات کی غازی ملک کو اطلاع ہوئی تو اس نے ملتان کے دوسرے سرداروں کو خفیہ طور پر اشارہ کیا کہ وہ امیر پر حملہ کر دیں۔ اس ہنگامے کا سرغنہ بہرام سراج تھا۔ مغلطی اپنے ماتحت سرداروں کی یورش سے جان چرا کر بھاگا مگر ایک نہر میں گر پڑا اور جان بحق تسلیم ہوا۔ محمد شاہ کے پاس جب قاصد پہنچا تو اس وقت سیوستان کے مقامی سرداروں نے اس کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی اور وہ قلعہ میں محصور تھا۔ لیکن غازی ملک کے خط کی وجہ سے باغیوں نے امیر سے صلح کر لی۔ عین الملک ملتانی نے در پردہ اپنی اعانت کا اظہار کیا لیکن بہ ظاہر خسرو خاں کا شریکِ حال رہا حتیٰ کہ غازی ملک کے پاس سے آئے ہوئے خط کو بھی خسرو خاں کو دکھلا دیا مگر سلمانہ کے امیر ملک یک لکھی نے مخالفت پر کمر باندھی۔ کہنے کا منشاء یہ ہے کہ تغلقی انقلاب کے بانی ملتانی امیر تھے اور انہیں کی ذاتی اجتماعی امداد سے غیاث الدین کو کامیابی نصیب ہوئی۔ عہد خلجی ختم اور دور تغلق شروع ہوا۔

محمد تغلق نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے پردیسیوں کا ایک نیا گروہ بنایا اور ان نئے امیروں کو سلطنت کا پشت و پناہ بنانے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے اقطاع اور جاگیریں ان لوگوں کو دیں اور وہ اسی امید پر کہ وہ سلطان کے مطیع اور منقاد رہیں گے۔ لیکن امیروں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ہر چہار جانب علم بغاوت کھڑا کیا' من می شنوم کہ ہر کہ بلغاک میکند از قوت امیر صدگان میکند و میر صدگان از برائے غصب و غارت یار اومی شوند' (p.503)۔ ان لوگوں کی چیرہ دستی سے عاجز آ کر محمد تغلق نے عزم کیا کہ وہ ان کی ہستی ہی کو مٹا دے۔ چنانچہ بہت سے بد اصل اور کمینہ لوگوں کو اس نے امیر بنایا مثلاً ملک سر دوا سندار' ملک مخلص الملک' ملک یوسف بغرا' عزیز خمار وغیرہ اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ امیران صدگان میں سے جو دولت آباد کے علاقہ میں تھے کسی کا بھی وجود روئے زمین پر باقی نہ ہے۔ عزیز خمار صوبہ مالوہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کو یہ ہدایت کی کہ دھار کے امیر صدگان کا جس طرح بھی ہو وہ کام تمام کر دے۔ دھار پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی عزیز خمار نے 80 امیران صد کو طلب کر بلا وجہ قتل کرا دیا۔

اس کی اس حرکت نے سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ زن کر دیا۔ دولت آباد و گجرات دونوں صوبوں میں فتنہ و فساد کی لہریں اٹھنے لگیں اور محمد تغلق کی آخری زندگی اسی بغاوت کے فرو کرنے میں صرف ہوئی۔ باغیوں کا پیچھا کرتے کرتے وہ سندھ پہنچا اور وہیں بعارضہ بخار انتقال کر گیا۔

فیروز تغلق کے زمانہ میں امیروں کی طاقت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا لیکن خان جہانی مقبول کی وجہ سے ان کی جانب سے کوئی شر ظہور پذیر نہ ہوا۔ مگر جب سلطان بڈھا ہو گیا اور خان جہان بھی اس دار فانی سے رحلت کر گیا اسی وقت سے بندگان نے اپنی طاقت کو آزمانا شروع کر دیا۔ وزیر مرحوم کا لڑکا جس کو کہ فیروز شاہ نے اس کے والد کا شغل و خطاب عطا کیا تھا اتنا مغرور و مطلق العنان ہو گیا کہ امور سلطنت با لکلیہ اسی کے ہاتھ میں آ گئے۔ تمام امیرو رئیس بھی اس کا دم بھرنے لگے۔ اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا تھا تو وزیر کسی نہ کسی حیلہ سے اس کی جان لے لیتا تھا۔ اب اس نے اس امر کی کوشش کی کہ سلطان اور اس کے لڑکے محمد خاں کے درمیان ناچاقی پیدا کرا دے چنانچہ یہ کہہ کر کہ شہزادہ چند امیروں کی اعانت سے بہت جلد فتنہ بپا کرنے والا ہے وزیر نے فیروز تغلق سے اس بات کی اجازت حاصل کر لی کہ وہ محمد خاں اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لے۔ جب شہزادے پر یہ عقدہ کھلا تو وہ از حد پریشان ہوا اور اس نے خفیہ طریقہ پر اپنے والد کے پاس جا کر وزیر کی زیادتی کا حال کہہ سنایا۔ فیروز نے اس دفعہ محمد خاں کو حکم دے دیا کہ وہ جا کر وزیر کو گرفتار کر لے۔ یحیٰی سرہندی لکھتا ہے۔ "ملک یعقوب اخور بیگ اسپان پائگاہ را بتمام و ملک قطب الدین فراموز شحنہ پیل ہمہ پیلان را باعماری و برگستوان بر شاہزادہ آوردند۔ بندگان فیروز شاہی و امرائے دیگر و خلق شہر نیز پیشترے باو یار شدند" یہ اول موقع تھا جب کہ سیاسی امور میں بندگان فیروزی نے حصہ لیا۔ اب ان کو اپنی طاقت کا احساس ہو گیا۔ اور وہ متواتر سیاسی چالوں میں دلچسپی لینے اور بازی لگانے لگے جب محمد شاہ تخت پر بیٹھا تب کہیں جا کر بمشکل تمام بندگان فیروزی کی طاقت کا خاتمہ ہوا۔ اس سلطان نے ان لوگوں کے تمام ہاتھی ضبط کر لئے اور ان کو بالکل ہی بیکار کر دیا۔ مگر غلاموں کے پسپا ہو جانے کے بعد بھی امیروں کا زور کم نہ ہوا۔ وہ جس کو چاہتے تھے اسی کو سلطان بناتے تھے صرف خیال اتنا رکھتے تھے

ہے وہ شخص جو مجھ سے زور آزمائی کرے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں وہ آئے تو میرے سامنے' بادشاہ کے ان کلمات کو سن کر سب امیر دم بخود رہ گئے۔ لیکن ملک نصرت صباح نے جرات کر کے زبان کھولی اور کہا۔ 'خداوند عالم آپ کو معلوم ہے کہ حالت بے خودی میں لوگ کیسی دور کی ہانکتے ہیں۔ ورنہ ہم لوگ آپ کے واسطے ویسے ہی ہیں جیسے کہ آپ ہم لوگوں کے واسطے۔ آپ نے تو ہماری پرورش اپنے اولاد کی طرح کی ہے۔ پھر بھلا کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہماری جان لے لیں گے؟ ہم لوگوں کو آپ کی طرح حلیم و کریم بادشاہ کہاں ملے گا اور ہماری طرح آپ کو امیر ملک کہاں ملیں گے۔' اس خوشامدانہ تقریر کو سنتے ہی بادشاہ کا سارا غصہ کافور ہو گیا اس نے شراب منگوائی خود پی اور نصرت صباح کو پلائی۔ دیگر امراء کو ان کے اقطاعوں پر روانہ کر دیا۔ اور ایک سال ان کو دہلی آنے سے منع کر دیا۔ کیا اس طرح کے برتاؤ سے امیر سلطان کے تابع و مطیع رہ سکتے تھے؟ چنانچہ ان میں سے بہتوں نے علاء الدین کا ساتھ دیا۔

مقتضائے وقت کا لحاظ کر کے علاء الدین نے پہلے تو جلالی امیروں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ لیکن جیسے ہی اس کی پریشانیاں کم ہوئیں اس نے تیغ انتقام سے ان بد بختوں کا کام تمام کیا۔ بعد ازاں کچھ دنوں تک تو وہ امرائے قائم کا پاس کرتا رہا۔ لیکن اکت خاں' ملک عمر' منگو خاں اور حاجی مولا کی بغاوتوں کے بعد علاء الدین کو یہ جستجو ہوئی کہ آخر ان سازشوں کی وجہ کیا ہے' اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کرنے کے واسطے اس نے مجلس خاص میں ملک حمیدالدین' ملک اعزاء الدین' ملک عین الدین ملتانی وغیرہ جہاندیدہ امراء کو طلب کیا۔ بہت غور و خوض کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ فتنہ و فساد کے چار وجوہات ہیں۔ اول معاملات نیک و بد کے جانب سے ان کی بے اعتنائی دوسرے شراب۔ تیسرے امراء کے درمیان ربط ضبط اور قرابت دلہی۔ چوتھے زر یعلی فارغ البالی۔ مختصر یہ کہ علاء الدین کے ذہن نشین یہ بات ہو گئی کہ طبقہ امراء کی ترتیب میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے اس امر کی کوشش بلیغ کی کہ اقطاعداری کے دستور کو یک قلم منسوخ کر کے امراء کی طاقت کی جڑ ہی کاٹ دی' اس کے علاوہ اس نے متعدد احکام بھی جاری کئے جن کی رو سے نہ تو امیروں کو ایک دوسرے کے یہاں آمدورفت کی آزادی تھی اور نہ بلا حکم سلطانی آپس میں ازدواجی رشتہ قائم کرنے

کی اجازت، محکمہ خفیہ کی نگرانی سے وہ اتنے خائف رہتے تھے کہ اپنے گھروں میں بھی باآواز بلند گفتگو کرنے سے گھبراتے تھے۔ علاء الدین نے ان پر وہ رعب جمایا کہ بیان سے باہر ہے۔ کچھ دنوں کے واسطے بلوہ کا نام تک صفحہ سیاست سے مٹ گیا۔ اور ملک میں ہر چار سو سکون ہی سکون نظر آنے لگا مگر طبقہ امراء کی زبونی سے سلطنت کے کسی پائدار نفع کی امید کرنا لغو تھا۔ تجربہ کار و ہوشیار امیر اپنی عزت بچانے کے خیال سے سلطان کے اردگرد پھٹکتے بھی نہ تھے وہ رکن سلطنت بن کر رہنا چاہتے تھے نہ کہ غلام سلطانی لا محالہ چاپلوس اور بد اصلوں کی بن آئی۔ علاء الدین کے زمانے میں طبقہ امراء کی ساخت و پرداخت میں جو تدریجی زوال ہوا اس کا صاف اندازہ ضیاء الدین برنی کی تحریر سے ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دور میں یکے بعد دیگرے امیروں کے تین گروہوں نے سلطنت کا کام سنبھالا۔ اول گروہ میں تھے الغ خاں، نصرت خاں، ظفر خاں، الپ خاں، ملک علاء الملک، ملک فخرالدین جونا، ملک اصغر، ملک تاج الدین وغیرہ۔ یہ ایسے لوگ تھے جو بادشاہ کی عزت تو کرتے تھے مگر صاف بیانی سے گریز نہ کرتے۔ دوسرے گروہ میں تھے ملک حمید الدین، ملک اعزالدین، ملک عین الملک ملتانی، ملک شرف قائینی، خواجہ حاجی وغیرہ۔ یہ لوگ بھی قابل تھے مگر اتنے صاف گو اور خود مختار نہ تھے جیسے کہ اول گروہ والے۔ تیسرے گروہ میں تھے ملک نائب کافور، ملک بہاء الدین، ملک قیران، ملک قیرا بیگ وغیرہ جن کو نہ تو امور ملکی میں دخل تھا اور نہ ان میں سمجھ اور دانائی ہی تھی۔ ان کا شیوہ تھا خود پرستی اور سلطان کی ہاں میں ہاں ملانا۔ علاء الدین کے بیمار پڑتے ہی ان لوگوں نے پیر پھیلانا شروع کر دیا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ کافور نے سلطان کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔

قطب الدین مبارک کے عہد میں امراء کی طاقت میں از سر نو اضافہ ہوا۔ لیکن خسرو خاں کی تخت نشینی کے قبل ان کے درمیان کوئی خاص اتحاد و یگانگت قائم نہ ہو سکی۔ اس ظالم بادشاہ کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر غازی ملک نے حاکم ملتان، محمد شاہ اور حاکم سیوستان، بہرام ابیہ حاکم اچھ، امیر ہوشنگ حاکم، اور عین الملک ملتانی، ملک یک لکھی وغیرہ کو خطوط لکھے جس میں اس نے امیروں کو خسرو خاں کے بادشاہ ہو جانے پر غیرت دلائی اور ان کو جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ ان امراء پر غازی ملک کے نامہ و

کہ ان کی کٹھ پتلی کا تعلق فیروزی خاندان سے ہو۔ چنانچہ غیاث الدین ثانی بندگان فیروزی کی امداد سے سلطان بنا۔ لیکن ان کا کیا اعتبار تھا کچھ ہی عرصہ بعد یہ لوگ رکن الدینب خندہ نائب وزیر سے جا ملے۔ انہوں نے غیاث الدین کو قتل کر کے ابوبکر کو تخت پر بٹھلایا۔ پھر بہت جلد اس سے بھی برگشتہ ہو گئے۔ اور اسے تخت سے اتار دیا۔ اس نے بھاگ کر کوٹلہ بہادر میں پناہ لی۔ مسلمانوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ "کفار ہندوستان قوت گرفتند و دست از اداے جزیہ و خراج باز کشیدند و قصبات مسلمانان را نصب می کردند۔" کچھ دنوں تک بہادر ناہر ابوبکر کی طرف سے لڑتا رہا لیکن شکست فاش کھانے کے بعد اس نے محمد شاہ کی اطاعت قبول کرلی۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا دوسرا لڑکا علاء الدین سکندر شاہ تخت پر بیٹھا لیکن دو ماہ کے اندر ہی اندر وہ رحلت کر گیا۔ اس کے مرنے پر ناصر الدین مسعود شاہ سریر آرا ہوا۔ اب تغلقوں کی سلطنت کا دائرہ بہت ہی تنگ ہو گیا تھا مگر محمود شاہ سلطان ہند ہی کہلاتا تھا۔ اس کی تمام عمر اپنے امیروں سے ہی لڑتے گذری۔ ہر امیر اپنے اپنے اقطاع میں خود مختار ہو گیا تھا اسی واسطے اس زمانہ کو عہد طوائف الملوکی کہتے ہیں۔ مقرب خاں' ملو اقبال خاں وغیرہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔

رایات اعلیٰ خضر خاں نے پنجاب اور دہلی دونوں کو اپنے ماتحت کر لیا۔ مگر دو آب وغیرہ کے لوگوں نے اس سے سرتابی کی۔ سرہند میں بھی بیرم خان مرحوم کے عزیز و اقربا نے فتنہ انگیزی کی۔ اب ان کا سرغنہ ملک تغان تھا۔ اس نے ایک عرصہ تک سرکاری افسروں کو تنگ کیا۔ بداؤں کے اقطاعدار مہابت خاں نے بھی رایات اعلیٰ کے خلاف سازش کی اور اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی ورغلایا۔ اس طرح وقتاً" فوقتاً" امیر و کبیر خضر خاں کو آزار پہنچاتے رہے۔ جب سید معزالدین مبارک شاہ کی تخت نشینی کی باری آئی تو اس کو بھی انہیں دقتوں کا سامنا ہوا جو کہ اس کے والد کو پیش آئی تھیں۔ سرورالملک کے کہنے سے اس نے بہت سے حاکموں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ کیا مثلاً سکندر تحفہ کو عہدہ وزارت سے معزول کر کے وہ جگہ سرورالملک کو دی اور اس کے بیٹے کو دہلی کا حاکم بنایا۔ سکندر تحفہ کو لاہور بھیجا۔ اور محمود حسن کو جلندھر۔ ان تبدیلیوں سے امراء کے درمیان ایک شورش پیدا ہوئی۔ بالآخر انہوں نے مل کر

سلطان کو قتل کر ڈالا۔ اس کام میں سب سے نمایاں حصہ سرور الملک نے لیا۔ سلطان مبارک کے قتل کے بعد امیروں نے اس کے بھتیجے کو تخت پر بٹھلایا۔ اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح سے سرور الملک کی طاقت کو تہ و بالا کر دیں چنانچہ ایک عرصہ تک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ محمد شاہ بظاہر سرور الملک کے ساتھ تھا لیکن خفیہ طور سے اس کے دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ جب سرور الملک کو یہ پتہ چلا تو اس نے سلطان کو تلوار کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی مگر وہ ناکامیاب رہا اور خود مقتول ہوا۔ محمد شاہ نے کمال الدین کو وزیر بنایا۔ ملک چمن کو غازی الملک کا خطاب دے کر امروہہ و بداؤں اس کے سپرد کئے۔ الہاد لودی کے بھائی کو دریا خاں کا خطاب دیا اور حصار کا اقطاع ملک خوبراج کو دیا اور حسام خاں کو دارالخلافت کا حاکم مقرر کیا۔ یہ انتظام کر کے سلطان عیش و عشرت کا شکار ہو گیا۔ ادھر تو سرہند کے نئے حاکم بہلول لودی نے پنجاب میں اپنا سکہ جمانا شروع کیا دوسری طرف دہلی کے امیروں نے یہ دیکھ کر کہ بادشاہ تو امور حکومت میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتا ہے محمود خلجی والی مالوہ کو دعوت دی کہ وہ آ کر تخت دہلی پر رونق افروز ہو۔ محمود کو بھلا کیا عذر ہو سکتا تھا۔ ایک جرار فوج لے کر دہلی پر چڑھ آیا۔ سید محمد شاہ نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بہلول لودی سے امداد طلب کی۔ بہلول نے اس شرط پر مدد دینا قبول کیا کہ سلطان حسام خاں کو قتل کرا دے۔ محمود خلجی کی واپسی کے بعد محمد شاہ نے بہلول کو بہت کچھ مال انعام و اکرام میں دیا۔ محمد شاہ کے بعد جب عالم شاہ تخت پر بیٹھا تب امراء تمام ملک پر قابض ہو چکے تھے۔ لاہور و پنجاب بہلول کے زیر تصرف تھے۔ سنبھل دریا خاں لودی کے قبضہ میں تھا اور اسی طرح سے اور اضلاع بھی امیروں نے غصب کر لئے تھے۔ یہاں تک کہ عالم شاہ نے جب دیکھا کہ دہلی میں بھی رہنا دشوار ہے تو وہ بھاگ کر بداؤں میں جا بسا۔ دہلی میں حسام خاں اور حمید خاں اپنی من مانی کرنے لگے۔

بہلول لودی کے عہد میں افغانی امیر سلطان کے مطیع و منقاد رہے وجہ یہ کہ وہ ان کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا تھا اور کبھی بھی ان پر رعب غالب کرنے کی کوشش نہ کرتا' اس کو اپنے امیروں کی رضا جوئی اس قدر منظور تھی کہ دعوت کے وقت نہ تو وہ خود تخت پر بیٹھتا اور نہ امیروں کو کھڑا ہی رہنے دیتا۔ دربار عام کے موقع پر بھی وہ محض

ایک قالین پر بیٹھ جاتا تھا۔ صاحب تاریخ داؤدی رقم طراز ہے کہ فرامین میں وہ امیروں کو مسند اعلیٰ کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ اگر کسی وقت کوئی امیر سلطان سے رنجیدہ ہو جاتا تو بہلول ہر طریقہ سے اس کی دل جوئی کرتا تھا۔ وہ اس کے گھر جاتا اور کمر سے اپنی تلوار کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی کرتا کہ اپنی پگڑی اتار کر امیر کے سامنے رکھ دیتا اور معافی مانگتا اور کہتا کہ "اگر آپ مجھے اس عہدے کے قابل تصور نہیں کرتے تو کسی اور کو منتخب کر لیجئے اور مجھے کوئی اور شغل دے دیجئے" اتنے عجز و انکسار کو دیکھ کر بھلا کس امیر کا ایسا کڑا دل ہو سکتا تھا جو نہ پسیجتا۔ ایسے سیدھے سلطان کے خلاف بغاوت کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن یہ بات خیال رکھنا چاہیئے کہ بہلول نے یہ طرز عمل مقتضائے وقت کو مد نظر رکھ کر اختیار کیا تھا۔ بذات خود نہ تو وہ کمزور ہی تھا اور نہ بد عقل۔ بات یہ تھی کہ اس کو اس وقت اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے ہم وطنوں کی امداد سے اپنے پایہ کو مضبوط و مستحکم بنا لے لیکن آئندہ چل کر یہ طرز عمل سلطنت کے واسطے ضرر رساں ثابت ہوا۔ جب بہلول گوالیر سے اٹاوہ ہوتا ہوا دہلی کی جانب واپس لوٹتا تھا تو سکیٹ کے مقام پر سخت بیمار ہو گیا۔ اس کی خراب حالت کو دیکھ کر امیروں نے سازش شروع کر دی۔ سلطان نے تو یہ انتظام کیا تھا کہ اس کی وفات کے بعد تخت و تاج کا وارث اس کا دوسرا لڑکا نظام خاں ہو۔ مگر افغانی امیروں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ نظام خاں چونکہ ایک سنارن کے بطن سے پیدا ہے اس لئے وہ تخت شاہی کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک تو امیروں کے درمیان اتفاق تھا مگر اس بات کا فیصلہ کرنا کہ پھر کون وارث ہو گا محال تھا چنانچہ طبقہ امراء تین گروہوں میں منقسم ہو گیا۔ اول تو وہ جو نظام خاں کے طرفدار تھے دوسرے وہ جو باربک شاہ والی جونپور کی حمایت کر رہے تھے اور تیسرے وہ جو کہ اعظم ہمایوں کے حقوق پر زور دے رہے تھے' اس بنا پر کہ وہ سلطان کے سب سے بڑے لڑکے کا لڑکا تھا۔ کہنے کا منشاء یہ ہے کہ موقع پاتے ہی امیروں نے خود غرضی اور خود پرستی کی روش اختیار کی۔ خوش قسمتی سے سکندر اتنا ہوشیار اور سمجھدار تھا کہ اس نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے امیروں کو اپنے ہاتھ میں رکھا اگرچہ اس مین شک نہیں کہ اس نے ان کے حقوق میں بہت کچھ کمی کر دی اور یہ بات بھی ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ سلطان کی اطاعت کرنا

ان کا فرض ہے۔ اور اب برادرانہ سلوک کا زمانہ نہیں رہا۔ تاہم جہاں تک ممکن تھا اس نے بلا وجہ امیروں کو ناراض نہیں کیا۔ مگر امیر اپنی خصلت جبلی سے باز نہ آئے۔ سلطان کے خلاف انہوں نے سازش بھی کی اور اس کو تہ تیغ کرنے کا انتظام بھی کیا۔ لیکن سکندر ہر وقت آنکھ کھول کر کام کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ عرصہ دراز تک کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ اسی کے عہد سے یہ رسم جاری ہوئی کہ کچھ معتمد امیر باری باری سے محل شاہی پر شب کو پہرا دیا کریں۔ امیروں کو ہوش میں رکھنے کی یہ نہایت ہی عمدہ تدبیر تھی۔ اس سے ان کو ہر وقت اس بات کا احساس ہوتا رہتا تھا کہ ان کا اصلی رتبہ کیا ہے۔

سکندر کی وفات کے بعد جب ابراہیم تخت نشین ہوا تو ایک بار پھر امیروں نے اس بات کی کوشش کی کہ خاندان شاہی میں خانہ جنگی کے بیج بو دیں۔ انہوں نے نئے سلطان کو رائے دی کہ وہ جونپور اپنے بھائی جلال خاں کے حوالہ کر دے۔ ابراہیم راضی ہو گیا۔ اور جلال خاں معہ کچھ امیروں کے جونپور چلا بھی گیا۔ مگر راپری کے حاکم خان جہاں نوحانی نے اس کارروائی کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے درباری امیروں کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور ابراہیم کو رائے دی کہ جلال خاں کو واپس بلا لے۔ مگر چڑیا اب پنجرے سے اڑ گئی تھی۔ جلال خاں بھلا کیوں واپس آتا۔ اور شاید آ بھی جاتا تو امیر اسے کب آنے دیتے۔ چنانچہ ابراہیم کا بہت سا قیمتی وقت اس جونپور والے ہنگامہ کے فرو کرنے میں صرف ہوا وہ امیروں کی جانب سے بد ظن ہو گیا اور اس نے ان کو پسپا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کیا۔ دربار میں وہ انہیں کھڑا رکھتا تھا۔ اور طرح طرح سے انہیں ذلیل و خوار کرتا تھا۔ بہتوں کو اس نے قید کر لیا اور انہیں قتل کروا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر سرکش ہو گئے اور انہوں نے ہر طرف شورش بپا کی۔ اعظم ہمایوں کوری دریا خان نوحانی' میاں حسن قرملی' ناصر خاں نوحانی' وغیرہ نے بغاوت کی آگ کو بھڑکایا۔ ادھر پنجاب میں دولت خاں لودی نے سلطان کی درشت خوئی سے بچنے کے لئے بیرونی امداد حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ دور سلطنت کا یہ آخری سیاسی انقلاب تھا جس کے بانی امیر تھے اور جس کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ایک نئے عنوان سے ہوتا ہے۔

اس مجمل تبصرہ سے طبقہ امراء کی سیاسی اہمیت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ہستی امور ملکی کے واسطے کتنی ضروری تھی۔ کتنا ہی ہوشیار اور ذی فہم بادشاہ کیوں نہ ہو مگر بلا صلاح و مشورہ کے اس واسطے سلطنت کا کام چلانا غیر ممکن تھا۔ بلبن، علاء الدین خلجی، محمد تغلق ایسے مطلق العنان فرمانرواؤں کو بھی مشورے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک شخص کے واسطے تن تنہا مشکل تھا کہ نظام حکومت کی ہر ایک بات کو ذہن میں رکھ سکے۔ دوسرے اتنی بڑی سلطنت کے انتظام کے واسطے حکام و عہدہ داران چاہئے تھے۔ سلطان انہیں لوگوں کو اعتبار کر سکتا تھا جن کو اس کا قرب حاصل تھا اور جن کو قرب حاصل تھا، ان کا شمار دائرہ امارت میں کیا جاتا تھا۔ پس اگر سلطنت کو ایک جثہ انسانی سے تشبیہ دی جائے تو سلطان بمنزلہ حرارت غریزی ہے اور امیر اس کے اعضاء۔ جب تک کہ جسم کے ان دونوں حصوں میں ٹھیک تناسب قائم رہتا تھا امور سلطنت باآسانی انجام پاتے رہتے تھے۔ لیکن ان میں سے اگر کسی میں بھی فرق پڑ جاتا تو سیاسی فضا میں ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ حرارت کے بڑھنے اور گھٹنے دونوں حالتوں میں تمام اعضاء بیکار ہو جاتے تھے۔ یعنی یہ کہ اگر سلطان بالکل ہی امیروں کی پروا نہ کرتا تب بھی سلطنت کو نقصان پہنچ جاتا تھا کیونکہ انتہا درجہ کی مطلق العنانی سے سوائے ضرر کے نفع کی کم امید ہوتی ہے یا اگر سلطان امیروں پر ہی سلطنت کا سارا بار ڈال دیتا اس حالت میں بھی نفع کے بجائے نقصان ہی ہو جاتا تھا پس حکومت کے ان پرزوں کو کارآمد رکھنے کے لئے سلطان کو نہایت ہی دور اندیشی و دانشمندی سے کام لینا پڑتا تھا۔ لیکن کوئی خاندان تابہ ابد قائم نہ رہ سکتا تھا اس لئے ایسے قابل لوگوں کی بھی وقتاً" فوقتاً" ضرورت پڑتی رہتی تھی جو موجودہ خاندان کی تباہی کے بعد ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈال سکیں۔ عہد سلطنت کے امیروں نے اس کام کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ پس اگر ان کے کئے ہوئے انقلابات کے برے پہلو ہیں تو اچھے بھی ہیں۔

طبقہ امراء کی سیاسی حیثیت و قدرت پر بحث کرنے کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ روشنی اس کے اقتصادی و معاشرتی حالات پر بھی ڈالی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ امیروں کے پاس روپیہ کثرت سے ہوتا تھا۔ ممالک غیر سے لوگ آتے ہی

اس لالچ سے تھے کہ ہندوستان میں خوب زر اندوزی کریں گے۔ دوسرے عہد سلطنت کے آغاز میں فرمانرواؤں نے ملک کو تسخیر کرنے کی ایک عجیب و غریب ترکیب سوچی تھی' وہ یہ کہ جب کوئی سردار افغانستان وغیرہ سے آتا تھا تو اس کے حوالہ کوئی غیر مسخر علاقہ کر دیا جاتا تھا۔ اس کو پوری آزادی رہتی تھی کہ کسی طرح سے بھی اس پر قبضہ کر لے' جو کچھ مال غنیمت اس کے ہاتھ لگے تو وہ سب اپنے پاس رکھے' کبھی کبھی اس میں سے تھوڑا بہت بطور تحفہ سلطان الوقت کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ اختیارالدین بن بختیار خلجی کے کارنامے اس رویہ کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایسے سرداروں سے صرف اتنی ہی امید کی جاتی تھی کہ وہ سکہ و خطبہ سلطان کے ہی نام کا ملک مفتوح میں جاری رکھیں۔ دوسرے ہندوؤں کی سرکشی کو دور کرنے کے واسطے سلاطین کو متواتر جنگ کرنا پڑتی تھی۔ دوران جنگ میں دشمنوں کے مال و جائداد کو چھین لینا قطعاً" جائز تھا۔ امراء کی آمدنی کا یہ دوسرا ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ امراء کی اصلی آمدنی اقطاع و شغل سے ہوتی تھی۔ ہر ایک بڑے امیر کے تعلق سلطنت کے کسی نہ کسی شعبہ کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔ اس شعبہ کی آمدنی کا کچھ حصہ تو وہ خزانہ عامرہ کو بھیج دیتا تھا اور بقیہ یا تو اپنی فوج پر صرف کرتا تھا یا اس کو اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ اس عہد میں سرکاری عہدہ داران کی کیا تنخواہ تھی؟ اس کا مسلسل اندازہ کرنا تو ممکن نہیں لیکن مورخین نے وقتاً" فوقتاً" جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان سے کچھ موٹے موٹے نتائج ضرور نکالے جا سکتے ہیں۔ مثلاً التمش نے ملک سیف الدین ایبک کو سر جامداری کی جگہ پر متعین کرتے وقت اس کی تین لاکھ جیتل تنخواہ مقرر کی۔ مگر سیف الدین کو اس سے اطمینان نہ ہوا جب التمش کو یہ معلوم ہوا تو اس نے سیف الدین سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ سیف الدین نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا' جہاں پناہ آپ نے فدوی کو ایسے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز کیا ہے کہ جہاں رہ کر ہندو و مسلم رعایا کو زر اندوزی کی غرض سے ستانا غیر ممکن ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر شان و شوکت قائم رکھنے کی ہے نہیں' جلال الدین فیروز خلجی نے جوش سخاوت میں آ کر ایک مندھر کے لڑکے کو وکیل در مقرر کیا اور اس کی تنخواہ ایک لاکھ جیتل۔ جب کہ جلال الدین نائب سامانہ اور مقطع کیتھل تھا اس وقت ایک بار اس مندھر کے والد سے اس کا مقابلہ آن پڑا۔

مندھر کی تلوار سے جلال الدین کے چہرہ پر ایسے زخم کاری لگے جن کا کہ نشان تمام عمر رہا۔ چنانچہ اس مندھر کی جلاوت کا خیال کر کے جلال الدین نے اس کے لڑکے کو مورد عنایات کیا۔ صاحب مسالک الابصار نے محمد تغلق کے عہد کے عہدہ داران کی تنخواہ کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً اس کے چاروں وزیر بیس سے لے کر چالیس ہزار تنکہ سالانہ تنخواہ پاتے تھے۔ دبیران خاص کی تنخواہ دس ہزار تنکہ سالانہ تھی۔ اور کچھ کی تنخواہ پچاس ہزار تنکہ تک ہوتی تھی۔ صدر جہاں اور شیخ الاسلام کو ساٹھ ہزار تنکہ سالانہ ملتے تھے۔ اور محتسب کو ایک گاؤں ملا ہوا تھا جس کی آمدنی آٹھ سو تنکہ تھی۔ خان کی تنخواہ 2 لاکھ تنکہ ہوتی تھی۔ اس میں سے اسے کچھ بھی فوج پر صرف نہ کرنا پڑتا تھا۔ ملک کی تنخواہ پچاس ساٹھ ہزار ٹنکہ کے درمیان ہوتی تھی اور امیر کی تیس چالیس ہزار کے درمیان۔ سپہ سالار کی تنخواہ تقریباً بیس ہزار تنکہ_ دیگر حکام کی ایک ہزار سے لے کر دس ہزار تک۔ مملوک پانچ سو تنکہ سالانہ پاتے تھے۔ یہ تنخواہ ان کو نقد دی جاتی تھی۔ اغلب ہے کہ شہاب الدین کے بیان میں مبالغہ ہو۔ لیکن ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ جب محمد تغلق نے خداوند زادہ ضیاء الدین کو میرداد مقرر کیا تو اس کو پچاس ہزار دینار سالانہ کی جاگیر بھی عطا کی۔ خود ابن بطوطہ کو پہلے پہل پانچ ہزار کی جاگیر ملی۔ اس کے بعد اس کی تنخواہ بارہ ہزار دینار سالانہ ہو گئی۔ سراج عفیف لکھتا ہے کہ فیروز شاہ نے اپنی وزیر خان جہاں کی تیرہ لاکھ تنکہ تنخواہ مقرر کی اور اس کے امیروں میں سے کسی کی بھی تنخواہ چھ یا آٹھ لاکھ تنکہ سے کم نہ تھی۔ چنانچہ اس عہد میں جتنے خان اور ملوک تھے سب ہی روپیہ سے مالا مال تھے۔ جب ملک شاہین شحنہ و نائب امیر مجلس خاص نے انتقال کیا اور اس کے مال متروکہ کی جانچ کی گئی تو پچاس لاکھ تنکہ نقد علاوہ دیگر جواہرات و نفائس کے ملے۔ اسی طرح سے عماد الملک بشیر سلطانی کے بارے میں عفیف نے لکھا ہے کہ اس کے پاس کروڑوں روپیہ تھا۔ ایک بار اس کو تنت کی تھیلیاں بنوانے کی ضرورت پڑی تو ڈھائی ہزار تنوں کا تنت خرید کیا گیا۔ جب عماد الملک کے سامنے روزانہ کا حساب پیش ہوا تو اس نے اس رقم پر اعتراض کیا اور کہا جبکہ خزانہ زیادہ ہو گیا ہے تو اس کو تھیلوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں اس کو کھیتوں میں غلہ کی طرح بھر دینا چاہئے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ عہد لودی میں ایک امیرؒ میاں محمد کالا پہاڑ کے

پاس 300 من سونا تھا۔ زمانہ سلطنت میں اس قسم کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں جن سے کہ امیروں کی امیری میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے۔

لیکن یہ امیر جتنے روپیہ کے امیر تھے اتنے دل کے بھی تونگر تھے چونکہ ان کی تمام دولت و جائداد ذاتی ہوتی تھی اس واسطے اس کو کفایت شعاری کا مطلقاً خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسرے اپنی شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے ان کو لازم تھا کہ وہ فراخ دلی سے خرچ کریں۔ بلبنی امیر ملک علاء الدین کشلید خاں کے بارے میں روایت ہے کہ جود و بذل میں یکتائے روزگار تھا۔ اس وقت خواجہ شمس معین بقید حیات تھا اس نے ایک نظم علاء الدین کی مدح میں لکھی اور درگاہ بلبنی کے مطربوں کو یاد کرا دی ہے۔ جب وہ پڑھی گئی تو علاء الدین نے اپنے اصطبل کے تمام گھوڑے شمس معین کو بطور انعام کے دے دیئے اور مطربوں کو دس ہزار تنکہ دیئے۔ اسی زمانہ میں ایک اور ملک تھا جس کا نام تھا عماد الملک راوت عرض۔ اس کے ساتھ کچہری کے 50 یا 60 اہلکار روز کھانا کھاتے تھے۔ اس کو پان کھانے کی اتنی عادت تھی کہ پچاس یا ساٹھ تنبولی ہر وقت پان لگانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ تیسرے ملک فخرالدین کوتوال دہلی کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے یہاں دس بارہ ہزار قرآن خوان ملازم تھے۔ وہ ہر روز ایک نیا جوڑا پوشاک کا پہنتا تھا اور اترے ہوئے لباس کو انعام میں دے دیتا تھا اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی چارپائی اور بسترے بھی روز نئے ہوتے تھے۔ ہر سال ہزاروں لڑکیوں کے واسطے جہیز فراہم کرتا تھا۔ ایسے ہی بلبنی دور میں ایک اور امیر تھا جس کا نام امیر علی سرجاندار تھا امیر خسرو اسی کے پاس ملازم تھا۔ یہ امیر سو تنکہ سے کم کبھی کسی کو دیتا ہی نہ تھا۔ لفظ جیتل تو اس کی زبان سے نکلتا ہی نہ تھا اس کی سخاوت کی خبر سن کر بلبن کو بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ایک بار بادشاہ نے اس کو طلب کیا اور کہا۔ اے امیر علی میں نے سنا ہے کہ تو شراب کے نشہ میں ہو کر اتنی دریا دلی سے دولت لٹاتا ہے۔ ماننے کی تو جب بات ہے کہ اگر تو ہوش و حواس کے عالم میں کسی کو کچھ دے۔ یہ سنتے ہی امیر علی نے شراب سے توبہ کرلی لیکن اپنی سخاوت میں ذرا بھی کمی نہ کی بلکہ اس میں افزائش ہی کی۔ برنی لکھتا ہے کہ بلبن کے زمانہ میں اس کے امیروں کے درمیان حسد نہ تھا بلکہ اگر ایک کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں کے یہاں پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ہیں تو وہ اپنے یہاں

ایک ہزار کو کھلاتا۔ اسی طرح سے اگر کسی کو پتہ چلتا کہ فلاں سواری کے وقت دو سو تنکہ صدقہ دیتا ہے تو وہ چار سو دیتا حتیٰ کہ کثرت ایثار کی وجہ سے امراء و ملوک ہمیشہ قرض کی زنجیر سے جکڑتے رہتے تھے۔

جس وقت کہ جلال الدین فیروز خلجی عرض ممالک تھا اسی زمانہ سے اس نے امیر خسرو کی سرپرستی شروع کر دی اور بارہ ہزار تنکہ جو کہ امیر کے والد کا وظیفہ تھا اس کے لئے مقرر کر دیا۔ اس کے زمانہ میں ملک قطب الدین علوی تھا جو کہ بیرون اندازہ خیرات کرتا تھا۔ روایت ہے کہ اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے موقع پر اس نے دو لاکھ تنکے صرف کئے اور عقد والے دن سو گھوڑے مع ساز کے اس نے بخشش میں دیئے اور ایک ہزار آدمیوں کو جوڑے پہنائے۔ اسی کا ساتھی تھا ملک احمد چپ جس نے ایک روز شاہی مطربوں اور ندیموں کو مدعو کیا اور ان کو ایک لاکھ تنکے انعام میں دیئے اور دو یا تین سو خلعتیں دیں۔ ملک نصرت صباح کی ایسی عادت تھی کہ وہ کسی سائل کو اپنے در سے واپس نہ کرتا اور کسی نہ کسی طرح سے اس کی حاجت براری کرتا۔ اپنی سخاوت کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا تھا اور قرض خواہ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ علاء الدین کے عہد میں تو امیر قریب قریب مفلس ہی ہو گئے۔ اس کی وفات کے بعد امیروں نے پھر سے دولت جوڑنا شروع کی۔ اس کے بیٹے کے وزیر خسرو خاں کا بہت بڑا عملہ تھا اور جب موقع آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ لوٹایا۔ غیاث الدین کے زمانہ میں کسی ایسے امیر کا ذکر نہیں ملتا جو روپیہ صرف کرنے میں عالی حوصلہ ہو۔ مگر محمد تغلق کے عہد میں کئی مثالیں اس قسم کی دستیاب ہوتی ہیں۔ میر قبول ایک ایسا امیر تھا جو صرف اپنے ذاتی عملہ پر 3-1/2 لاکھ تنکے سالانہ صرف کیا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ اگرچہ معمولی عہدہ دار تھا تب بھی ہمیشہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے عاجز رہتا۔ چنانچہ اس اذیت سے نجات پانے کے لئے اس نے سلطان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں خزانہ عامرہ سے اس کا قرضہ ادا کر دیا گیا۔ فیروز تغلق کے عہد میں بشیر سلطانی نے چار ہزار زر خرید غلاموں کو آزاد کر دیا اور ان کو انعامات بھی دیئے۔ وزیر خان جہان نے ایک جوڑا موزے پر اسی ہزار تنکے صرف کئے۔ قاضی صدر الملک کے لڑکے نے ایک طوائف سے تعلق کر لیا تھا جس کے واسطے ہر روز پانچ چونہ مروارید درکار ہوتا تھا۔

اور یہ فراہم کیا جاتا تھا۔ سید اور لودیوں کے عہد میں امراء کا یہی رویہ جاری رہا۔

دولت کی کثرت کی وجہ سے یہ لازم نہ تھا کہ امیر لوگ نالائق ہوتے برخلاف اس کے چونکہ اس دور کے بادشاہ خود تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور علوم و فنون کی سرپرستی کرتے تھے اس لئے امراء کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ اپنے ذاتی صفات کو ترقی دیتے رہیں' یہ لوگ علما و فصحا کی صحبت سے ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہتے تھے اور اپنی لیاقت کو بڑھانے کا کوئی موقع چھوڑتے نہ تھے۔ ان کو اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ بغیر لیاقت کے امور ملکی میں کامیابی و عروج حاصل ہونا غیر ممکن تھا۔ منہاج سراج نے لکھا ہے کہ التمش کے امیر حاجب نے پڑھنے کے لکھنے میں اتنا وقت صرف کیا کہ وہ ہردلعزیز ہو گیا۔ امیر صرف سپاہی نہ ہوتے تھے بلکہ منشی و دبیر بھی۔ بلبن کے زمانہ میں تو درس و تدریس' شعرو شاعری کا اتنا چرچا ہوا کہ سلطنت کے امیر کے پاس شعراء و فضلا کا ایک گروہ رہنے لگا۔ اور جس طرح امیر لوگ بذل و سخا میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے ویسے ہی علمی لیاقت میں بھی۔ دیسی لوگوں کو طبقہ امراء سے الگ کرنے میں شاید بلبن کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ ملک میں علم کی اشاعت بڑھے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نو مسلموں کی جو کہ زیادہ تر ادنیٰ فرقوں کے ہوتے تھے اتنی جلدی علمی استعداد بڑھنا غیر ممکن تھا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ عموماً امیر تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ ان میں سے اکثر کی تصنیفات کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے۔ مثلاً قوام الدین علاقہ جس نے فتح نامہ لکھنوتی تصنیف کیا۔ کبیرالدین پسر تاج الدین عراقی جس نے تاریخ علائی لکھی۔ تاتار خاں جس نے تفسیر تاتار خانی اور فتاوائے تاتار خانی تصنیف کئے۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں اسی قسم کی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عہد سلطنت میں طبقہ امراء نے اپنی محنت و جانفشانی۔ جود و سخا سے نخل علوم و فنون کو سرسبز و شاداب رکھا۔

مگر اعلیٰ تعلیم نے ان کے طرز معاشرت پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا۔ اور ان لوگوں میں وہ تمام نقص قائم رہے جن کا کہ آج تک امیروں سے تعلق ہے۔ بجز معدودے چند کے سب ہی کو شراب نوشی کی عادت تھی۔ اس کے ساتھ قمار بازی بھی ہوتی تھی۔ نصرت صباح کے بارے میں برنی نے تحریر کیا ہے کہ جس مجلس میں وہ جاتا تھا جوا ضرور

کھیلتا تھا۔ اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ اعلیٰ پیمانہ پر۔ رقص و سرود کی محفل تو روزانہ ہی کسی نہ کسی امیر کے یہاں جمی ہی رہتی تھی۔ مطربوں اور سازندوں کی حد سے زیادہ مانگ تھی۔ اگر رقص و سرود کی نفاست ہی کسی زمانہ کی تہذیب کا معیار ہے تو واقعی امرا و سلاطین کی سرپرستی سے یہ فن اس عہد میں کمال کو پہنچ گیا تھا۔ جس کا شاہد ضیاء الدین برنی ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہوں کی طرح امیر بھی متعدد شادیاں کرتے تھے اور کثیرالاولاد بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ عفیف کا قول ہے۔ "خان جہاں را پسراں بسیار بردند زیرا چہ او رغبت بحرم بسیار داشت و برائے جمع کردن حرم کوشش بسیار گماشت۔ کنیز کان صاحب جمال باکمال در حرم خود جمع کنانید چنانچہ گویند دو ہزار کنیزک از زمین روم و چین در حرم خود داشت۔' امیر اپنی عورتوں کو پردے میں رکھتے تھے۔ تاتار خاں اپنی کنیزوں کو گھوڑوں پر سوار نہ ہونے دیتا تھا بلکہ ڈولہ میں بٹھلا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے دیتا تھا اور ان کے پردے کا معقول انتظام رکھتا تھا۔ لیکن اس عہد میں بھی بعض امیر ایسے ہوتے تھے جو اپنی عورتوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے اپنے ساتھ سیرو شکار میں لے جاتے تھے۔ لیکن یہ رواج عام نہ تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ "عورتیں اس ملک میں ڈولیوں میں آتی جاتی ہیں..... اور ان ڈولیوں پر ریشم کے پردے پڑے رہتے ہیں۔" امیروں کے درمیان دعوت کی ترتیب اور اس کے آداب کیا تھے اس کا مشرح حال ابن بطوطہ کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے :____ "پہلے روٹیاں لاتے ہیں جو نہایت پتلی پتلی چپاتیاں ہوتی ہین۔ بکری کو بھون لیتے ہیں اور اس کے چار یا چھ ٹکڑے کر کے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں لاتے ہیں جس کے جرف میں حلوائے صابونیہ بھرا ہوتا ہے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک میٹھی روٹی رکھتے ہیں جس کو خشتی کہتے ہیں اور اس کو آٹے شکر و گھی سے بناتے ہیں اور پھر ایک چیز لاتے ہیں جس کو سموسہ کہتے ہیں اور وہ قیمہ کیا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ اس میں بادام اور جائفل اور پستہ اور پیاز اور گرم مسالہ ڈال کر پتلی چپاتیوں میں اس کو لپیٹ دیتے ہیں اور پھر گھی میں تل لیتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے سامنے چار یا پانچ سموسہ رکھتے ہیں اور پھر چاول گھی میں پکے ہوئے لاتے ہیں اور اس کے اوپر مرغ ہوتا ہے۔ پھر لقیمات القاضی لاتے ہیں اور اس کو ہاشمی بھی کہتے ہیں۔ پھر قاہریہ

لاتے ہیں حاجب کھانا شروع کرنے سے پہلے دستر خوان پر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اور سب حاضرین بادشاہ کی تعظیم کرتے ہیں..... اور جب یہ کر چکتے ہیں تو دستر خوان پر بیٹھتے ہیں اور کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی اور سونے اور کانچ کی پیالیوں میں مصری اور گلاب کا شربت پیتے ہیں۔ جب شربت پی چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے اس وقت سب کھانا شروع کر دیتے ہیں کھانا ختم ہونے پر فقاع کے پیالے آتے ہیں اور جب فقاع پی چکتے ہیں تو پان سپاری آتا ہے۔ جب پان سپاری لے چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جس طرح کھانے سے پہلے تعظیم کی تھی اسی طرح پھر کرتے ہیں اور پھر دستر خوان سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں..... اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس دور میں دعوتوں میں کیا کیا تکلفات ہوا کرتے تھے۔

اگر یہ مضمون لوگوں کے خیالات کو اس طرف منعطف کر سکے کہ عہد سلطنت میں بادشاہوں کے حالات کے ماسوا اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں جن کے بارے میں ہنوز ہماری معلومات محدود ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ جس طرح سے مغلیہ دور کے امراء کے مشرح و مفصل حالات ماثرالامراء میں درج ہیں۔ اسی طرح اگر اتنی بڑی نہیں تو اس کی نصف یا چوتھائی ضخامت میں عہد سلطنت کے امیروں کے حالات بھی قلمبند کئے جا سکتے ہیں اور اس کی اشد ضرورت ہے۔

ملک عنبر

بنارسی پرشاد سکسینہ

(1)

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد اس کے باقیات سے پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک ریاست احمد نگر تھی۔ اس کی تاریخ حیات میں، تلوار کی جھنکار اور جنگ و جدل کی وحشت زاؤں کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو مذہبی یا سیاسی نقطہ نظر سے قابل توجہ ہو، احمد نظام شاہ سے لے کر حسین سوم تک کوئی بھی بادشاہ ایسا نہیں ہوا جس کو جا و بیجا جذبہ داریوں کے باعث ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں بہادروں کا خون نہ بہانا پڑا ہو۔ اس لئے یہ کہنا غیر مناسب نہ ہو گا کہ ابتدا ہی سے اس ریاست کی سرشت میں فتنہ و فساد کا مادہ زیادہ تھا، یا یوں کہئے کہ اس کے خون ہی میں ایک قسم کا زہر بھرا ہوا تھا۔ زبروست اور زیردست راجاؤں اور ان کے حامیوں اور مخالفوں کی سازشیں، اور مذہبی مظالم کے نفرت انگیز مظاہرے، بس شروع سے آخیر تک اس سلطنت کی یہی کہانی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان حالات کے باوجود اس ریاست کا جھنڈا تقریباً ایک صدی تک لہراتا رہا اور یہاں کے فرمانروا فخر و ناز سے اپنی گردنیں اونچی کئے رہے۔

اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو دنیا کے زیادہ تر کیا تقریباً سبھی ریاستوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستان ایک ہی طرح کی ہے۔ لیکن احمد نگر کی تاریخ میں خاص بات یہ ہے کہ ایک بار اس کا زوال ہو کر پھر اس کا عروج ہوا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بجھتے ہوئے چراغ کا آخری سنبھالا تھا مگر اس کے شعلے سے جو آگ بھڑکی اس نے بڑے بڑوں کے دلوں کو لرزا دیا۔ جو خوشحالی، جو کامیابی، اور جو شہرت ایک صدی کے اندر وہاں کے کسی راجہ کو حاصل نہ ہوئی تھی وہ پچیس سال کے اندر ایک اجنبی،

غیر ملکی حبشی نے اپنی قوت بازو اور دانشمندی سے حاصل کرلی۔ کیسا عجیب واقعہ ہے کہ جس سیاسی نظام کا بیج ملک عنبر نے بویا اس کے پھلوں کا مزہ نہ تو خود اس کو اور نہ اس کے بعد میں آنے والوں کو ملا بلکہ اس کی لذتوں سے ہندو بہرہ یاب ہوئے۔ عنبر کا نام تو اس زمانے کی تمام تاریخی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اس کا علیحدہ مستقل طور پر کہیں ذکر نہیں ملتا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ سنہ 159ع کے بعد ریاست احمد نگر کی مفصل تاریخ' فرشتہ کے سوا کسی دوسرے ہمعصر مورخ نے نہیں لکھی۔ برہان دوم کی اجازت سے علی بن عزیز للہ طبا طبائی نے برہان ماثر نامی ایک کتاب لکھی لیکن سر اوزلے ہیگ انجہانی کی رائے ہے کہ تاریخی نقطہ نظر سے یہ کتاب کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور بات بھی یہی ہے۔ اس لئے اس کا سہارا لینا فضول ہے۔ اگر اس کی خیال آرائیوں کا خلاصہ کر کے صداقت کا عنصر دریافت بھی کیا جائے جب بھی عنبر کی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ مذکورہ سنہ عیسوی سے لے کر دس برس تک احمد نگر حوادث کا شکار رہا' اسی لئے اس ریاست میں نہ کسی مستقل نظام حکومت کی اشاعت کی جا سکی اور نہ کسی طرز تعلیم کی بنیاد قائم ہو سکی۔ مرتضیٰ نظام شاہ دوم اور حسین نظام شاہ کے دربار میں کسی بڑے ذی علم شخص کی موجودگی کا ذکر نہیں آتا' یہی وجہ ہے کہ ان کے دربار کی کوئی ایسی تاریخی کتاب نہیں ملتی جس میں اس ریاست کو نئی زندگی دینے والے شخص (ملک عنبر) کے محاسن بیان کئے گئے ہوں۔

جس زمانے میں عنبر نے عملی دنیا میں قدم رکھا اس زمانے میں احمد نگر کا نام ہی نام باقی رہ گیا تھا' اس کا خاکہ بگڑ چکا تھا اور اس کی شہرت فنا ہو چکی تھی۔ اقبال مند اکبر نے احمد نگر کے قلعہ پر قبضہ کر ہی لیا تھا اور اپنے بڑے بڑے سرداروں کو جنوبی سرحد کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا تھا' ادھر عادل شاہ اور قطب شاہ اس ریاست کے ٹکڑوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے بیٹھے تھے۔ یعنی یہ کہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے عنبر کو اپنے ہمعصر تمام فرمانرواؤں کی دشمنی مول لینا پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ مغل عادل شاہی اور قطب شاہی کتابوں میں عنبر کا ذکر تو ضرور ملتا ہے لیکن مفصل حال نہیں ملتا۔ بھلا اپنے دشمن کا خصوصیت سے کوئی کیوں ذکر کرتا۔ مغلوں نے تو اس کو بہت ہی تلخ اور نفرت انگیز الفاظ میں مخاطب کیا ہے۔ خود جہانگیر نے جو اپنی تہذیب اور مروت کے

لئے مشہور ہے، عنبر کو "کلمونہا" (سیاہ رو) بدبخت اور بدذات کہہ کر اس کی اہانت کی ہے۔ معتمد خان نے اسے بد بخت کہہ کر اپنی نفرت ظاہر کی ہے، خافی خان اپنی جنوبی ہند کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ برہان پور کے امرا نے شہنشاہ جہانگیر کے پاس عرضداشت بھیجی جس میں یہ جملے لکھے تھے کہ "اگر اس کالے رنگ والے اور داغدار نسل کے غلام کی تنبیہہ کا مناسب انتظام نہ کیا جائے گا تو ہم راجپوت بہادروں کی طرح اپنی جانوں کو فدا کر دیں گے۔ بیجاپور اور گولکنڈا والوں نے بھی اسی قسم کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ مرہٹوں سے یہ امید تھی کہ وہ عنبر کے حالات زندگی پر کچھ زیادہ روشنی ڈالیں گے، کیونکہ ایک طرح سے وہی ان کو سیاسی زندگی بخشنے والا تھا لیکن ایک مسلمان کے احسان کا ان کو کیونکر اعتراف ہو سکتا تھا۔

مواد کی اتنی کمی ہونے کے باوجود اس زمانے کی کتابوں کے متفرق بیانات کی بنیاد پر، عنبر کے حالات زندگی پر تھوڑی بہت روشنی تو ضرور ہی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حبشیوں کی نسل کا تھا، اس کی ایک تصویر سے جو مسٹر ان، سی مہتا کے پاس ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی تھا، اس کی بانہیں لمبی اور گاودم، اس کا سینہ چوڑا، کمر شیر کی کمر کی طرح پتلی اور گردن موٹی اور مضبوط تھی۔ اس کے جسم کے ایک ایک عضو سے پھرتی ٹپکتی تھی، اس کے چہرہ سے بہادری، ہونٹوں سے ثبات عزم اور آنکھوں سے دور اندیشی نمایاں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سرداری کے بہت سے صفات کی اپنے میں اہلیت رکھتا تھا۔

بخارا اور بغداد کے بازاروں میں خریدے ہوئے غلاموں نے ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر قابل قدر کارنامے دکھائے ہیں۔ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، غیاث الدین بلبن کے نام تو اس ملک کے قرون وسطیٰ کی تاریخ میں غیر فانی طور پر ثبت ہیں، عنبر بھی اسی مالے کا ایک قیمتی رتن تھا جوانی میں ابھرنے کے لئے بچپن ہی میں اس کی قسمت پھوٹ گئی تھی۔ کارکنان قضا و قدر نے اس کو ماں باپ کی محبت اور ان کے سائے سے محروم کر دیا تھا۔ سوداگروں کے ہاتھ پڑ کر بغداد کے بازار میں بکنے آیا۔ یہاں میر قاسم یا خواجہ بغدادی نامی سوداگر نے اسے خرید لیا۔ قاسم اپنا مال بیچنے جنوبی ہند میں آیا۔ یہاں احمد نگر میں میرک دبیر یعنی چنگیز خاں سے اس کا سودا پٹ گیا۔ اور اس نے

اس کے ہاتھ عنبر کو بیچ ڈالا- قسمت کے کھیل تو دیکھئے کہ آدمی کو کیا کیا ناچ نچاتی ہے-
کہاں حبش اور کہاں ہندوستان- کون جانتا تھا کہ جب عنبر گھر سے نکل کر پردیس میں
پہنچے گا تو عزت و شہرت کا بام فلک تک پہنچ جائے گا- چنگیز خاں خود حبشی تھا- بات کی
بات میں اپنے ہم وطن کے صفحات کو پہچان گیا- سمجھ گیا کہ غلام ہے تو کیا ہوا' یہی
نوجوان ہونہار ہے- اپنی حیثیت و عزت کے قیام کے لئے اس نے ایک ہزار غلاموں کی
ایک پلٹن بنائی تھی- اسی فوج میں اس نے عنبر کو بھی داخل کر لیا-

اس زمانے میں احمد نگر کا حکمران مرتضیٰ اول تھا' تخت حکومت پر بیٹھنے کے وقت وہ
صرف ایک لڑکا تھا' اسی وجہ سے بعد کے چھ سال تک عنان حکومت کی ماں خواجہ
ہمایوں کے ہاتھ میں رہی' مرتضیٰ کو سیاسی امور کی طرف نہ دلچسپی تھی اور نہ اس کو اس
کی ضرورت محسوس ہوتی تھی' وہ اپنا وقت کھیل کود یا پڑھنے لکھنے میں صرف کیا کرتا
تھا- ماں نے بیٹے کی بے توجہی کو دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کیا- بڑے بڑے
عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو مقرر کیا اور جن لوگوں سے اس کو خطرہ تھا ان کو
سرکاری نوکری سے برطرف کر دیا- بہت ہی جلد سلطنت کے خاص خاص عمال خواجہ
کے اس طرز عمل سے بد دل ہو گئے- اور انہوں نے ملکہ کے خلاف سازشیں شروع کر
دیں- اس تحریک کے سربرآوردہ لوگ زیادہ تر یہی غیر ملکی حبشی تھے- انہیں نے
مرتضیٰ کو اس کی ماں کے خلاف ابھارا اور اس کو تخت سے علیحدہ کر دینے کی صلاح
دی- ایک بار جب مرتضیٰ کو صاف طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کتنی سخت بیڑیوں میں
جکڑا ہوا ہے تو ان بندشوں سے آزادی پانے کے لئے اس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا'
چنانچہ جلد ہی اس کی تدبیریں کارگر ہو گئیں- خواجہ کو شاہی محل کے عیش و آرام کے
بدلے قید خانہ کی تکلیف اٹھانی پڑی' اور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہی مرتضیٰ نے
اپنی ماں کے طرفداروں کو نکال باہر کیا اور ان کی جگہوں پر اپنے نئے حلقہ احباب میں
سے لوگوں کو مقرر کیا اور اس موقع پر میرک دبیر یعنی چنگیز خاں کی قسمت چمکی' کیونکہ
اس کو سپہ سالار کا رتبہ عطا ہوا-

چنگیز نے اپنے مالک کی جی جان سے خدمت کی' سنہ 1069ء میں عادل شاہی فوج
کو اس نے حدود سلطنت سے نکال باہر کیا اور علی عادل شاہ کو مجبور کیا کہ وہ بدر اور

برار پر نظام شاہی تسلط تسلیم کرے' اس بہادر سپاہی کی شہرت و ناموری کو دیکھ کر' دوسرے نظام شاہی سردار جلنے لگے۔ بدر کے حملے کے زمانے میں موقع پاکر انہوں نے مرتضٰی کے کان بھرے کہ چنگیز خان کا دل' حسد اور برائی سے آلودہ ہے' لیکن اس کا یہ خیال ہے کہ بدر پر قبضہ کر کے' اپنی علیحدہ خود مختار حکومت قائم کرے۔ چنگیز کو اپنے دشمنوں کی فریب کاریوں کا ذرا بھی پتہ نہ چلا' سیدھے سپاہی کے طرح وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں لگا رہا' اسی لئے وہ اپنے مالک کے اندیشوں کا تدارک نہ کر سکا۔ چنانچہ جب ایک دن مرتضٰی نے کہا کہ میں تھک گیا ہوں اور ہم لوگوں کو گھر واپس چلنا چاہئے تو چنگیز نے سادہ دلی سے یہ جواب دیا کہ بدر پر بغیر پوری طرح قبضہ کئے ہوئے واپس ہونا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ سن کر مرتضٰی کا اندیشہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے شاہی طبیب کے مدد سے چنگیز کو شربت میں زہر ملوا کر پلا دیا۔ مرتے وقت چنگیز نے مرتضٰی کو ایک خط لکھا جس میں اس نے بہت سی قیمتی نصیحتیں کیں۔ رفیع الدین اپنی کتاب تذکرۃ المملوک میں لکھتا ہے کہ اگر چنگیز کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو سارے دکھنی خطے میں ایک تہلکہ مچ جاتا۔ اس کا خود بھی یہی قول تھا کہ یہ میری زندگی کی تمنا ہے کہ ایک بار شہنشاہ اکبر سے جنگ کروں' اگر کام آیا تو لوگ یہی نہ کہیں گے کہ میرک دبیر مرگیا اور اگر فتح حاصل ہوئی تو ابدالاباد تک صفحہ عالم پر میرا ثبت رہے گا۔ یہ تھا ایک بہادر جنگجو کا خیال!۔

اپنے سپہ سالار چنگیز کی موت کے بعد (سنہ 1575ء) عنبر سرکاری فوج میں بھرتی ہو گیا' لیکن اب تو نظام شاہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں مرتضٰی پاگل ہو گیا' جنون کے عالم میں اس نے ایک دن اپنے بیٹے حسین کے بسترے میں آگ لگا دی مگر حسین قسمت کا دھنی تھا کہ صاف بچ گیا' اس کا دل مجنون باپ سے بدلا لینے کے لئے بیقرار ہو گیا' چنانچہ جب موقع ملا تو اس نے مرتضٰی کو ایک حمام میں بند کر کے نیچے سے آگ جلوا دی۔ بیچارہ بھن کر کباب ہو گیا' باپ کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کر کے حسین گدی پر بیٹھا' آئندہ سازشوں کے خوف سے اپنے پیشوا مرزا خان کے کہنے سے اس نے نظام شاہی خاندان کے پندرہ شاہزادوں کو قتل کرا دیا مگر تین سال کے اندر ہی مرزا خان نے دغا کی اور اپنے مالک کو قتل کرا دیا۔ اس قتل

و خون کے بعد اس نے برہان دوم کے چھوٹے بیٹے اسمٰعیل کو لوہ گرہ کے قلعہ سے لا کر احمد نگر کی گدی پر بیٹھایا۔ لیکن مرزا خان بہت دنوں تک آرام سے نہ رہ سکا' اس کے مظالم سے پایہ تخت میں بڑی ہلچل مچ گئی۔ اپنے خلاف تحریکوں کی امنڈتی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھ کر وہ جان کے خوف سے' احمد نگر سے بھاگ نکلا۔ ریاست کے انتظام کا بار اب جمال خان کے کندھوں پر پڑا' یہ دکھنی مسلمان تھا اور اس کی طاقتوں کی بنیاد میں دکھنیوں کی جماعت تھی جس کا وہ سرغنہ تھا۔

جمال خاں نے پیشوا کا عہدہ اختیار کرتے ہی ایک نئے عقیدے کی تبلیغ شروع کی' سولھویں صدی کے آخری نصف صدی میں مسلمانوں کے ایک انقلابی جماعت نے عوام میں یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بارہویں امام یعنی امام مہدی کی پیدائش ہو چکی ہے اور اب اسلام میں ایک نئی بیداری پیدا ہو گی۔ اس جماعت کے پیرو مہدویہ کہلاتے تھے۔ جمال خاں بھی مہدوی فرقے میں تھا اور اس نے اس بات کی کوشش کی کہ احمد نگر اس مہدوی تحریک کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ شیعہ مذہب کو نیست و نابود کر کے مہدویہ عقیدے کو سلطنت کا مذہب قرار دیا۔ تمام ہندوستان کے مہدویہ عقیدے کے لوگ احمد نگر میں آ کر جمع ہو گئے' انہوں نے جمال خان کو اپنا خلیفہ تسلیم کیا اور اس کے لئے اپنے تن من دھن کو نثار کر دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ جمال خان کے مذہبی خیالات اور اس کی حکمت عملی برار کے امرا کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی' اور انہوں نے صلابت خان کی سرکردگی میں اس سے جنگ شروع کر دی' ادھر بیجاپور کی طرف سے بھی حملہ کر دیا گیا۔ جمال خان نے بڑی ہمت سے کام لیا' پہلے صلابت خان کو شکست دی پھر بیجاپوری فوج کی طرف بڑھا' پندرہ روز تک دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں رہیں' آخر میں صلح ہو گئی۔ جمال خان میدان جنگ سے دارالسلطنت میں واپس آیا اور اس نے اپنا غصہ غیر ملکی لوگوں پر اتارا' یعنی تقریباً تین سو آدمیوں کو ملک چھوڑ دینے کی سزا دی گئی۔ یہ واقعہ سنہ 1590ء کا ہے۔

عنبر کو اب سرکاری نوکری کرتے ہوئے پندرہ سال ہو چکے تھے' احمد نگر کی حالت میں جو انقلابات ہوئے وہ انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا' اس کے سوا وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا' کوئی بھی تو غیر ملکی شخص باقی نہیں رہ گیا تھا جس کا وہ سہارا لیتا۔ جب جمال خان

نے تمام غیر ملکیوں کے خلاف اپنی کارروائی شروع کی اور ان کو احمد نگر سے نکال باہر کیا تو پھر عنبر کی کیا ہستی تھی کہ وہاں رکا رہتا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالتا' کچھ دنوں ادھر ادھر بھٹکتا پھرا اور جس طرح ہو سکا مصیبت کے دن بسر کرتا رہا۔ فرشتہ بھی اسی مصیبت میں مبتلا ہوا اور اس نے احمد نگر سے بھاگ کر بیجاپور میں پناہ لی اور وہیں اپنی مشہور تاریخ کی کتاب تیار کی۔

احمد نگر کی یہ بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر شہنشاہ اکبر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اسی وقت اس ریاست کو ہڑپ کر لیتا' لیکن اس کی طاقت اور توجہ دوسری طرف تھی۔ عبداللہ خان ازبک کی بڑھتی ہوئی ریاست اور اثر کو دیکھ کر وہ خائف ہو رہا تھا اور اس نے اپنی پوری طاقت سلطنت کے شمالی مغربی حدود کو محفوظ رکھنے میں لگا رکھی تھی۔ تاہم چال سے باز نہ آیا اور اس نے برہان دوم کو جو بہت دنوں سے اس کی پناہ میں تھا ابھارا کہ وہ جا کر احمد نگر کے تخت پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے۔ اکبر نے یہ بھی تجویز کی کہ وہ اس کی مدد کے لئے مغل سپاہیوں کی ایک پلٹن ساتھ کر دے' لیکن برہان نے اسے قبول نہیں کیا' وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا' جمال خان لڑائی میں مارا گیا اور اسمٰعیل گرفتار کیا گیا اس کے بعد برہان تخت پر متمکن ہوا' اپنے آبا و اجداد کی طرح اس نے شیعہ مذہب کو ازسرنو رائج کیا اور ملک سے نکالے ہوئے بدیسیوں کو پھر سے بلا لیا۔

اکبر کو امید تھی کہ برہان اس کا احسان مانے گا' اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کا اقتدار تسلیم کرے گا۔ لیکن برہان نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر اکبر بہت خفا ہوا اور بدلا لینے کا موقع ڈھونڈنے لگا۔ بیچارا برہان ایک دن بھی سکھ کی نیند نہ سو سکا' برابر اندرونی اور بیرونی جھگڑوں میں مبتلا رہا۔ مسلسل محنت' بیماری اور افکار سے وہ تھک گیا اور سنہ 1595ء میں انتقال کر گیا۔ اس کا مرنا تھا کہ احمد نگر میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس زمانے میں ریاست میں امیروں کے چار گروہ تھے۔

(1) میاں منجھو اور اس کے دکھنی متبعین۔ یہ لوگ احمد دوم کے طرفدار تھے اور بیجاپور کی سرحد پر اس امید پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ ابراہیم دوم ان کی مدد کرے گا۔

(2) افریقہ کے باشندے۔ ابھنگ خاں اور حبش خاں جو شاہزادہ علی کے طرفداروں

میں تھے' یہ لوگ بھی جنوبی سرحد پر اسی مقصد سے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جو پہلے گروہ والوں کا مقصد تھا۔

(3) اخلاص خاں جو ایک دوسری افریقی گروہ کا سردار تھا' دولت آباد کے قریب ڈیرا ڈالے ہوئے تھا اور ایک غیر معروف لڑکے موتی شاہ کا طرف دار بنا ہوا تھا۔

(4) چاند بی بی جو احمد نگر میں ایک بچے بہادر نامی کی حفاظت اپنے ذمہ لئے تھی۔

شروع میں اخلاص خاں اور میاں منجھو ہم خیال تھے لیکن بعد میں دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اخلاص خاں نے موتی شاہ کو اپنا سردار تسلیم کر لیا' اس پر میاں منجھو نے شہزادہ سلطان مراد سے جو اس وقت گجرات کا گورنر تھا مدد کی درخواست کی۔ اکبر تو اس موقع کا منتظر ہی تھا اس نے فوراً ہی مراد اور خان خاناں کو اجازت دے دی کہ اپنی اپنی باقاعدہ فوج لے کر منجھو کی مدد کو پہنچیں۔ خاندیش کے حکمران علی خاں کو بھی اسی غرض سے ایک خط لکھا۔ مراد اور خان خاناں نے بڑی تیزی سے کام لیا اور احمد نگر پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ علی خاں بھی آ تو پہنچا لیکن اس کی ہمدردی دکھنی بھائیوں کے ساتھ تھی۔ اخلاص خاں اور ابھنگ خاں نے محاصرہ توڑنے کی کوشش ضرور کی لیکن مغل سرداروں نے ان دونوں کو پسپا کر دیا۔ مراد اور خان خاناں کے درمیان رشک و حسد ہونے کے باعث اس فتح سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ آخر میں گولکنڈہ اور بیجا پور سے امدادی فوج کے آنے کا حال سن کر مراد نے چاند بی بی سے صلح کر لی اور مغلوں کو اپنی محنت کے بدلے میں' برار کا صوبہ ملا۔

آئی ہوئی مصیبت کو اس طرح ڈال کے چاند بی بی نے بہادر شاہ کی بادشاہی تسلیم کرائی۔ میاں منجھو نے خانہ جنگی شروع کرنے کی ایک بار اور کوشش کی لیکن ابراہیم دوم نے اس کو اور اس کے سردار احمد کو بیجا پور بلا لیا۔ احمد نگر میں محمد خاں' پیشوا کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اس نے اپنے غرور اور مظالم سے وہاں کے امراء کو اس قدر تنگ کیا کہ چاند بی بی کو بیجا پور سے مدد مانگنی پڑی۔ ابراہیم نے سہیل خاں کے ساتھ ایک فوج بھیجی جو چار مہینے تک احمد نگر کا محاصرہ کئے رہی۔ محمد خاں نے خان خاناں سے مدد کی درخواست کی لیکن اس کی چال معلوم ہو گئی اور وہ قید کر لیا گیا۔ چاند بی بی نے ابھنگ خاں کو پیشوا کے عہدہ پر مقرر کیا۔

ابھنگ خاں کے نیا عہدہ اختیار کرتے ہی غیر ملکیوں کا ستارہ چمکا' اس نے حبشیوں کی ایک فوج جمع کی اور ان کی مناسب تکریم و عزت کی' اس کی فراخ دلی کا حال سن کر حبشیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں جو اب تک منتشر تھیں احمد نگر آئیں' عنبر سے بھی نہ رہا گیا' وہ بھی اسی طرف روانہ ہو گیا' سطور بالا میں یہ کہا گیا ہے کہ جمال خاں کے مظالم سے تنگ آ کر عنبر احمد نگر فرار ہو گیا یا ملک بدر کر دیا گیا تھا' کچھ دنوں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد جب روزی کا کہیں سہارا نہ رہا تو وہ بیجا پور پہنچا اور اس نے وہاں سرکاری نوکری کر لی' وہیں سے بیٹھے بیٹھے احمد نگر کی خراب حالت کا تماشا دیکھتا رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ بیجا پور میں اس کا جی نہیں لگتا تھا' لیکن احمد نگر آنے کی بھی آسانیاں نہ تھیں۔ اب جب موقع ملا تو وہ چوکا نہیں' جیسے ہی وہ اپنے پرانے شہر میں آیا ویسے ہی اسے ٹھکانے کی نوکری مل گئی۔ ابھنگ خاں نے اسے اپنی فوج میں داخل کر لیا۔

مغلوں کی زیادتیوں سے مجبور ہو کر' ابھنگ خاں کو فوراً ہی لڑائی کرنے کی تیاری کرنی پڑی' اپنی پہلی حکمت عملی کے مطابق اس نے بیجاپور سے مدد چاہی۔ لیکن خان خاناں کی قوت اور ہوشیاری کے سامنے گولکنڈہ اور بیجا پور کی متحدہ فوجیں بھی مقابلے پر نہ لڑ سکیں۔ سنہ 1597ء کے فروری کے مہینے میں دریائے گوداوری کے کنارے سون پت کے مقام پر دکھنیوں کو شکست فاش ہوئی۔ احمد نگر پر بدبختی کے کالے بادل گھرنے لگے' اس کے زوال میں تو کوئی کسر رہ نہ گئی لیکن اگر تھی بھی تو وہ جلد ہی پوری ہو گئی۔ ابھنگ خاں نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور اس بات کی کوشش کی کہ عنان حکومت پوری طرح اسی کے ہاتھ میں آ جائے۔ چاند بی بی اس ڈھٹائی کو کیونکر برداشت کر سکتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے آپس کے تعلقات میں گتھیاں پڑ گئیں یہاں تک کہ ابھنگ خاں' چاند بی بی کو قید کرنے کا موقع تلاش کرنے لگا۔ چاند بی بی بڑی ہوشیار عورت تھی' اس نے قلعہ کے پھاٹک بند کر لئے اور محفوظ ہو کر بیٹھ رہی مگر ابھنگ خاں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب اکبر کو اس خانہ جنگی کا پتہ چلا تو اس نے دانیال اور خان خاناں کو دکن کی طرف روانہ کای اور خود بھی اسی طرف مراجعت کی' خان خاناں اور دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا' ابھنگ خاں نے ان کو راستے ہی میں روک لینے کی کوشش کی لیکن شاہی فوج کو دیکھتے ہی گھبرا گیا' اور چاند بی بی کی مدد تو در کنار'

میدان سے نکل بھاگا۔ اور جنیر پہنچ کر دم لیا۔ مضیبت کے زمانے میں خود داری کو چھوڑ کر چاند بی بی نے اپنے محل کے خواجہ سرا چیتا خاں سے مشورہ کیا اور قلعہ کو مغلوں کے سپرد کر دینے کی رائے قائم کی۔ چیتا خاں نے دغا بازی کی' فوج کو جمع کر کے اس نے یہ اعلان کیا کہ چاند بی بی تو مغلوں سے ملی ہوئی ہے۔ سپاہی غصے کے مارے اندھے ہو گئے اور طیش میں آ کر انہوں نے بڑا ہی غضب کر ڈالا یعنی بے گناہ چاند بی بی کی جان لے لی۔ ادھر مغلوں نے قلعہ کی دیواروں میں سرنگیں پوری کر لی تھیں اور ان میں بارود بھر دی تھی۔ جیسے ہی ان کو چاند بی بی کے قتل کا پتہ چلا ویسے ہی انہوں نے بارود میں آگ لگا دی' دھائیں دھائیں کر کے دیواریں جا بجا سے گر گئیں' مغلوں کی فوجیں قلعہ میں گھس پڑیں' اور انہوں نے بہادر نظام شاہ کو قید کر لیا اور قلعہ پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

(2)

اس طرح سنہ 1599ء میں احمد نگر کی آزادی و خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا' لیکن کئی وجوہ سے مغلوں کا اس پر پوری طرح اقتدار نہ قائم ہو سکا۔ اصل وجہ تو یہ تھی کہ سلیم کی بغاوت نے اکبر کو دکھن سے واپسی کے لئے مجبور کیا' دوسرے یہ کہ بہت سے سردار جو نظام شاہی ملازمت سے برطرف ہو چکے تھے وہ اس امر کی کوشش کرنے لگے کہ اپنے لئے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں' ان سرداروں میں سے دو شخص نمایاں طور پر پیش پیش تھے' ایک تو عنبر اور دوسرا راجو پولاد۔ جس وقت ابھنگ خاں' احمد نگر کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اس وقت عنبر نے اپنی مستعدی اور کار گذاری سے اپنے مالک کو ایسا خوش کیا کہ اس نے اس کو ڈیڑھ سو سواروں کا نائک بنا دیا' لیکن جب مغلوں کے آنے سے خوف زدہ ہو کر ابھنگ خاں بھاگ گیا تو عنبر بھی ریاست کے سرحدی صوبے کی طرف روانہ ہو گیا' نہاوندی اور فرشتہ دونوں کا قول ہے کہ تلنگانا کی سرحد سے بیرھم کے ایک کوس تک' احمد نگر کے دکھن چار کوس تک اور دولت آباد سے بیس کوس چیرل کے بندرگاہ تک عنبر ہی کا دور دورہ تھا' یہاں اس نے چوری اور ڈکیتی کا انسداد کر کے امن قائم کیا' تھوڑے ہی دنوں میں اس کے پاس

قریب ترین ہزار سواروں کی ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی۔ اسی فوج کو لے کر اس نے بدر پر چھاپا مارا' قلعہ والوں نے اس کا سامنا کیا لیکن عنبر نے دم کے دم میں ان کو شکست دے دی' یہ پہلی آزاد فتح تھی جو عنبر نے اپنی ذاتی قوت بازو سے حاصل کی' اس کے بعد اس کا حوصلہ روز بروز بڑھتا گیا۔

جس طرح عنبر بیجاں ریاست کے ایک صوبے میں اپنی خاطر خواہ کارروائی انجام دے رہا تھا ٹھیک اسی طرح راجو پولاد نے بھی دوسرے صوبے میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا' اس نے دولت آباد کی شمالی سرحد سے لے کر گجرات تک اور دکھن کی طرف احمد نگر کے چھ کوس کے گرد و نواح کا حصہ ملک اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ پولاد دراصل امیر سعادت خاں کا غلام تھا لیکن ابھنگ خاں کے کہنے میں آکر اس نے دغابازی کی اور اپنے مالک کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ مغلوں کی فتح کے بعد اس نے ایک نظام شاہی شہزادے' مرتضیٰ کو جو تخت پر بٹھلایا جا چکا تھا اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا اور ضرورت کے مطابق اسے کچھ گاؤں اور اوسا کا قلعہ بھی دے دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے آٹھ یا نو ہزار سوار جمع کر لئے اور مغلوں کی چوکیوں پر چھاپا مارنے لگا' جو کوئی ملتا اسے لوٹتا اور کبھی کبھی تو ہاتھی' گھوڑے اور بار دانہ تک اڑا لیجاتا' مگر جب اس نے عنبر کے عروج کو دیکھا تو اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی' نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہو گئی اور ایک دوسرے کی جان کا گاہک بن گیا۔

ہوشیار خان خاناں ابھی دکھن ہی میں تھا' جب اسے عنبر اور پولاد کے باہمی جھگڑوں کا پتہ چلا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ موقع اچھا ہے' ایک ایک کر کے دونوں کو شکست دے کر ان کی طاقت اور ترقی کی جڑ ہی کاٹ دینا چاہئے' اس خیال کے ماتحت سنہ 1601ء میں خان خاناں ـن ایک فوج اس مقصد سے بھیجی کہ تلنگانا کی سرحد پر جو عنبر کے مقبوضات ہیں قبضہ کر لے' مغلوں کو شروع میں اپنے مقاصد میں کامیابی تو ہوئی لیکن عنبر نے جلد ہی ان کو پسپا کر دیا۔ اب خان خاناں نے اپنے بڑے بیٹے ایرج کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ عنبر کی تنبیہہ کے لئے روانہ کیا۔ نانڈیر کے قریب دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی' عنبر زخمی ہو کر گھوڑے پر سے گر پڑا ممکن تھا کہ وہ قید بھی ہو جاتا لیکن اس کے حبشی اور دکھنی غلام اس کو میدان جنگ سے اٹھا لے گئے۔ تندرست

ہو جانے پر اس نے پھر فوج بھرتی کرنا شروع کر دی' یہ دیکھ کر خان خاناں نے اس سے مصالحت کی سلسلہ جنبانی شروع کی' عنبر کو راجو کی طرف سے تو کھٹکا تھا ہی' اس لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ خان خاناں سے ملنے گیا' مغلوں نے اس کی مناسب طور پر خاطر و مدارات کی' دونوں نے آپس میں صلاح کر کے اپنے اپنے ملک کی سرحدیں طے کر لیں۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد کچھ دکھنی سرداروں نے عنبر کا ساتھ چھوڑ دیا اور مرتضیٰ نظام شاہ سے مل کر اسے اس امر کے لئے تیار کیا کہ وہ عنبر کو شکست دے' ان لوگوں نے اوسا کے قریب ایک فوج بھی جمع کی لیکن لڑائی میں عنبر ہی کی فتح رہی' اور مرتضیٰ کو صلح کر لینا پڑی' اب تو نظام شاہ کٹھ پتلی کی طرح عنبر کے قابو میں آ گیا' یہ 1603ء میں اس کو لے کر پرندا کے قلعہ کی جانب بڑھا' وہاں کے قلعہ کے محافظ منجھن خاں نے پھاٹک بند کر لیا اور یہ پیام بھیجا کہ وہ مرتضیٰ کو تو قلعہ میں آنے دے گا لیکن عنبر کو نہیں آنے دے گا' کیونکہ وہ مغلوں سے ملا ہوا ہے' ایک مہینہ تک یہ کشاکش رہی' آخرکار منجھن خاں قلعہ سے بھاگ گیا' عنبر اس میں داخل ہوا اور وہیں مرتضیٰ کو تخت پر بیٹھایا' اس کے بعد نظام شاہ اسی قلعہ میں رہنے لگا۔

عنبر کا مخالف راجو برابر مغلوں سے لڑتا ہی رہا' اس کے حملوں سے تنگ آ کر ایک بار دانیال نے (جو اس وقت دکھنی مغل صوبے میں شہنشاہ اکبر کا نمائندہ تھا)' راجو کو کہلا بھیجا کہ اگر مرد ہو تو میدان میں آ کر لڑو' اس دھوکے دھری سے کیا فائدہ۔ راجو نے جواب دیا کہ اگر میں میدان جنگ میں آ کر تم سے لڑوں اور تمہاری فوج کو کچھ نقصان پہنچ جائے تو تمہاری مدد کے لئے شہنشاہ اکبر دس گنی فوج اور بھیج دے گا لیکن اگر مجھے نقصان پہنچا تو پھلا میری مدد کو کون آئے گا' میں تو مفت ہی میں مر مٹوں گا' لیکن میں اپنے طرز عمل سے باز نہ آؤں گا' چاہے مجھے آگرے ہی تک کیوں نہ جانا پڑے۔ مرہٹہ نے لکھا ہے کہ جب 1604ء میں شاہزادہ دانیال' ناسک اور دولت آباد کے راستے' احمد نگر کو عادل شاہ کی لڑکی سے بیاہ کرنے جا رہا تھا اس وقت اس نے راجو سے صلح کا ارادہ کیا' اس کے انکار کرنے پر' اسے سزا دینے کے لئے ایک مغل فوج بھیجی گئی' جس سے ڈر کر راجو اپنے ملک کو فرار ہو گیا' لیکن رفیع الدین شیرازی کا قول اس سے مختلف

ہے' اس کی رائے کے مطابق راجو اور دانیال کے درمیان صلح ہو گئی اور یہ طے ہوا کہ کچھ مقامات کی . لگذاری دونوں نصف نصف تقسیم کر لیا کریں' اس مفاہمے کی تکمیل کے لئے ہر مقام پر مغل اور راجو دونوں کے نمائندے کام کرتے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راجو کی قوت اور شہرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ دیکھ کر مرتضیٰ کے بھی جی میں آیا کہ اس کی مدد سے وہ عنبر کی سرکردگی سے کسی طرح چھٹکارا پا جائے' چنانچہ راجو کے پاس اس نے عنبر کی شکایتیں لکھ بھیجی' اور اس کو اپنے پاس بلایا۔ راجو تو اس موقع کا منتظر ہی تھا فوراً" پرندا جا پہنچا اور عنبر کو نیست و نابود کرنے کی اجازت حاصل کر لی' ان دونوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں لیکن عنبر ہی کی ہر بار شکست ہوئی۔ مجبور ہو کر خان خاناں سے اس نے مدد کی التجا کی اور مغل فوج کی مدد سے راجو کو دولت آباد بھیجنے کے لئے مجبور کر دیا۔ اسی اثناء میں شہزادہ دانیال کا برہان پور میں انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے خان خاناں کو جالنا پور سے برہان پور آنا پڑا۔ اب انتقام کے خیال سے عنبر نے ایک بڑی فوج جمع کی مگر خان خاناں کے کہنے سے اس نے راجو سے صلح کر لی۔

پرندا پہنچ کر عنبر کو معلوم ہوا کہ راجو کی کارروائی میں بہت کچھ مرتضیٰ کا ہاتھ تھا' یہ معلوم کر کے اسے بہت غصہ آیا اور اس نے اس جگہ سے اسے علیحدہ کر دینے کا ارادہ کر لیا' مگر عادل شاہ کے کہنے سے اس کو عملی صورت نہیں دی۔ اب عنبر کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی' عادل شاہ اور خان خاناں دونوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ہونہار سپاہی ہے۔ خصوصاً عادل شاہ تو اس کی بہادری اور کارگذاری کو دیکھ کر بہت ہی معترف ہو گیا تھا۔ روز بروز اس سے تعلقات بڑھانے لگا۔ ایک دور اندیش سیاست داں کی طرح اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اس کی سلطنت کی مستقبل میں حفاظت کی ایک ہی تدبیر ہے وہ یہ کہ وہ احمد نگر کے بے جان جسم میں از سرِ نو روح پھونکنے کا انتظام کرے' اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس کو عنبر ہی ایک موزوں شخص معلوم ہوا اسی لئے عادل شاہ نے اس کو یہ صلاح دی کہ وہ مرتضیٰ سے بجائے مخالفت کے دوستی بنائے رکھے' کیونکہ اگر احمد نگر کی شہرت و ناموری کے احیاء کا اگر کوئی انتظام تھا تو مرتضیٰ ہی کے نام کے بل پر تھا' اس لئے عنبر مرتضیٰ کو لے کر جنیر پہنچا اور وہاں

نظام شاہی جھنڈا از سرنو بلند کر دیا' اپنے مالک کو زیادہ یقین دلانے کے لئے اس نے اپنی لڑکی کا اس کے ساتھ عقد بھی کر دیا۔ اس میں ایک خفیہ چال یہ بھی تھی کہ ابھی تک تو اس کی حیثیت ایک غلام کی تھی' لیکن اب اس کا رشتہ شاہی خاندان سے ہو گیا اور وہ امیر و وزیر کا خطاب بے تکلف اختیار کر سکتا ہے۔ یہ بات اس صدی میں غیر اہم معلوم ہوتی ہے لیکن ہندوستان کے قرون وسطیٰ میں اس کی جو اہمیت تھی اس کی پوری تشریح کرنا یہاں غیر ضروری ہو گا' عنبر اب چنگیز خانی یا ابھنگ خانی عنبر نہیں رہا۔

عادل شاہ نے عنبر کو صرف اچھی رائے ہی نہیں دی بلکہ اس کی حیثیت کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے قندھار کا قلعہ بھی اسے سپرد کر دیا' اس نظر عنایت کے لئے شکرے کے ساتھ عنبر نے عادل شاہ کو لکھا کہ "جب تک میرے جسم میں جان ہے' میں مغلوں کی مخالفت کروں گا' ممکن ہے کہ انہیں دکھن سے نکال بھی دوں۔" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عنبر نے اس عہد کو جی جان سے نباہا۔ قندھار کے ملتے ہی' عنبر کو اب اس بات کی عجلت ہوئی کہ کسی طرح راجو کا کام تمام کر دے' اس نے فوراً ہی ایک فوج راجو کو شکست دینے کے لئے بھیجی' بڑی کوششوں کے بعد دشمن گرفتار کیا گیا اور اس کو قتل کر ڈالا گیا۔ اب تمام احمد نگر میں عنبر کا طوطی بولنے لگا' اور اب اسی کا بول بالا تھا۔

اسی زمانے میں شہنشاہ اکبر کا آگرہ میں انتقال ہو گیا' اس سانحہ کے ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد یعنی 24 اکتوبر سنہ 1605ء کو سلطان سلیم تخت سلطنت پر بیٹھا اور اس نے نورالدین جہانگیر کا لقب اختیار کیا' انتظام سلطنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی' اکبر کے جو حوصلے تھے وہی اب جہانگیر کے مقاصد قرار پائے' صرف فرق اتنا تھا کہ نہ تو مرحوم شہنشاہ کا سا حوصلہ کسی میں تھا اور نہ ویسی صلاحیت کار۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد جہانگیر نے خان خاناں کو دکھن سے بلا لیا' خان خاناں کا جانا تھا کہ عنبر اور بھی آزاد ہو گیا' اب وہ بے خوفی سے اپنا کام کر سکتا تھا' پہلے تو اس نے اس امر کا انتظام کیا کہ دولت آباد کو پھر سے آباد کرے' مغلوں کے لگاتار حملوں اور مرہٹہ سرداروں کی غارتگری کے باعث یہ خوشحال شہر بالکل ویران ہو گیا تھا' عنبر نے یہاں کے نظام حکومت اور تحفظ کا ٹھیک ٹھیک بندوبست کیا اور یہاں کی رعایا کو ہر طرح کی آسانیاں بہم

پہنچائیں' ان کو اس بات کا یقین دلانے کی بھی کوشش کی کہ وہ بے کھٹکے اس شہر میں رہ سکتے ہیں' چنانچہ بہت جلد دولت آباد میں پہلے کی سی رونق آ گئی' صرف یہی نہیں بلکہ چاروں طرف کا ملک بھی عنبر کے ہاتھ لگ گیا اور لوگوں کو صاف صاف معلوم ہونے لگا کہ احمد نگر کی سوئی ہوئی قسمت دوبارہ جاگ اٹھی ہے۔ دو برس کے اندر اس نے مغلوں کے ہاتھ سے احمد نگر کی پوری ریاست واپس لے لی۔

مجبوراً" جہانگیر نے دوبارہ خان خاناں کو دکھن کی طرف روانہ کیا اور اس کو تاکید کر دی کہ فوراً" ہی عنبر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبا دے' عنبر نے اپنی کارروائیوں سے مغلوں کو ناراض کر ہی دیا تھا اس لئے اس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ عادل شاہ سے اپنی دوستی اور مضبوط کرے' چنانچہ اس نے یہ تجویز عادل شاہ کے پاس بیجاپور میں پیش کی کہ اگر بادشاہ مناسب سمجھے تو اپنے کسی امیر کی لڑکی کے ساتھ اس کے بیٹے کا عقد کرا دے۔ عادل شاہ نے اس کو قبول کر لیا اور یاقوت خاں حبشی کی لڑکی کا عقد عنبر کے بیٹے عزیزالملک کے ساتھ کر دیا' برات بیجاپور گئی' چالیس روز تک وہاں خوب جشن رہا' دولہا' دولہن کا خیر مقدم احمد نگر کے نئے دارالسلطنت جنیر میں فروری سنہ 1609ء میں کیا گیا۔ یہ عنبر اور عادل شاہ کی جانب سے خان خاناں اور جہانگیر کو ایک طرح کا اعلان جنگ تھا۔ خان خاناں نے کوشش تو بہت کی لیکن اپنے ماتحت افسروں کو قابو میں نہ رکھ سکا اس لئے عنبر کے خلاف کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑا۔

جہانگیر نے اس مقصد کے لئے کہ سرکاری عمال میں زیادہ اتفاق ہو جائے گا سنہ 1610ء میں امیرالامراء' مرزا شریف' آصف خاں' جعفر بیگ اور شاہزادہ پرویز کو دکھن کے صوبے میں بھیجا۔ ان لوگوں کے آنے کے بعد اپنی آزاد رائے کے مطابق خان خاناں نے برسات کے زمانے میں دشمن پر حملہ کر دیا' لیکن اپنے ساتھ کھانے پینے کو کافی سامان نہیں لیا' بھلا عنبر اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کب چوک سکتا تھا۔ مغلوں کو دھوکا دے کر گھاٹیوں میں بھگا لے گیا اور وہاں ان کو' گرسنگی کا شکار بنا لیا۔ تمام افسران فوج خان خاناں سے ناخوش ہو گئے اور اس پر دغا بازی اور ناقابلیت کا الزام لگانے لگے۔ دراصل مغلوں کو اس ناعاقبت اندیشی سے نقصان بھی بہت پہنچا۔ احمد نگر کا قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا' آصف خاں شہنشاہ کو لکھ ہی چکا تھا کہ بغیر آپ کی

موجودگی کے کچھ کام میں نہیں کر سکتا جب جہانگیر نے یہ تجویز اپنی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کی تو خاں جہاں لودی نے کہا کہ آپ کے جانے کی ضرورت نہیں' میں بیڑا اٹھاتا ہوں کہ اس کام کو پورا کئے بغیر میں منہ نہ دکھاؤں گا۔

جہانگیر اس کی باتوں میں آگیا اور اسے دکھن روانہ کر دیا۔ خان جہاں نے دکھن پہنچتے ہی جہانگیر کو لکھ بھیجا کہ جاب تک خان خاناں یہاں رہے گا کوئی کام نہیں بن سکتا۔ شہنشاہ نے فوراً" ہی خان خاناں کو واپس بلا لیا اور خان جہاں کی کارگذاری کی تعریف کرنے لگا۔

خان جہاں نے ایک بڑی اہم تدبیر سوچی یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت کی طرف سے اس کی تحریک ہوئی کہ عبداللہ خاں گجرات سے چل کر ناسک اور ترمیک کی طرف سے اور خان جہاں اور مان سنگھ وغیرہ' برار اور خاندیش کی جانب سے احمد نگر میں داخل ہوں اور چاروں طرف سے دشمن کو گھیر کے اس کو بالکل نیست و نابود کر دیں۔ تدبیر تو بہت عقلمندی کی تھی لیکن عبداللہ خاں کی سستی کے باعث ناکامیاب رہی' شکست کا حال سن کر جہانگیر بہت ناخوش ہوا' اس نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ خود جا کر کام پورا کرے لیکن پھر یہ ارادہ فسخ کر دیا خان خاناں کی قابلیت اور اس کی قدر و قیمت اب لوگوں کو معلوم ہوئی اور وہ دوبارہ دکھن روانہ کیا گیا۔ جب وہ 1612ء میں دکھن پہنچا تو اس کے لئے میدان صاف تھا' جعفر بیگ' آصف خاں' اور شریف دونوں مر چکے تھے۔

عنبر اس زمانے میں بڑی آفت میں تھا' حبشی امرا ایک ایک کر کے سب اس کے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ خان خاناں بڑی چالاکی سے اس باہمی رنجش کی آگ کو مشتعل کر رہا تھا یہاں تک کہ امیروں نے سپہ سالار اخلاص خاں تک کو قید کر لیا اور مرتضیٰ سے کہا کہ عنبر کو اس کے عہدے سے گرا کے کسی دوسرے قابل آدمی کو پیشوا وکیل مقرر کرے۔ ان لوگوں نے ادھر شاہزادہ پرویز اور خان خاناں کے پاس بھی عرضداشتیں ے بھیجیں۔ ان میں سے کچھ کو خان خاناں نے اچھی جاگیریں دیں اور کچھ کو اچھے منصب دیئے 'اپنی طاقت کو کمزور ہوتے دیکھ کر عنبر نے عادل شاہ سے درخواست کی کہ وہ ملا محمد لاری کو بھیج دے کہ وہ آ کر آپس کے نفاق کو مٹائے۔ ملا جی

تشریف تو لائے لیکن جس غرض سے بلائے گئے تھے وہ پوری نہیں ہوئی' بلکہ عنبر کی فوج پر ان کی موجودگی کا الٹا ہی اثر پڑا' حبشی امراء تو لالچ میں پڑے تھے وہ بھلا کیونکر کہنا مان سکتے تھے' دوسرے جب انہوں نے دیکھا کہ ملا جی اور مغل سپہ سالار میں دوستی ہے تو وہ اور بھی بے خوف ہو گئے' یہ بات دیکھ کر عنبر کو بھی شبہ ہونے لگا اور اس نے عادل شاہ کو لکھ بھیجا کہ ملا جی کو بلا لیں' کہتے ہیں کہ جب ملا جی واپس جا رہے تھے تو راہ میں 'مغل سپہ سالار شاہ نواز خاں اور اس کے بھائی داراب خاں نے پالکی کے قریب آ کر ان کو سلام کیا' اس تعظیم و تکریم کا معاوضہ ملا جی کو بیجا پور پہنچ کر ادا کرنا پڑا' وہاں ان کی سب جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور وہ دو برس تک بیکار بیٹھے رہے' یہ سب عنبر کو خوش کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔

باغی حبشی امرا' روزانہ مغل نائب سپہ سالار سے یہی تجویز کرتے تھے کہ وہ عنبر سے جنگ شروع کر دے۔ بہت غور و فکر کے بعد شاہ نواز خاں نے یہ بات مان لی اور احمد نگر میں داخل ہوا' لڑتا جھگڑتا پٹن تک تو پہنچ ہی گیا یہاں اس نے پڑاؤ ڈال دیا۔ جلد ہی جاسوسوں نے آ کر خبر دی کہ عنبر بھی چالیس ہزار کا ایک جم غفیر لئے ہوئے اسی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ شاہ نواز کا پڑاؤ بہت ہی محفوظ جگہ پر تھا کیونکہ اس کے اور غنیم کے فوج کے درمیان دریا حائل تھا اس لئے وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ دوسرے دن عنبر آ ہی پہنچا۔ بہت ہی گھمسان کی لڑائی ہوئی عنبر کی فوج تتر بتر ہو گئی اور خود اسے بھی میدان سے بھاگنا پڑا۔ غنیم نے کھرکی پر جو اب نظام شاہی دارالسلطنت تھا حملہ کر دیا۔ اور وہاں کے تمام شاہی عمارات کو مسمار کر ڈالا۔ غریب عنبر یہ سب دیکھتا رہا۔ ایسی حالت میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ اس موقع پر مصنف تذکرۃ الملک بھی احمد نگر میں عنبر کی فوج میں موجود تھا اس نے یہ تمام تفصیلات بیان کئے ہیں۔ مغلی حملے اور امرا کے بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو اصلاح شدہ ریاست کے ہاتھ سے ملک کا بہت سا حصہ نکل گیا۔ اور مغلوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ خان خاناں بھی اب اپنا سر بلند کر سکتا تھا۔

احمد نگر کی وقتی بربادی ہو ہی رہی تھی کہ شاہزادہ خرم بھی اپنی فوج لے کر دکھن آ پہنچا۔ بیجا پور اور گولکنڈہ نے ڈر کر صلح کر لی۔ مجبور ہو کر عنبر نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ چڑھتی ہوئی آندھی کے سامنے کون اپنی جان دیتا لیکن شاہزادے کے واپس جانے کے

بعد عنبر نے پھر اپنی چالیں شروع کر دیں سنہ 1520ء میں اس عہد کو جو چار برس پہلے مغلوں کے ساتھ ہوا تھا عنبر نے توڑ ڈالا۔ احمد نگر اور برار کا زیادہ حصہ از سرنو اس کے ہاتھ آگیا اور مغلوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ خان خاناں تو بہت ہی شرمندہ ہوا یہاں تک کہ رو پڑا۔ جہانگیر کو لکھ بھیجا کہ اگر جلد مدد نہ آئی تو میں جان دے دوں گا۔ لاچار ہو کر شہنشاہ نے شاہ جہاں کو دوبارہ دکھن بھیجا۔ آتے ہی اس نے میدان مارا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کو توڑ کر اپنی طرف ملا لیا اور عنبر کو اکیلا کر دیا۔ آخرکار 1621ء میں تینوں ریاستوں نے صلح کر لی اور بیجاپور نے اٹھارہ لاکھ گولکنڈہ نے بیس لاکھ اور احمد نگر نے بارہ لاکھ روپیہ خراج دینا منظور کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شاہ جہاں نے اپنے باپ کے حکم کے خلاف ورزی کی اور باغی ہو گیا۔ اس موقع پر عنبر نے جو پالیسی برتی اس کا تفصیلی حال ڈاکٹر بنی پرشاد کی کتاب "جہانگیر" میں موجود ہے یہ تحریک احمد نگر کے لئے مفید ہی ہوئی کیونکہ جب سلطنت کی ساری طاقت شاہ جہاں کو شکست دینے میں لگی ہوئی تھی اس وقت عنبر کو اپنے زائل شدہ اقتدار کے دوبارہ حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ احمد نگر کی آزادی کا جھنڈا پھر سے لہرانے لگا اسی لئے وہ عنبر کا مرہون منت تھا۔ اس نے ایک طرف تو بیجاپور کو نیچا دکھایا اور دوسری طرف مفرور شاہزادہ شاہ جہاں کو پناہ دے کر اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اس طرح اس نے ساری زندگی احمد نگر ہی کی خدمت میں صرف کی اور اس کو دوبارہ زندہ کر کے 1626ء میں انتقال کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ دکھن کی تاریخ میں اس کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

تحقیق کے نئے زاویے

معلومات اور امپائر

ڈاکٹر مبارک علی

جیسے جیسے ریاست کا ادارہ مستحکم ہوتا چلا گیا اسی طرح سے لوگوں پر ریاست کی نگرانی بھی بڑھتی رہی۔ یہ نگرانی دو طرح کی تھی: ایک تو یہ کہ حکمران طبقہ اپنے مخبروں، جاسوسوں اور سرکاری عہدیداروں کے ذریعہ اس کی خبر رکھتا تھا کہ عوام میں ان کے خلاف سازش، ہنگامہ، بغاوت نہ ہو۔ اور اگر اس کے بارے میں انہیں شہادت مل جائے تو اسے وقت سے پہلے دبا دیا اور ختم کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ لوگوں کے مسائل سے باخبر رہا جائے اور کوشش کی جائے کہ ان کے مسائل حل ہوں تاکہ رعیت و ریاست کے درمیان جو خلیج ہے وہ دور ہو جائے اور لوگوں میں یہ احساس ہو کہ ریاست و حکمراں طبقہ ان کا محافظ اور رعایا پرور ہے۔

سی۔ اے۔ بیلی (C. A. Bayly) نے اپنی کتاب "امپائر اور انفاریشن" میں 1780 سے 1870 کے دوران اس بات کا تجزیہ کیا ہے کہ برطانوی حکومت کو اس عرصہ میں ہندوستان کے معاشرے کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے میں کیا مشکلات پیش آئیں۔ انہوں نے کس طرح سے روایتی اداروں اور جدید طریقوں کو استعمال کیا تاکہ ہندوستان اور اس ملک کے لوگوں کے بات میں مکمل معلومات ہوں۔ معلومات اکٹھی کرنے اور لوگوں کی نگرانی کرنے میں اس کا تصادم مقامی لوگوں کی مخالفت سے ہوا۔ اس کے نتیجہ میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ نوآبادیاتی "نالج سسٹم" کیسا ہو اور اس کے ذریعہ کیسے تسلط کو برقرار رکھا جائے۔ جب کہ ہندوستانیوں کا اپنا نالج سسٹم تھا کہ جس کے ذریعہ انہوں نے برابر نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کی۔

بیلی نے اپنی اس کتاب میں اس کش مکش اور تصادم کو بیان کیا ہے: وہ مخبری کے ادارے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ قدیم عہد ہی سے اس ادارے کی اہمیت تھی، مثلاً ایک ہندو مفکر کماندا کی اپنی کتاب "سیاست کے ابتدائی اصول" میں

حکمراں کو مشورہ دیتا ہے کہ مخبروں کو زیارت کی جگھوں' مندروں اور خانقاہوں میں رکھنا چاہئے۔ وہ لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ وہ زائر یا پجاری یا برہمن ہیں' مگر ان کا مقصد معلومات اکٹھی کرنا ہو۔ عام لوگوں میں جا کر خبروں کے لئے مخبروں کو قلندروں' جوگیوں' یا امراء کے بھیس میں ہونا چاہئے کہ ان پر شک و شبہ نہ ہو۔ انہیں جو بھی اطلاعات ملیں وہ جمع کر کے تحریری طور پر بادشاہ کو بھیجیں۔

اگر بادشاہ کسی مہم پر جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ساتھ تیز رفتار دوڑنے والے کھوجی' اور راستوں سے واقف لوگوں کو لے جائے' جنہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ پانی کہاں ملے گا' دریا کو کہاں سے پار کرنا چاہئے' اور دشمن سے محفوظ پڑاؤ کہاں ڈالنا چاہئے ان معلومات کے لئے لوگ قبائلیوں سے لئے جا سکتے ہیں۔

ان مخبروں کے ذریعہ بادشاہ ریاست کے احوال سے اس قدر واقف ہو کہ وہ یہ کہہ سکے کہ اسے ریاست و لوگوں کے بارے میں سب معلوم ہے۔

یہ معلومات محض بادشاہ کی اجارہ داری نہیں تھی۔ بلکہ عوام بھی اپنی معلومات کا ایک سسٹم رکھتے تھے۔ ہندوستان میں جغرافیائی ماحول' ان گنت زبانیں بولنے والے' مختلف ذات پات کے لوگ اور قبائل تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود افواہیں تیزی سے گردش کرتی تھیں۔ تاجر و زائرین کے ذریعہ معلومات پھیلتی تھیں۔ شادی و بیاہ و براتوں کے ذریعہ ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچ جاتی تھی۔ اگرچہ علم پر برہمنوں کا تسلط تھا' مگر پھر بھی لوگوں میں زبانی روایات کے ذریعہ علم پہنچ جاتا تھا۔

حکمران کے لئے نالج پر کنٹرول رکھنا اس لئے ضروری تھا کیونکہ اسے لگان جمع کرنا ہوتا تھا' امن و امان قائم رکھنا ہوتا تھا' بغاوت و شورش کی شکل میں فوجیں مہیا کرنا اور مہم جوئی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے انتظام سلطنت کے لئے ضروری تھا کہ اس کے پاس ہر قسم کی معلومات ہوں۔ (کوٹلیہ نے ارتھ شاستر میں سلطنت کے استحکام کے لئے مخبروں کو لازمی قرار دیا ہے۔ عہد سلاطین میں ڈاک چوکی کے انتظام پر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کافی تفصیل دی ہے)

مغلوں نے اپنی حکومت کے دوران ڈاک چوکی کے نظام کو موثر بنایا۔ ہر صوبہ و ضلع میں وقائع نگار یا وقائع نویس ہوتے تھے۔ جو اپنے علاقہ کی تمام خبروں کو جمع کر کے بادشاہ کو روانہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ خفیہ نویس یا سوانح نگار ہوتے تھے جو کہ خفیہ

طور پر رپورٹیں بھیجتے تھے۔ دربار میں بھی وقائع نویس ہوتے تھے کہ جو دربار کی کارروائی لکھتے تھے۔

داروغہ ڈاک چوکی اس بات کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ آنے و جانے والی ڈاک میں پابندی ہو۔ جو لوگ ڈاک لے کر جاتے تھے یہ "ہرکارہ" (یعنی ہر کام کرنے والا) کہلاتے تھے گرز بردار بادشاہ کے خاص احکامات عہدے داروں اور امراء کو پہنچاتے تھے۔ کوتوال شہر کی خبریں رکھتا تھا۔ گاؤں کا چوکیدار مکھیا اور پٹواری کے پاس یا قانون گو کے پاس خبریں لا کر دیتا تھا۔

مغل دربار میں امراء' منصب داروں' اور ہمسایہ ملکوں کے حکمرانوں کے وکیل ہوتے تھے جو اپنے آقاؤں یا سرپرستوں کو دربار کی تمام معلومات پابندی سے پہنچاتے تھے۔ امراء جب دربار سے دور ہوتے تھے تو ان کے وکیل دربار میں ان کے مفادات کی نگرانی کرتے تھے۔ اگر ان کے خلاف کسی سازش کی سن گن پاتے تو فوراً اسے مطلع کرتے تھے۔

بادشاہ نہ صرف سرکاری ذرائع سے معلومات اکٹھی کرتا تھا' بلکہ سیاحوں' صوفیوں' قلندروں' اور زائرین کے ذریعہ سے بھی کہ جو پورے ملک میں گھومتے رہتے تھے ان کی سرپرستی کر کے ان سے خبریں لیتا تھا۔ یہ تمام معلومات ریکارڈ ہوتی تھیں۔ (مغلوں کے ڈاک چوکی نظام کے بارے میں یورپی سیاحوں کے بیانات معلومات افزا اور دلچسپ ہیں۔ ان میں برنیر' ٹامس رو' منوچی اور دوسرے کئی سیاح شامل ہیں)

مغل ریاست و سلطنت کی کمزوری اور زوال کے ساتھ ان کا پوسٹ اور مخبری کا نظام بھی ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ اورنگ زیب کے آتے آتے وقائع نویسوں کی رپورٹیں یا تو راستے میں گم ہو جاتی تھیں یا غلط ہوتی تھیں۔ شبہ تھا کہ پنجاب کے کھتری ذات کے وقائع نویس سکھوں کے ہمدرد تھے لہٰذا بادشاہ کو صحیح معلومات فراہم نہیں کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ راستے بھی محفوظ نہیں رہے تھے' وقائع نویسوں کو وقت پر تنخواہ کی ادائیگی نہیں کی جاتی تھی اور صوبوں میں امراء کی طاقت بڑھ گئی تھی اس لئے ان کے خلاف رپورٹ کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ان سب وجوہات نے مل کر معلومات کے اس پورے نظام کو ناقابل بھروسہ کر دیا۔

مغلوں کے زوال کے نتیجہ میں جو صوبائی ریاستیں وجود میں آئیں انہوں نے اپنے

مخبری کے نظام کو مستعدی اور عمدگی کے ساتھ چلایا کیونکہ ان کی بقا کا انحصار معلومات پر تھا کہ مرکز میں یا ہمسایہ ریاستوں میں' یا خود ان کے اندرونی معاملات میں رعیت کا کیا رویہ ہے۔ لکھنؤ' حیدر آباد' اور مرہٹہ ریاستوں میں مخبری کا نظام اس لئے بھی اہم تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارادوں' منصوبوں اور عزائم کے بارے میں پوری واقفیت رکھنا چاہتے تھے۔ میسور میں خصوصیت سے حیدر علی اور ٹیپو نے بیرونی و اندرونی حالات سے واقفیت کے لئے مخبری کے نظام کو ترتیب دیا تھا۔ حیدر آباد کی ریاست اس نظام کے ذریعہ امراء کے اخلاق کی نگرانی' ان کی دعوتوں اور عورتوں سے ان کے تعلقات کی بھی تفصیل رکھی جاتی تھی۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے آہستہ آہستہ اپنے سیاسی اقتدار کو قائم کیا تو ان کی معلومات تجارتی اور سیاسی نوعیت کی تھیں۔ مثلاً ہندوستان میں کپڑے کی صنعت کے بارے میں تفصیلات۔ ان کے اس علم میں کمپنی کے دلالوں نے ان کی مدد کی آرمینی تاجر جو پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے' انہوں نے کمپنی کا ساتھ دیا۔ سیاست کے دائرے میں ان کی معلومات ابتداء میں بہت کم تھیں' ریاستوں کے جھگڑوں اور خانہ جنگیوں سے آگے ان کی دلچسپی نہیں تھی۔ ان جھگڑوں کی نوعیت میں آرمینیوں' مقامی عیسائیوں' اور کمپنی کے ملازم ہرکاروں نے اس کی مدد کی۔ لیکن کمپنی کے ابتدائی عہدے دار ہندوستان کے سیاسی نظام کو انگلستان کے نظام کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا اسی ماحول میں "مشرقی مطلق العنانیت" کا نظریہ ابھرا کہ مشرق میں بادشاہ کو مکمل اختیارات حاصل ہیں۔

1765ء میں کمپنی کو بنگال و بہار میں دیوانی کے اختیارات ملے تو اس کو موقع ملا کہ وہ صنعت و حرفت' زراعت' اور ملک کی جغرافیائی حالات کے بارے میں معلومات اکٹھی کرے۔ اس سلسلہ میں مغل عہد کے عہدیدار' جو کہ زوال کے بعد بیروزگار تھے وہ کمپنی کی ملازمت میں آ گئے۔ جیسے محمد رضا خاں' جس نے زراعت اور ریونیو کے بارے میں کمپنی کو اہم معلومات فراہم کریں۔ گورنر جنرل ہاسٹنگز نے خود کو سابق حکمرانوں کا وارث سمجھتے ہوئے کتابوں کے ذریعہ ہندوستان کے ماضی کو تلاش کیا۔ 1784ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام اس سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اب ہندوستان کی تاریخ کو انگریزوں کے نقطہ نظر سے بیان کیا گیا کہ اس کے تحت مسلمانوں کا دور

حکومت ظالمانہ تھا۔ اکبر رواداری کا مظہر تھا تو اورنگ زیب عدم رواداری اور مذہبی تعصب کا علمبردار۔

1775ء سے 1815ء تک ہندوستانی ریاستوں میں ریذیڈنٹ ہوا کرتے تھے جن کا کام تھا کہ ریاست کے بارے میں ہر قسم کی معلومات کا ریکارڈ رکھیں۔ اس مقصد کے تحت سروے کرائے گئے' ملک کے مختلف علاقوں کے نقشے تیار ہوئے' تجارت' ذات پات' اور دوسری سیاسی و سماجی و معاشی معلومات کو اکٹھا کیا گیا۔ کمپنی کا جیسے جیسے سیاسی اقتدار بڑھتا گیا' ایسے ایسے کمپنی کی معلومات پر اجارہ داری قائم ہوتی چلی گئی۔ اس معلومات کو صرف اپنے میں محدود کرنے کی غرض سے کمپنی نے ہندوستانی ریاستوں کے درمیان خط و کتابت بند کرا دی۔

اب کمپنی کا اپنا نظام تھا کہ جس میں پوسٹ' ہرکارے' جاسوس اور مخبر ہوا کرتے تھے۔ ہرکارہ کا ادارہ ہندوستان میں بڑا پرانا تھا۔ یہ ایک پیشہ تھا کہ جس کے اراکین خبریں پہنچانے' اور معلومات کی ترسیل میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ہرکارے امراء' حکمران' اور کمپنی کے عہدیداروں کے ملازم ہوا کرتے تھے۔ ان کا مخصوص لباس ہوتا تھا۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہوتا تھا' جسے یہ اکثر کاندھے پر رکھ کر چلا کرتے تھے۔ ان کے فرائض میں یہ تھا کہ خطوط اور چھٹیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائیں۔ نچلی ذات کے وہ لوگ جو دوڑ کر پیغامات پہنچاتے تھے وہ "دوڑیہ" کہلاتے تھے۔ ہرکارہ اور دوڑیہ دونوں کو دوڑنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ہرکارہ دوڑیہ کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔ یہ زبانی پیغامات بھی دیتا تھا اور جواب بھی لے کر آتا تھا۔ اگر کوئی حکمران ہرکارے کے ساتھ برا سلوک کرے' اسے شہر سے نکال دے' اس کا منہ کالا کرائے' یا قتل کرائے' تو اس کا مطلب اعلان جنگ ہوا کرتا تھا۔

کمپنی اس بات کی پوری کوشش کرتی تھی ریاستی حکمرانوں کو صحیح اطلاعات نہ ملیں۔ لہٰذا جن ریاستی حکمرانوں کے وقائع نویس کلکتہ میں ہوتے تھے اور اپنے حاکموں کو کمپنی کے بارے میں اطلاعات بھجواتے تھے تو کمپنی ان اطلاعات کو غلط ثابت کرنے کے لئے اپنے سفیروں کو استعمال کرتی تھی۔ جو وقائع نویس ہوشیار ہوتے تھے انہیں کلکتہ میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کے خطوط کو راستے میں روک لیا جاتا تھا۔ دوسری طرف کمپنی ریاستوں کے بارے میں مکمل معلومات اکٹھی

کرتی رہتی تھی۔ مثلاً دربار کی سرگرمیاں' سازشیں' امراء کی گروہ بندیاں وغیرہ۔

کمپنی کے ابتدائی زمانہ میں منشیوں نے اطلاعات کی فراہمی میں اس کی مدد کی۔ منشی ایک ایسا شخص ہوتا تھا کہ جسے فارسی زبان اور اس کے اسلوب پر عبور ہوتا تھا۔ یہ دفتر کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ تجارتی فرموں اور امراء کی جائیداد کا انتظام و انصرام اس ہی کی ذمہ داری تھا۔ چونکہ ابتدائی کمپنی کے عہدیدار فارسی سے ناواقف ہوتے تھے اس لئے وہ خطوط' دستاویزات اور فرامین کو سمجھنے کے لئے منشیوں کے محتاج ہوتے تھے۔ یہ منشی ہی ابتدائی عہدیداروں کے استاد ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک تو نہیں ہوتا تھا اور حقارت سے انہیں "کالے اسکول ماسٹر" کہا جاتا تھا' مگر دستاویزات و خطوط کے لئے ان کا محتاج ہونا پڑتا تھا۔ بعد میں جب انگلستان میں کمپنی کے عہدیداروں کی تربیت کے لئے ہیل بری (Hailbury) اور کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوئے تو یہاں انہیں فارسی اور اردو کی تعلیم دی گئی تاکہ وہ منشیوں کے محتاج نہ رہیں اور سرکاری کاغذات کو خود پڑھ سکیں۔ کہتے ہیں کہ ولیم سلمن پہلا انگریز تھا جو اودھ کے نواب سے فارسی و اردو میں گفتگو کرتا تھا۔

بیلی کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے دو نسلوں کے اندر ہندوستان پر اس لئے قبضہ کیا کیونکہ ایک تو سمندر پر ان کی حکمرانی تھی' دوسرے بنگال کا ریونیو ان کے پاس آگیا تھا۔ تیسرے ہندوستان کے بارے میں معلومات' جس کے لئے اس نے مخبروں اور خفیہ ایجنسیوں کو استعمال کیا اور ان کی مدد سے اپنے خلاف مزاحمتوں کو ختم کیا۔

صرف یہی نہیں مزید معلومات کے لئے انہوں نے ہمسایہ ملکوں اور ریاستوں میں خفیہ سیاسی مشن بھیجے جیسے وسط ایشیا' ایران' اور افغانستان۔ (ایک ایسے ہی مشن پر محمد حسین آزاد کو بھی بھیجا گیا تھا) پنجاب جو اس وقت سکھوں کے قبضہ میں تھا اور سندھ جس پر پہلے کلہوڑے اور پھر ٹالپر آئے وہاں بھی ان کے خفیہ مشن گئے (ایک ایسے ہی مشن میں ڈیل ہوسٹ (Delhost) نامی سرویر کو بھیجا گیا جو کچھ کے راستے سندھ آیا اور خفیہ طور پر سندھ کا سروے کیا۔ ایک دوسرے مشن میں الکزنڈر برنس (Alexander Burnes) نے دریائے سندھ کا سروے کیا۔ بہانہ یہ کیا کہ وہ دریا کے راستے رنجیت سنگھ کے لئے ایک گھوڑا گاڑی بطور تحفہ لے جانا چاہتے ہیں۔ انگریزوں کی کشتیاں دیکھ کر دریائے سندھ کے کنارے ایک بوڑھے نے کہا تھا کہ "انگریزوں نے

دریا دیکھ لیا ہے' اب سندھ ان کا ہے۔) ان مشنوں کے ذریعہ انہوں نے تمام سیاسی و سماجی معلومات اکٹھی کر لیں۔ پنجاب و سندھ کی فتح میں ان معلومات کا بڑا ہاتھ تھا۔

انگریزوں نے اپنی معلومات کی بنیاد پر ہندوستان کی تشکیل کی۔ اس میں ہندوستانی معاشرہ کا ذات پات میں تقسیم ہونا' ٹھگ' ان کے خفیہ گروہ' خفیہ زبان' ڈاکو اور جرائم پیشہ قبائلی وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے ٹھگی' ڈاکوزنی اور جرائم پیشہ قبائل کی سرگرمیوں کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ برطانوی حکومت اور اس کی امن کی کوششوں کو اجاگر کیا جائے۔ ہندوستان کی اس پوری تشکیل میں ہندوستان کا معاشرہ اور کلچر بکھرا ہوا' ٹوٹا ہوا' بے ترتیب اور بدامنی کا شکار نظر آتا ہے کہ جس کو ترتیب دینا اور منظم کرنا برطانوی حکومت کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

1830ء سے 1840ء کی دہائیوں میں شمالی ہندوستان میں پریس کا استعمال بہت کم تھا۔ ریاستوں کے حکمراں اس سے ڈرتے تھے۔ 1849ء میں اودھ کے بادشاہ نے اپنی ریاست میں پریس بند کرا دیئے تھے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ چھپائی کا کام شروع ہوا اور اس نے انفارمیشن کو پھیلانے میں اہم حصہ لیا۔

ہندوستان کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ نوآبادیاتی نظام سے پہلے ان کا کوئی نظام نہیں تھا۔ معلومات کو پھیلانے کا ان کا ایک مربوط سسٹم تھا کہ جس میں ہرکارے' وقائع نویس کے علاوہ بازار اور تاجر و دکاندار معلومات کو تیزی سے پھیلاتے تھے۔ بازار میں یا کوتوالی کے سامنے ایک چبوترہ ہوتا تھا کہ جس پر لوگوں کے سامنے حکومت کے احکامات و بادشاہ کے فرامین پڑھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے نیپال کی جنگیوں' افغانوں اور سکھوں کی جنگیوں اور ملتان کی بغاوت کی خبریں فوراً" پورے ہندوستان میں پھیل گئیں۔ افواہوں اور گپوں کے ساتھ ساتھ جب اخبارات کی اشاعت شروع ہوئی تو وہ بھی خبروں کا ایک ذریعہ بن گئے۔ اس کے علاوہ مسجد' زیارت گاہیں' مشاعرے' پتلی کا تماشہ دکھانے والے فقیر و طوائف' مراثی اور ڈرامہ کرنے والے' سب حکومت کے بارے میں تشبیہوں و استعاروں کے ساتھ اپنی باتیں لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اہل ہندوستان اس سے واقف نہیں تھے۔ کیونکہ افواہوں' اور تقریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں یورپ کے حالات کا ضرور علم تھا۔

ہندوستان کے اس نظام کو ختم کرنے کی ایسٹ انڈیا نے پوری پوری کوشش کی۔ اور ہر اس طریقہ کو اختیار کیا کہ جس سے صرف نوآبادیات کا نالج سسٹم رہے اور باقی سب کو ختم کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے 1830ء میں "مفید علوم کی تبلیغ" کے لئے ایک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے مقاصد میں یہ تھا کہ اہل ہندوستان کے عقائد پر حملہ کر کے انہیں ختم کیا جائے تاکہ وہ ذہنی طور پر مغربی علوم سے متاثر ہو کر اس کے تابع ہو جائیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہندو مت اور اسلام غیر عقلی مذاہب ہیں' جب کہ عیسائیت عقلیت پر ہے۔ یورپی فکر روشن خیالی اور رواداری پر ہے۔ اس لئے اس تعلیم کو پھیلانے کے لئے نصاب کی کتابوں اور مشنری اسکولوں کی ضرورت ہے۔ مزید جدید علوم پر شائع شدہ کتابیں انگلستان سے منگائی جائیں' بک اسٹالوں اور کتب خانوں کا قیام ہو تاکہ یہ کتابیں دستیاب ہو سکیں۔

1836ء میں حکومت نے نجی پوسٹ کو ممنوع قرار دے دیا۔ کیونکہ اب حکومت پوسٹ پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے' معلومات کے دوسرے ذرائع کو بند کرنا چاہتی تھی۔

ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کا جو پروگرام بنا اس میں یورپی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ انتظامی امور پر کتابیں لکھی گئیں۔ جیمس مل' ایڈورڈ ٹامپسن اور جان کے نے تاریخ پر کتابیں لکھیں تاکہ اب ہندوستان کے بارے میں جو بھی علم ہو وہ انگریزوں کے ذریعہ سے آئے۔

اب نوآبادیاتی نظام نے ہندوستانی تاریخ کے دوسرے شعبوں میں دخل دیا' مثلاً میڈیسن' جغرافیہ' علم نجوم' تاکہ ہندوستان آریو ویدک' اور یونانی طب و علم نجوم کو ختم کیا جائے۔ اگر ہندوستانیوں نے مغربی علوم کو اختیار تو کیا مگر اپنے روایتی علوم سے بالکل انحراف نہیں کیا اور انہیں بھی برقرار رکھا۔ ان کے حکیم' وید' جنتریاں' مزار' تصویر' اور گنڈے پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

انگریزی حکومت کو اس وقت سخت دھچکہ لگا جب 1857ء میں ان کا مخبری اور جاسوسی کا نظام بالکل فیل ہو گیا اور اس کے برعکس اہل ہندوستان نے اپنے روایتی نظام کے ذریعہ خبروں کو تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیلا دیا۔

لہٰذا جب 1857ء کا ہنگامہ ختم ہوا تو انہوں نے دوبارہ سے اپنے مخبری کے نظام کو

ترتیب دیا۔ اخبارات پر پابندیاں لگائیں' پوسٹ کو سنسر کیا جانے لگا۔ پولیس' سی۔ آئی۔ ڈی' اور فوج کی خفیہ ایجنسیوں کو منظم کیا گیا۔ نئی ٹکنالوجی نے ان کے مخبری کے نظام کو تقویت دی۔

مگر اس کے باوجود ہندوستان کا ردعمل اپنی جگہ رہا۔ اگر ایک طرف حکومت کی معلومات پر اجارہ داری تھی' تو دوسری طرف لوگ افواہوں' گپ شپ' خفیہ پمفلٹوں' خطوط' اور دوسرے ذرائع سے حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے اور حکومت کی اجارہ داری کی مزاحمت کرتے تھے۔

اس مزاحمت میں شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ' اور سیاستدانوں سے تقریروں کے ذریعہ الفاظ کے گورکھندوں کو استعمال کر کے اپنے جذبات کو لوگوں تک پہنچایا اور حکومت اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ہندوستان کے نالج سسٹم کو مکمل طور پر تباہ نہیں کر سکی۔

نوآبادیات کے خاتمہ کے بعد' گلوبلائزیشن کے عمل میں ایک بار پھر معلومات پر اجارہ داری کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو اسی وقت مزاحمت کی جا سکتی ہے کہ جب اپنا نالج سسٹم ہو۔ مگر ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں کہ جہاں معلومات پر حکومتوں کی اجارہ داری ہے۔ وہ اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال کر کے' اسے عوام کی نظروں میں بے معنی بنا دیتی ہیں۔ اس لئے عوامی قوتوں کو صحیح معلومات کے لئے اپنی حکومتوں سے بھی لڑنا ہوتا ہے اور عالمی پروپیگنڈے سے بھی۔

قدیم یونانی عورت

ڈاکٹر مبارک علی

> اب کم از کم اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جب مرد کارہائے نمایاں سرانجام دے رہا تھا' یعنی اداروں کی تعمیر کر رہا تھا' تہذیب و ثقافت اور اشیاء پیدا کر دیا تھا' لوگوں پر حکومت کر رہا تھا' اور ان سرگرمیوں میں مصروف تھا کہ جسے آج ہم تاریخ کہتے ہیں۔ تو اس وقت عورتیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور کر رہی تھیں۔ یعنی زیادہ سے زیادہ مرد پیدا کر رہی تھیں کہ جو تاریخ تشکیل دیں' اور زیادہ سے زیادہ عورتیں پیدا کر رہی تھیں تاکہ مرد پیدا ہوں۔ (فوکس گینوے)

دنیا کی تہذیب و تمدن میں یونانی فلسفوں' مفکروں' ادیبوں' شاعروں اور سیاستدانوں کا بڑا اہم حصہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جغرافیائی طور پر اس محدود خطہ میں ایسی ذہنی و علمی ترقی ہوئی کہ جس نے دنیا کو بدلنے' تبدیل کرنے' اور حالات سے مقابلہ کرنے کا سبق دیا۔ لیکن جہاں ایک طرف اعلیٰ علمی و ادبی اور سائنسی نظریات پیدا ہوئے' شہری جمہوریتوں نے' جمہوری روایات و اقدار کو پیدا کیا' وہیں پر یونان نے غلامی کے ادارے کو قائم کر کے اسے ایک اخلاقی جواز فراہم کیا۔ غیر ملکیوں کے ساتھ تعصب کا رویہ اختیار کیا۔ اور عورت کی حیثیت کو انتہائی پس ماندہ بنا کر اسے مرد کے تابع کر دیا۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ جہاں اعلیٰ اور اونچی سطح کی علمی بحثیں ہوئیں' جہاں اخلاق' انصاف' اور حقوق کی بات ہوئی' وہیں پر غلاموں' غیر ملکیوں' اور خصوصیت سے عورتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔

جب سے عورتوں کی تحریک کی ابتداء ہوئی ہے' اس وقت سے عورتیں تاریخ میں

عورت کی حیثیت اور اس کے کردار کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی سو بلنڈیل (Sue Blundell) کی کتاب "قدیم یونان میں عورت" (Women in Aciant Grece) ہے۔ یہ 1995ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

مصنفہ نے کتاب کے شروع میں اس کی تشریح کی ہے کہ قدیم یونان سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ اس عہد کو 3000 ق-م سے لے کر 4 اور 5 صدی عیسوی تک لاتی ہے 750 ق-م سے 336 ق-م تک کے عہد کو وہ یونانی تہذیب کی تشکیل کا عہد قرار دیتی ہے کہ جس میں اداروں کی حیثیت متعین ہوئی' اور عورت کے کردار کو مناسب سانچہ میں ڈھالا گیا۔ جیسا کہ قدیم تاریخ میں ہے' اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ مشکل اس لئے پیش آتی ہے کہ اس میں معلومات کی کمی ہوتی ہے۔ اگر عورتوں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہیں تو وہ بھی طبقہ اعلیٰ کی عورتوں سے متعلق ہیں۔ عام عورتیں تاریخی عمل میں غائب ہیں۔ اس عہد میں عورتوں کے نام بھی نہیں ملتے ہیں۔ سیفو ایک ایسی عورت ہے کہ جس کا نام اس کی شاعری نے محفوظ کر دیا ہے۔ لٰہذا عورتوں کے بارے میں تمام معلومات کا ذریعہ مرد ہیں۔ مردوں کی نظر سے عورت کو ادب' مصوری اور مجسمہ سازی میں دیکھا گیا ہے۔ عورتیں اپنے بارے میں کہیں بولتی نظر نہیں آتی ہیں کہ ان کا اپنے بارے میں کیا خیال تھا' وہ مردوں کے بارے میں کیا سوچتی تھیں' اور ان کے اس وقت کے کیا مسائل تھے۔ اس لئے آج مورخوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے' وہ انہیں شہادتوں پر انحصار کریں کہ جو مردوں نے چھوڑی ہیں' اور انہیں کی بنیاد پر معاشرے میں عورت کی حیثیت کا تعین کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ ادب' مصوری' اور مجسمہ سازی میں کس طرح سے پیش کی گئی ہے۔

یونان کے دیو مالائی قصوں میں جہاں دیوتا ہے وہ دیویاں بھی ہیں' ان میں شہزادیاں بھی ہیں' اور ملکائیں بھی دیوی و دیوتاؤں کی دنیا میں' یہ انسانوں کی طرح رہتے ہیں۔ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ آپس میں لڑائی جھگڑے کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں۔ یہاں دیویاں کبھی انتہائی اہم ہو جاتی ہیں اور کبھی غیر اہم۔ مثلاً مشہور شاعر ہیسوئڈ (Hesiod)

نے اس قصہ کو بیان کیا کہ یونانی دیوتا زوس (Zeus) نے پہلی عورت پنڈورا (Pandora) بنائی جس نے مردوں کی دنیا میں تباہی پھیلا دی۔ لہٰذا ایک طرف عورت مرد کی ضرورت تھی تو دوسری طرف وہ ان کے لئے نقصان و تباہی کا باعث بھی تھی۔ اب تک مرد ہنسی و خوشی رہتا تھا' مگر پہلی عورت نے مرتبان کھول کر دکھ' غم' تکلیف اور افسردگی کو ہر طرف پھیلا دیا۔ ان تمام پریشانیوں میں صرف "امید" باقی رہ گئی۔ ایک حصہ یہ بھی ہے کہ عورت کو مٹی سے بنایا گیا اور مرد کو بطور تحفہ اسے دیا گیا۔ لہٰذا ابتداء ہی سے اس کی سرشت میں دھوکہ شامل ہے جب یہ کہا گیا کہ عورت بطور تحفہ ہے تو اس میں دونوں خصوصیات شامل ہیں : یہ تباہی بھی لاتی ہے' مگر نسل انسانی کے تسلسل کے لئے بھی ضروری ہے۔ یہ بچے پیدا کرتی ہے جو خاندان کا نام رکھتے ہیں اور جائیداد کی حفاظت کرتے ہیں۔

یونان کی دیویوں میں کنوارا پن انتہائی اہم تھا۔ یہی خصوصیت یونان کے معاشرہ میں اہم ہو گئی کہ عورت شادی تک کنواری رہے۔ ہومر کی نظم ایلیڈ (Illiad) میں عورت محض ملکیت' تحفہ اور شئے ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس عہد میں یونانی مسلسل جنگوں میں مصروف رہا۔ عورتیں مردوں کو جنگ سے روکتی بھی نظر آتی ہیں اور انہیں جنگ پر اکساتی بھی ہیں۔ مگر ہر صورت میں وہ مرد کے تابع ہیں۔ ان کا خود سے اپنا کوئی کردار نظر نہیں آتا ہے۔ ان کا ہر عمل مرد سے متعلق ہے۔

ہومر کی دوسری نظم "اوڈیسی" میں مرد کا تسلط نظر آتا ہے۔ اس میں لڑکا اپنی ماں سے کہتا ہے کہ وہ گھر جائے اور کپڑا بننے میں مصروف ہو جائے۔ مردوں کا کام بحث و مباحثہ ہے اور عورت کا کام گھریلو مصروفیات۔ شادی کا ادارہ وجود میں آ چکا تھا مگر اس کا مطلب مرد کی بالا دستی تھا یعنی مرد آزاد سیلانی اور عورت کا محافظ و نگران تھا۔

لیکن جہاں ایک طرف عورت گھر میں قید اور مرد کی نگرانی میں تھی' وہاں اسی عہد میں امازون (Amazon) عورتوں کے بارے میں قصے و کہانیاں بھی مشہور ہوئیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ بحر اسود کے جنوب مشرق کی رہنے والیاں تھیں (موجودہ شمال ترکی) یہ مردوں کی طرح رہتی تھیں' شکار کرنا اور جنگ لڑنا ان کے مشاغل تھے۔ یہ بغیر مردوں کے رہتی تھیں اور سال میں صرف دو مہینہ مردوں سے ملنے کے لئے رکھتی تھیں۔ اگر

ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تھی تو اسے رکھ لیتی تھیں' اگر لڑکا ہوتا تھا تو اسے پہاڑ کی دوسری طرف رہنے والے مردوں کو دے دیتی تھیں۔ آثار قدیمہ یا کسی اور شہادت سے ان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ آخر میں مردوں کے ہاتھوں انہیں شکست ہوتی ہے اس کا اخلاقی سبق یہ ملتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کی نقل نہیں کرنی چاہئے' ورنہ اس کا انجام ان کی تباہی میں ہو گا۔

750 ق-م سے لے کر 500 ق-م تک وہ عہد ہے کہ جب یونان میں شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ ادارے بنے' قوانین کی تشکیل ہوئی' رسم و رواج کا تعین ہوا۔ اس عہد میں عورت کی حیثیت کے بارے میں معاشرے کے رجحانات پختہ ہوئے۔ اس عہد میں لڑکیوں کو پیدائش کے بعد مارنے کے واقعات ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ پیدا ہونے کے بعد اسے کسی جگہ پر چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ مر جائے۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ آبادی کو کنٹرول کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ مستقل رواج نہیں تھا' بلکہ کبھی کبھی کچھ والدین یہ کیا کرتے تھے۔

جب یونان میں شہری ریاست مستحکم ہو گئی تو پھر اس ریاست کی مضبوطی اور پائیداری کے لئے خاندان کی یک جہتی اور اتحاد ضروری ہو گیا۔ اس وجہ سے وراثت کا رواج ہوا۔ وارث لڑکے ہوتے تھے' اور خاندان مرد کے تابع ہوا کرتا تھا۔ ابتداء میں امراء برادری کے باہر شادیاں کیا کرتے تھے تاکہ ان کا اثر و رسوخ بڑھے۔ مگر بعد میں شادیاں خاندان کے اندر ہی ہونے لگیں تاکہ وہ متحد رہے اور بکھرنے نہیں پائے۔

امراء کے خاندانوں میں لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ جیسے رتھوں کی دوڑ' بحث و مباحثہ' یا رقص۔ شادی سیاسی اثر و رسوخ کو بڑھانے اور دولت کے حصول کے لئے کی جاتی تھی۔ آخر میں شادی کا مقصد زیادہ دولت اور جائیداد حاصل کرنا ہو گیا۔ جس کی شکایت ایک شاعر اس طرح سے کرتا ہے:

> ایک اچھا آدمی نچلے درجہ کی عورت سے شادی کرتا ہوا نہیں گھبراتا ہے' بشرطیکہ اس کے پاس دولت ہو۔ نہ ہی ایک شریف عورت کو کم درجے کے مرد سے شادی کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ وہ خاندان سے زیادہ دولت کو ترجیح دیتی ہے۔

ابتداء میں مرد شادی سے پہلے لڑکی کے حصول کے لئے' اس کے باپ کو تحفہ دیا کرتا تھا' لیکن بعد میں جہیز کا رواج ہو گیا۔ کیونکہ اب وراثت کے قوانین میں تبدیلی آ گئی تھی۔ لڑکی کو باپ سے جو جائیداد ملتی تھی اس کا انتظام اس کا شوہر کیا کرتا تھا۔ جہیز کی اس رسم سے خیال کیا جاتا تھا کہ شادی کے بندھن مضبوط ہو جائیں گے۔ کیونکہ طلاق کی صورت میں شوہر کو جائیداد واپس کرنی ہوتی تھی۔ اس لئے جائیداد یا جہیز کو رکھنے کی خاطر مرد عورت سے بہتر سلوک کرتا تھا۔ جہیز کی رسم نے عورت کی حیثیت کو اس طرح بدلا کہ اب اسے تحفہ دے کر کوئی خریدتا نہیں تھا' اب یہ ضروری نہیں رہا کہ اس کے حصول کے لئے رقم دی جائے۔ بلکہ اس کے برعکس باپ بیٹی کو جہیز دیتا تھا تاکہ اس کا مستقبل محفوظ رہے۔ لیکن یہ رواج امراء کے طبقہ تک محدود تھا۔ غریب لوگ شادی اس لئے کرتے تھے تاکہ خاندان کا سلسلہ چلے۔ امراء میں عورت کا کنوارا ہونا ضروری تھا۔ اس لئے لڑکیوں کی نگرانی کی جاتی تھی' جب کہ نچلے طبقوں کی عورتیں کام کاج کرنے کی وجہ سے آزاد تھیں۔ مرد ایک بیوی رکھتا تھا' مگر وہ دوسری عورتوں سے تعلقات رکھ سکتا تھا۔ لیکن شادی شدہ عورت کے لئے ناجائز تعلقات رکھنا جرم تھا۔ قانون داں سولن (Solan) کے قانون کے تحت اگر لڑکی کنوارا پن کھو دے تو باپ کو یہ حق تھا کہ اسے بطور کنیز فروخت کر دے۔ امراء کی عورتیں پردے میں رہتی تھیں اور جب باہر آتی تھیں تو چہرے پر نقاب ڈالتی تھیں۔

سولن نے عورتوں کے لئے جو قوانین بنائے تھے ان میں اس کے لباس کی تراش خراش کا تعین تھا۔ اور گھر سے باہر آنے پر پابندی تھی' معاشرے میں عورت کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ وہ جائیداد' خاندان' اور ریاست کا اہم ستون تھی' کیونکہ وہی جائیداد کا وارث پیدا کرتی تھی جو کہ خاندان کا سربراہ ہوتا تھا اور یہ خاندان ریاست کے وفادار ہوتے تھے۔ جائیداد کے وارث کے لئے مرد ہونا ضروری تھا۔ اس لئے اگر وارث نہ ہو تو متبنی بنانے کا رواج تھا۔ اگر بھائی نہ ہو تو باپ کے مرنے کے بعد لڑکی کسی قریبی رشتہ دار سے شادی کرتی تھی تاکہ لڑکا پیدا ہو اور وہ جائیداد کا وارث ہو۔ اس طرح دیکھا جائے تو جائیداد کی حفاظت میں عورت کا کردار اہم ہو جاتا ہے۔

یونان کے شاعروں میں عورت کا تصور معاشرے کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔

وہ تباہی کا باعث ہے' معاشی بوجھ ہے' مگر مرد کی ضرورت بھی ہے۔ ان کی شاعری میں عورت کی تو تعریف ہے مگر بیوی کی نہیں۔ دوسری عورتوں کے حصول کا جذبہ شدت کے ساتھ ہے۔ ان کے ہاں عورتوں کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مثلاً طوائف کو بیل کہا گیا ہے۔ لڑکی جسے ورغلایا جا سکے وہ ہرن کی مانند ہے۔ خوبصورت عورت کو گھوڑے کی مانند بتایا گیا ہے۔ یعنی عورت کا تصور "دوسرے" کا ہے۔ خود سے وہ کچھ نہیں ہے۔

صرف سیفو وہ شاعرہ ہے کہ جس کی شاعری میں محبت اور جذبات ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت مرد کو کیسے دیکھتی ہے۔

650 ق-م تک مجسموں میں عورت نظر آتی تھی۔ یہ مجسمے پبلک مقامات پر ہوتے تھے۔ لیکن 480 ق-م اور 479 ق-م میں جب ایرانیوں نے ایتھنز پر قبضہ کیا تو اس سے عورت کی حیثیت کو نقصان پہنچا اور عورتوں کے مجسمے غائب ہو گئے۔ ان کے بجائے وہ مرد ہیرو بن گئے' جنہوں نے جنگوں اور کھیلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ 6 ق-م میں مجسمہ تراشی کا فن اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اب جو مجسمے تراشے گئے ان میں سے ایسے مجسمے بھی تھے کہ جن میں مردوں کو برہنہ دکھایا گیا تھا۔ مگر عورتوں کو اس طرح سے برہنہ نہیں دکھایا گیا۔ اس کی وجہ سے مرد کا جسم تو سب پر واضح ہو گیا' مگر عورت کا جسم چھپا ہوا رہا۔

ان مجسموں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرد متحرک ہیں جب کہ عورتیں ساکت اور غیر متحرک۔ یہ رجحان عورت و مرد کی تفریق کو پوری طرح سے ظاہر کرتا ہے۔

500 ق-م سے 336 ق-م کا دور اس لئے اہم ہے کیونکہ اس عہد میں بطور شہری ریاست کے ایتھنز کا عروج ہوتا ہے۔ ایتھنز علمی' ادبی' ثقافتی اور سائنسی علوم میں ترقی کرتا ہے۔ جب اس عہد میں عورتوں کے بارے میں معاشرے کے خیالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو بہت سے دلچسپ مشاہدات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً طبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو چونکہ اس شعبہ میں مرد ڈاکٹر ہوتے تھے اس لئے وہ عورتوں کو مردوں کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ طب کی کتابوں میں عورتوں کی بیماریوں کا زیادہ ذکر

ہے- مردوں کی بیماریاں کم ہیں- اس پر اس لئے زیادہ زور دیا گیا کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورتیں مردوں سے مختلف ہوتی ہیں- عورتوں کی صحت کے لئے یہ ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی شادی کر دی جائے کیونکہ جنسی تعلقات سے ان کی صحت ٹھیک رہتی ہے- عورت اگرچہ بچہ تو پیدا کرتی ہے مگر وہ اس کی حقدار نہیں کیونکہ یہ مرد کا بیج ہے جو وہ اپنے رحم میں رکھتی ہے-

ایتھنز کا معاشرہ چونکہ زراعتی تھا اس لئے وہاں زمین کی قدر تھی- کوئی خاندان یہ نہیں چاہتا کہ زمینی جائیداد اس سے نکل کر کسی دوسرے خاندان میں جائے- اس لئے اس کا وارث لڑکا ہوتا تھا- اگر لڑکا نہ ہو تو پھر لڑکی کا لڑکا وارث ہوتا تھا-

لڑکی کی شادی 16 یا 18 سال کی عمر میں کر دی جاتی تھی تاکہ وہ خود کو شوہر کی عادت کے مطابق ڈھال لے- طوائفوں کا طبقہ بھی موجود تھا تاکہ مرد ان سے لطف اندوز ہوں- کنیزیں خدمت کے لئے ہوتی تھیں- بیویاں جائز اولاد پیدا کرنے کے لئے- عورتوں کو بطور داشتہ رکھنے کا بھی رواج تھا- غریب لوگ اپنی لڑکیاں امراء کو معاہدے کے بعد دے دیا کرتے تھے- اس معاہدے کے دوران وہ اس کے علاوہ کسی اور سے جنسی تعلقات نہیں رکھتی تھی- اس کے بچوں کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا اور نہ ہی وہ شہریت حاصل کر سکتے تھے- اگر شوہر کو بیوی کے ناجائز تعلقات کے بارے میں پتہ چل جائے تو اسے قتل کا حق تھا- وہ تعلق رکھنے والے مرد سے جرمانہ بھی طلب کر سکتا تھا- عورت کو بطور سزا کنیز کے طور پر فروخت بھی کر سکتا تھا- اس جرم پر شوہر یا باپ کے علاوہ ایتھنز کا کوئی بھی شہری عدالت میں جا سکتا تھا کیونکہ یہ جرم صرف خاندان کا نہیں بلکہ کمیونٹی کا تھا-

عورت کو کسی قسم کے سیاسی حقوق نہیں تھے- نہ وہ ووٹ دے سکتی تھی' نہ اسمبلی میں شریک ہو سکتی تھی اور نہ جیوری اور کونسل کی ممبر بن سکتی تھی-

امراء کی عورتوں کے عام جگہوں پر نام بھی نہیں لئے جاتے تھے- یونانی مورخ تھیوسی ڈائڈس کا کہنا ہے کہ "کسی عورت کی عظمت اس میں ہے کہ اس کا ذکر مردوں میں کم سے کم ہو' چاہے وہ تعریف میں ہو یا برائی میں-"

عورتوں کو ایسے نام دیئے جاتے تھے کہ جن سے ان کی کوئی صفت ظاہر ہو جیسے

مسرت' امن' اطمینان اور خوشبو وغیرہ- عورتیں گھر سے باہر تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھیں- عورت کی تعلیم کے بارے میں خیال تھا کہ "عورت کو پڑھانا ایسا ہی ہے جیسے سانپ کو اور زہر آلود کر دیا جائے-" عورت گھر میں مہمانوں کے سامنے نہیں آتی تھی اور نہ کسی کے آنے پر گھر کا دروازہ کھولتی تھی- اسے بازار جا کر خریداری کرنے کی اجازت نہیں تھی- نہ ہی وہ شوہر کے ساتھ کسی محفل میں شریک ہوتی تھی- گھر میں عورتوں کے لئے علیحدہ حصہ ہوا کرتا تھا (زنان خانہ)-

جس معاشرے میں بیویوں اور لڑکیوں پر سختی ہو' اور انہیں پردہ میں رکھا جائے وہاں طوائفیں اور داشتائیں آزاد ہوتی ہیں جو مردوں کے ساتھ محفلوں میں جاتی ہیں- ان کے ذوق کی تسکین کرتی ہیں- مرد ان کی محفلوں میں خوش و خرم ہوتے ہیں- یہی صورت ایتھنز کی تھی کہ جہاں طوائف کی حیثیت آزاد عورت کی تھی اور جو مرد کو جسمانی طور پر بھی لذت فراہم کرتی تھی.اور ذہنی لحاظ سے بھی اسے آسودگی دیتی تھی-

لیکن اسی عہد میں اسپارٹا کا معاشرہ ایتھنز سے جدا تھا- یہاں خاندان سے زیادہ ریاست اہم تھی- یہ ایک ایسی ریاست تھی کہ جس کے دفاع کے لئے ضروری تھا کہ مرد صحت مند' طاقت ور' اور جنگ جو ہوں- اس لئے لڑکوں کو 7 سال کی عمر سے 30 سال تک کیمپ میں رکھا جاتا تھا- اگرچہ وہ 20 سال کی عمر میں شادی تو کر لیتا تھا مگر بیوی کے ساتھ 30 سال کی عمر میں رہتا تھا- اس کے بعد بھی کھانا وہ گھر کے بجائے کیمپ کے میس میں کھاتا تھا- معاشرہ میں اس نظام کی وجہ سے گھر میں باپ کی اتھارٹی گھٹ گئی تھی اور باپ کی غیر حاضری میں ماں کا اثر بچوں پر بڑھ گیا تھا- 7 سال تک بچہ ماں کے پاس رہتا تھا- تیس سال کی عمر میں جب باپ واپس آتا تو وہ کیمپ میں ہوتا تھا- لڑکی باپ اور بھائی دونوں سے دور ماں کے ساتھ رہتی تھی- لڑکوں کے ساتھ ساتھ اسپارٹا میں لڑکیاں بھی جسمانی ورزش کرتی تھیں' وہ گھڑ سواری کرتیں' رتھ چلاتیں' اور کھیلوں میں حصہ لیتی تھیں- لڑکوں کے ساتھ برہنہ ہو کر دوڑ میں شریک ہوتی تھیں- اس کے علاوہ مذہبی جلوسوں میں جانے اور رقص کرنے کی اجازت تھی- لہٰذا اسپارٹا کی عورت بہترین کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی صحت مند ہوتی تھی-

یہ رواج بھی تھا کہ کئی بھائی مل کر ایک بیوی رکھتے تھے اور سب اس سے بچے پیدا کرتے تھے۔ اگر شوہر بوڑھا ہوتا تو نوجوان بیوی کسی سے تعلق کرکے بچے پیدا کر لیتی تھی۔ معاشرہ کا مقصد تھا کہ بچے صحت مند ہوں۔ اس لئے بیوی کو ادھار دینے کی بھی رسم تھی۔ (بچوں کے لئے جائز و ناجائز کی شرط نہ تھی۔ عورت جائیداد کی بھی وارث ہوتی تھی۔ اس لئے جب ایتھنز کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت کو دیکھا گیا تو وہ برتر تھی۔ کیونکہ یہاں خاندان سے زیادہ ریاست کا مفاد اہم تھا۔ خاندان کے ادارے کی اس کمزوری نے عورت کی اہمیت کو بڑھا دیا۔ جب کسی نے اسپارٹا کی عورت سے یہ سوال کیا کہ وہ کیوں مردوں پر حاوی ہیں تو اس کا جواب تھا "کیونکہ ہم انہیں پیدا کرتے ہیں۔"

ہندوستان اور روہیلے

ڈاکٹر مبارک علی

مسلمان خاندانوں کے دور حکومت میں افغان یا پٹھان بڑی تعداد میں وقتاً" فوقتاً" آتے رہے۔ ان کا مقصد تجارت سے لے کر سیاست ہوا کرتا تھا۔ وطن سے دور ہو کر بھی وہ اپنی روایات کو برقرار رکھتے تھے۔ قبائلی نظام کو قائم رکھتے ہوئے آپس میں شادی بیاہ کرتے تھے' اس وجہ سے ہندوستان کی دوسری قوموں سے ان کے تعلقات نہیں بڑھے۔ قبائلی نظام کی وجہ سے ان میں انتقام کا جذبہ تھا' لہٰذا آپس میں مسلسل لڑتے رہتے تھے۔ اس نے ان کی پوزیشن کو کمزور رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بیرم خاں نے اپنے لڑکے عبدالرحیم کی منگنی اسلام خاں سور کی لڑکی سے کر دی تھی جسے افغانوں نے پسند نہیں کیا۔ اس کے قتل میں اس جذبہ کا بھی حصہ ہے۔

افغان جاگیردار اپنی جاگیروں کو موروثی بنا لیتے تھے اور اس میں بادشاہ کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس روایت کی وجہ سے بادشاہ ان کا تبادلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ہر جاگیردار اپنی جاگیر میں اپنے قبیلہ کے ساتھ آباد ہوتا تھا جو ہر بحران میں اس کا ساتھ دیتے تھے جب لودی خاندان میں مطلق العنانیت آئی تو افغان جاگیرداروں نے اس کی مخالفت کی۔ ہندوستان سے ان کی سلطنت کا خاتمہ ان کی آپس کی ناچاقی اور لڑائیوں کی وجہ سے ہوا۔

جب بابر ہندوستان پر قابض ہوا تو اس نے افغانوں سے دوستانہ تعلقات رکھے اور بہار میں افغان جاگیرداروں کو اسی طرح رہنے دیا۔ ہمایوں کے ابتداء میں ان سے ٹھیک تعلقات تھے مگر انہوں نے شیر شاہ سوری کی سربراہی میں شکست دے کر اسے ہندوستان سے نکال دیا۔ اس لئے جب اکبر نے مغل سلطنت کو مضبوط کیا وہ تو افغانوں سے دور ہی رہا اور انہیں اعلیٰ عہدے نہیں دیئے۔ اس کے دربار میں دولت خاں لودی جو ایک

ہزار سواروں کا منصب دار تھا جب وہ مرا تو اکبر نے کہا کہ "آج شیر خاں اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔" جہاں گیر کو جب تخت نشینی میں وقت پیش آئی تو اس نے راجپوتوں کے مقابلہ میں افغانوں کی ایک وفادار جماعت بنائی اور انہیں اہم و اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ جس کی ایک مثال خان جہاں لودی ہے۔ انہوں نے اس کا جواب وفاداری سے دیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو منظم و طاقت ور کیا۔ لیکن جب شاہ جہاں کے دور میں خان جہاں لودی نے بغاوت کی اور یہ امید کی کہ افغان سلطنت کا احیاء ہو جائے، تو مغل دربار میں ایک بار پھر یہ اپنا مقام کھو بیٹھے۔

افغانوں نے مغلوں کے زوال کے بعد ایک بار پھر اپنی طاقت کو اکٹھا کیا اس بار کیتھر کے مقام کو اپنا مرکز بنا کر اول تو اسے روہیل کھنڈ بنایا اور پھر یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اس موضوع پر ایک کتاب تو 1944ء میں اقبال حسین کی

The Ruhela Chieftancies : The Rise and Fall of Ruhela Power in India in the Eighteenth Century.

ہے۔ جس میں روہیلہ سرداروں کی سیاسی تاریخ دی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ایک دوسری کتاب یوس۔ جے۔ ایل۔ گومنس (Jos J. L. Gommans) کی ہے۔

The Rise of the Indo-Afghan Empire. C.1710-1780.

یہ 1995ء میں لائیڈن سے چھپی ہے۔

گومنس کتاب کی ابتداء کرتے ہوئے اس بحث کو پیش کیا ہے کہ جس میں مورخین کا ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ سمندری راستوں کی دریافت کے بعد وسط ایشیا' ایران اور افغانستان کے تجارتی راستے بند ہو گئے۔ تجارت کے اس نقصان نے عثمانی' صفوی اور مغل سلطنتوں کو زوال پذیر کیا۔ اس کے برعکس دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ سمندری راستوں کی دریافت نے خشکی کے راستے تجارت کو بالکل ختم نہیں کیا تھا۔ یورپی طاقتیں ان سلطنتوں کی سرحدوں پر تھیں۔ جب ان بڑی سلطنتوں کا زوال ہوا تو اس کی جگہ چھوٹی ریاستوں نے پر کی۔ جیسے وسط ایشیا میں بخارا و سمرقند' ہندوستان میں مرہٹہ ریاست اور ایران میں ژند ریاست وجود میں آئی۔ یہ ریاستیں بھی اپنی جگہ طاقت ور تھیں اور تجارتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔

اب جو نئی تحقیق ہوئی ہے اس نے ثابت کیا ہے کہ شمالی ایران سے لے کر ترکی تک خشکی کے راستوں تجارت جاری رہی۔ اٹھارویں صدی میں ایران' ترکی' اور ہندوستان کے سرحدی قبائل ایک نئی طاقت کے ساتھ ابھرے۔ ہندوستان میں یہ افغان قبائل تھے۔ مغل سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی ریاستیں قائم کیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افغان اتنی بڑی تعداد میں ہندوستان کیسے پہنچے؟

گومنس کا کہنا ہے کہ افغان ہندوستان میں گھوڑوں کی تجارت کے ذریعہ آئے۔ چونکہ ہندوستانی افواج کے لئے گھوڑے ضروری تھے اس لئے ان کی منڈی میں مسلسل مانگ تھی۔ افغان قبائل بدوی معیشت میں ہمیشہ متحرک رہتے تھے۔ کھلے میدانوں اور پہاڑوں میں انہیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑتی تھی اس لئے یہ ہتھیار بند رہا کرتے تھے۔ اس لئے جب ضرورت پڑتی تھی یہ فوج کی ملازمت بھی کر لیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے روہیل کھنڈ میں اپنی ریاست قائم کر لی تب بھی یہ مویشی چرانے والے' کاشت کار' تاجر بھی رہے اور جنگ جو بھی۔ اٹھارویں صدی میں ان کا ہندوستان کی سیاست میں اہم کردار رہا ہے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑھا تو اس نے ان تجارتی راستوں کو بند کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے انہیں معاشی طور پر نقصان ہوا۔ اس لئے ان کی بڑی تعداد کرایہ کے فوجی بن گئے اور مختلف ریاستوں کو اپنی فوجی خدمات فروخت کرنے لگے۔ کرایہ کے فوجیوں کی حیثیت سے یہ اپنے حکمران کو لگان بھی جمع کر کے دیتے تھے اور جب موقع ملتا تو لوٹ مار بھی کرتے تھے۔

گومنس پٹھان' افغان' اور روہیلہ کا فرق بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ مشرقی افغانستان کے پشتو بولنے والوں کو ہندوستان میں پٹھان کہا جاتا تھا۔ ان میں اور افغانوں میں یہ فرق کیا جاتا تھا کہ پٹھان غیر متمدن ہوتے تھے اور افغان مہذب۔ روہیلہ سترہویں صدی میں روہ سے آنے والوں کے لئے استعمال ہوا۔ یہ علاقہ ہندوکش اور کوہ سلیمان کہلاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں جب روہیلہ روہیل کھنڈ میں آباد ہوئے تو یہاں انہوں نے اپنی ریاست بنالی۔

اس کے بعد گومنس اس تاریخی پس منظر کو بیان کرتا ہے کہ جس میں افغان قبائل

معاشی طور پر متحرک ہوئے۔ اکثر افغان قبائل خانہ بدوش تھے' لہٰذا جب یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تو زراعتی پیداوار کو بھی ساتھ میں لیجاتے تھے جو شہروں میں فروخت کر کے منافع کماتے تھے۔ چونکہ یہ ٹیکس نہیں دیتے تھے اس لئے منافع کی شرح زیادہ ہوتی تھی۔ یہ خانہ بدوشی کی زندگی میں اس قدر آزاد اور خودمختار تھے کہ کہیں آباد ہونے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ہندوستان میں یہ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ بلخ و بخارا سے یہ گھوڑے خریدتے تھے اور ہندوستان میں حکمرانوں اور امراء کی ضرورت کے تحت انہیں فروخت کرتے تھے۔ لودی اور سوری خاندان کے لوگ گھوڑوں کی تجارت کرتے ہوئے ہی ہندوستان میں آئے تھے۔

چونکہ ہندوستان میں گھوڑوں کے لئے چراگاہیں نہیں تھیں' اس لئے جب بھی حملہ آور گھڑ سواروں کے ساتھ آئے ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ چارہ کا رہا۔ اس لئے وہ زیادہ عرصہ ہندوستان میں نہیں ٹھہر سکے۔ تیمور اور نادر شاہ اسی لئے واپس چلے گئے اور مغلوں نے یہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

گھوڑوں کے علاوہ تازہ یا خشک میوے' پھل' سلک اور خام سلک بہاولپور' ملتان' ڈیرہ غازی خاں سے ہوتی ہوئی ہندوستان آتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ تجارت کی وجہ سے ہندوستان میں چاندی آیا کرتی تھی۔ مگر ایسا نہیں یہ تجارت ہی کے ذریعہ یہاں سے وسط ایشیا چلی جاتی تھی۔ ہندوستان اور وسط ایشیا کے تجارتی راستوں پر کھتری اور مارواڑی آباد ہو گئے تھے۔ ان کی آبادیاں باکو اور استر آباد تک تھیں۔

درانی حکومت نے جب سندھ پر اپنا اقتدار قائم کیا تو اسے وسط ایشیا سے ملا دیا۔ احمد شاہ نے افغانوں کے لئے سندھ کے راستے حج پر جانا مقرر کیا۔ اس عہد میں ٹھٹھہ اور سندھ کے دوسرے شہر تجارتی مرکز بن گئے۔ یہاں سے اون اور سوت کا کپڑا افغانستان اور وسط ایشیا جایا کرتا تھا۔ اس تجارت کو روکنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1750ء میں ٹھٹھہ میں تجارتی کوٹھی قائم کی تھی۔ جب تجارت ٹھٹھہ سے کراچی منتقل ہوئی تو 1775ء میں یہ تجارتی کوٹھی بند کر دی گئی۔ تجارت کے فروغ کے لئے درانی حکمرانوں نے ہندو بنیوں اور ساہوکاروں کو شکار پور' ملتان' ڈیرہ غازی خاں' قندھار اور کابل میں آباد کیا۔ اسی تجارت نے یہودیوں کو بھی یہاں آباد ہونے کی ترغیب دی' لس

بیلہ میں یہودی بنکروں کا پتہ چلتا ہے جو انیسویں صدی میں غائب ہو گئے۔

یہ تاجر جنہیں درانی حکومت نے سہولتیں دی تھیں یہ احمد شاہ ابدالی کو اس کی مہمات کے لئے پیسہ دیا کرتے تھے۔ جب پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو شکارپور کا زوال ہو گیا اور سندھ کے تاجر ملتان و امرتسر میں آکر آباد ہو گئے۔ اٹھارویں صدی میں درانی سلطنت کی وجہ سے افغانستان تجارت کا مرکز رہا کہ یہاں سے تاجر وسط ایشیا' ایران' ہندوستان باکو' ماسکو اور بیجنگ جاتے تھے۔ تجارت کی ترقی کی وجہ درانی سلطنت میں ٹیکسوں کا نظام اور ساہوکاروں سے ادھار ملنے کی سہولتیں تھیں۔

احمد شاہ درانی ہندوستان میں مغلوں کی مدد کے لئے آیا تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ مغلوں کی نالائقی اور کمزوری کی وجہ سے ہندوستان میں دین اسلام محفوظ نہیں رہا ہے' انتظام سلطنت ٹوٹ گیا ہے۔ اس لئے اس کی مدد کی ضرورت ہے تاکہ وہ دوبارہ سے اسلام کو مضبوط کر سکے۔ اس نے خود کو شہنشاہ در دوزاں کے خطاب دیا تھا۔ اس نے عثمانی سلطان کو خط میں اپنے کارناموں کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ ہندوستان مغلوں کی مدد کے لئے آیا تھا کہ جس کے حکمراں کو مرہٹوں اور سکھوں نے کٹھ پتلی بنا رکھا تھا۔ دہلی جو دارالسلام تھا وہ ان کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ اس نے قبضہ کے بعد کافروں کی تمام نشانیوں کو مٹا دیا۔ اس کی اپنی تشریح کے مطابق' اس کا جہاد غزنوی و غوری حکمرانوں کا تسلسل تھا۔ ہندوستان میں روہیلہ افغانوں نے ابتداء میں تو ابدالی کو اپنا حکمراں نہیں مانا' مگر بعد میں انہوں نے اسے اپنا سربراہ تسلیم کر لیا۔

گومنس اپنے مطالعہ میں گھوڑوں کی تجارت پر خاص توجہ دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے گھوڑوں کی پرورش کے بارے میں بھی اہم معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ گھوڑوں کی نسل کی ابتداء جنوب مشرقی روس سے ہوئی اور یہاں سے یہ ایشیا' یورپ میں گئے۔ ایشیا کی معتدل آب و ہوا اور پتوں والی گھاس ان کی افزائش کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں گھوڑوں کی پرورش کے امکانات کم تھے کیونکہ اول تو اچھی زمین کاشت کے لئے استعمال ہوتی تھی' دوئم گھوڑا وہ گھاس نہیں کھاتا تھا جس میں کھاد کا استعمال ہوا ہو۔ چارہ کی گھاس کی کمی کی وجہ سے ہندوستان مین اس کی خوراک کا مسئلہ تھا۔ اگرچہ بارش کے موسم میں گھاس تیزی سے اگتی تھی' مگر گرمی میں

اس قدر تیزی سے خشک ہو جاتی تھی۔ چند علاقے ایسے تھے کہ جہاں چارہ مل جاتا تھا۔ ان میں روہیل کھنڈ اور راجستھان کے کچھ حصے شامل تھے۔ چارہ کی کمی کی وجہ سے گھوڑے اناج پر گذارا کرتے تھے مثلاً گیہوں' جو' اور چنے۔ جنوبی ہندوستان میں چاول ابال کر اس میں بکرے کا گوشت ملا کر گھوڑے کو کھلاتے تھے۔

اس وجہ سے ہندوستان میں گھوڑوں کی مانگ ہمیشہ رہتی تھی۔ خاص طور سے عربی گھوڑے سب سے عمدہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کی ضرورت فوج کے لئے بھی ہوتی تھی اور بوجھ اٹھانے اور عام سواروں کے لئے بھی۔ گھوڑوں کی تجارت وسط ایشیا اور ایران کے ذریعے ہوتی تھی لیکن اگر سیاسی حالات کی وجہ سے یہ راستے بند ہو جاتے تھے تو پھر خلیج فارس کے ذریعہ انہیں لایا جاتا تھا۔ سلاطین کے عہد میں انہیں "بحری" گھوڑے کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ گھوڑوں کی قسموں میں تازی' ترکی' اور کوہی تھے۔ ہندوستان میں ان گھوڑوں کو میلوں اور منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اس تجارت میں سب سے زیادہ اہم تاجر افغان ہوا کرتے تھے۔

اس کے بعد گومنس لکھتا ہے کہ روہ سے ہندوستان آنے والوں میں اکثریت یوسف زئی قبیلہ کی تھی۔ یہ قندہار و کابل سے سوات و باجوڑ آئے اور یہاں اپنی حکومت قائم کی' اس کے بعد ان میں سے اکثریت نے ہندوستان کا رخ کیا۔ مغلوں نے کئی افغانی قبائل کو اپنی ملازمت میں لے لیا تھا۔ مثلاً خویشگی جنہوں نے سوریوں کے خلاف ان کی مدد کی تھی' انہیں ان خدمات کے عوض قصور میں جاگیریں دیں اور فوجدار کا عہدہ عطا کیا۔ آفریدی قبیلہ کو درہ خیبر کی نگرانی پر مقرر کیا۔ خلیلی قبیلہ کو اٹک اور خیبر کے درمیانی علاقے دیئے۔

ہندوستان میں آنے کے بعد گھوڑوں کی تجارت کے ذریعہ انہیں دولت بھی ملی اور فوجی تجربہ بھی ہوا۔ اس لئے انہوں نے اٹھارویں صدی میں روہیل کھنڈ میں اپنی سلطنت قائم کر لی اور تاجر سے حکمران بن گئے۔ جو بھی افغان قبائل روہیل کھنڈ آتے تھے یہاں آ کر وہ روہیلہ کہلاتے تھے۔

روہیلہ سلطنت مغلوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کے لئے خطرناک تھی۔ اس کے قیام کی وجہ سے مغل سلطنت کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ دوسرے ان کی وفاداری

مغل خاندان کے بجائے درانی حکمران سے تھی۔ کمپنی کے لئے یہ اس لئے خطرناک تھی کہ یہاں افغانوں کا اجتماع ہو گیا تھا کہ جو جنگ جو و لڑاکو تھے اور کمپنی کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی جرات رکھتے تھے۔

روہیلوں نے نہ صرف جنگ جو ہونے کا ثبوت دیا بلکہ انتظامی امور میں بھی انہوں نے اپنی قابلیت دکھائی۔ انہوں نے روہیل کھنڈ میں گھوڑوں کی پرورش کی۔ کاشت کے لئے جنگلات کو صاف کیا اور سلطنت میں امن و امان کو قائم کیا۔ اس کی وجہ سے ان کی ریاست خوش حال اور پرامن ہو گئی۔

اٹھارویں صدی میں افغان ریاستوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے افغانوں کی شناخت ابھری۔ لہٰذا اب شجرے اور نسب کی بنیاد پر افغانوں کو متحد کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ روہیل کھنڈ کے حکمران حافظ رحمت خاں نے "خلاصتہ الانساب" کتاب لکھی۔ اس کے نزدیک نسب کی اہمیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ افغان اپنی شناخت کو مستحکم کریں تاکہ وہ ہندوستان کے معاشرے میں ضم ہو کر ختم نہ ہو جائیں۔ انہوں نے اپنے ہندوستان آنے میں تجارت کو اہمیت نہ دی بلکہ یہ کہ وہ یہاں جہاد کی غرض سے آئے ہیں۔ اور ہندوستان میں اسلام کی سربلندی ان کا مقصد ہے۔ اس لئے افغان شناخت کے ساتھ ساتھ روہیل کھنڈ سنی راسخ العقیدگی کا بھی مرکز بن گیا۔

جب اودھ کی سلطنت اور کمپنی نے مل کر روہیل کھنڈ کی ریاست کو ختم کیا (1780ء) تو اس کے ساتھ ہی افغانوں کے اس مرکز نے اپنی سیاسی و مذہبی اہمیت کو کھو دیا۔

غصہ اور تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

انسان کے جذبات تاریخی عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں' اس لئے اب تاریخ نویسی میں یہ اہم تبدیلی آئی ہے کہ وہ ان جذبات کو تاریخ کے فریم ورک میں رکھ کر ان کی اہمیت اور اثرات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مورخ جذبات کا تجزیہ کرتے ہوئے نفسیاں داں یا عمرانیات کے ماہر کے میدان میں تو دخل اندازی نہیں کر رہے ہیں؟ لیکن سماجی علوم کا اگر وسیع تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو یہ انسان' اس کے ذہن' اور اس کی سرگرمیوں کا سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ خاص طور سے یہ بھی دیکھنا کہ انسان کے جذبات میں کب کس وقت اور کن حالات میں تبدیلی آئی۔ کیونکہ جذبات کا اظہار ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے۔ یہ انسانی معاشروں میں بدلتا رہا ہے۔ ان ہی جذبات میں سے ایک "غصہ" ہے۔ غصہ کا جذبہ کسی نہ کسی شکل میں ہر فرد میں موجود ہوتا ہے اور وہ کبھی کبھی اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے عمل میں اس بات پر زور دیا گیا کہ غصہ کے جذبات کو کنٹرول کرنا چاہئے' اور اس کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ جذبات کو دبانا یا ان کا اظہار نہ کرنا' ایک طریقہ کار ہے کہ جس کے ذریعہ سے فرد اپنے رویوں کی تشکیل کرتا ہے۔ کیونکہ غصہ کا اظہار صرف جسم کی حرکات و سکنات سے ہی نہیں ہوتا ہے' بلکہ اس کے نتیجہ میں زبان اور الفاظ بھی نئے معنی اپناتے ہیں۔ گالیاں' بددعائیں' اور برا بھلا کہنا غصہ کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتا ہے۔

غصہ کا تعلق طبقاتی اور سماجی حیثیت سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے اظہار کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے سے کم تر لوگوں پر غصہ کرنا چاہئے تاکہ ان میں ڈر اور خوف رہے۔ انہیں برا بھلا کہتے رہنا چاہئے تاکہ ان کے ذمہ جو کام ہے وہ کرتے رہیں۔ اس لئے ملازموں اور نوکروں کے لئے مالک یا آقا کا غصہ ہمیشہ اہم حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن دوسری طرف طبقہ اعلیٰ کے لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اپنے غصہ کا اظہار نہ کریں اس پر کنٹرول رکھیں' کیونکہ غصہ کے اظہار سے ان کی شخصیت کا دوسرا روپ ظاہر ہوتا ہے کہ جو پسندیدہ نہیں ہوتا ہے اور اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص اس قدر کمزور ہے کہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکا۔

اس کے برعکس نچلے طبقہ کے لوگ مالک و آقا کے سامنے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہیں اور اپنی ناراضگی اور غصہ کو دبا کر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا سماجی مرتبہ اس کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ اس کا کھل کر اظہار کریں۔ یہ اظہار وہ اپنے برابر کے لوگوں میں پوری طرح سے کرتے ہیں۔

غصہ کے موضوع پر باربرا۔ ایچ۔ روزن وائن Barbra H. Rosen wein نے مقالات کا ایک مجموعہ بعنوان "غصہ کا ماضی" کے نام سے شائع کیا ہے۔

The Anger's Past: The Social Uses of an emotion in the Middle Ages (1998)

اس مجموعہ میں جن مقالات کو شامل کیا گیا ہے ان میں غصہ کے اظہار کا تعلق طبقوں کے لحاظ سے ہے۔ مثلاً خانقاہوں میں مذہبی لوگ یا اولیاء کس انداز میں غصہ کو ظاہر کرتے تھے۔ بادشاہوں' جاگیرداروں اور امراء کے رویئے کیا تھے' اور کسان و کاشتکار غصہ کو کس انداز سے لیتے تھے یا ان کے غصہ کو کیسے تاریخ میں بیان کیا گیا ہے۔

مثلاً غصہ کے جذبہ میں بد دعائیں دی جاتی ہیں۔ یہ بد دعائیں فرد کے سماجی رتبہ اور اس کے مذہبی یا سیکولر خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ مثلاً اگر مذہبی آدمی بددعا دے گا تو اس کا تعلق عقائد سے ہو گا۔ اور وہ سامنے والے کے نقصان' بربادی' یا تباہی کے لئے خدا سے مدد طلب کرے گا جیسے : خدا ان کے گھروں کو برباد کرے' خدا ان کو شیطان کے ساتھ جہنم میں رکھے' خدا ان کی یادداشت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔

جب بھی بددعاؤں میں خدا یا دیوتاؤں سے مدد طلب کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ بددعا دینے والے میں خود میں قوت و طاقت نہیں ہے۔ یا وہ صاحب اقتدار نہیں ہے اس لئے وہ خدا یا الٰہی قوتوں سے مدد کا طلب گار ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ

ہے کہ وہ خود کسی کی تباہی و بربادی یا نقصان کا ذمہ دار نہیں بننا چاہتا ہے اور ساری ذمہ داری الٰہی قوتوں پر ڈال دیتا ہے۔

غصہ میں جب سیکولر بددعائیں دی جاتی ہیں تو اس میں اس قسم کی گالیاں ہوتی ہیں کہ جو معاشرے میں باعزت لوگوں کے لئے چیلنج ہوتی ہیں۔ مثلاً حرامی' سالا' اور کمین وغیرہ۔

اعلیٰ ذات کے لوگ جب بھی اپنے ماتحتوں یا کم ذات کے لوگوں کو برا بھلا کہتے ہیں تو ان کو کام ست' کام چور' جاہل' اور نکما کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ انہیں ہمیشہ کام کرتے رہنا چاہئے' اور کبھی آرام سے نہیں بیٹھنا چاہئے۔ گالیوں کا تعلق روایات سے بھی ہوتا ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں ایمانداری ایک اہم وصف ہے تو اس میں کسی کو بے ایمان کہنا اس کی بے عزتی ہو گی۔

عام طور سے سبھی مذاہب میں غصہ کو برا کہا گیا ہے کیونکہ غصہ فرد کی قوت برداشت کو ختم کر دیتا ہے۔ مثلاً عیسائیت میں راہبوں سے کہا گیا ہے کہ "جب تک غصہ باقی رہتا ہے نہ تو ہم زندگی سے کچھ سیکھتے ہیں اور نہ ہی ہم میں دانش مندی آ سکتی ہے۔ جن راہبوں کے دلوں میں غصہ ہو' انہیں عبادت نہیں کرنی چاہئے۔"

اس لئے غصہ کے بجائے صبر' برداشت' اور حلم کی تلقین کی جاتی ہے۔ عیسائیت میں خاص طور سے ایسا ادب تخلیق ہوا کہ جس میں مذہبی لوگوں کے لئے اور چرچ کے عہدیداروں کے لئے غصہ سے دور رہنے پر زور دیا گیا ہے۔ اگر کوئی راہب غصہ کرے تو ہدایت تھی کہ اسے سلسلہ سے نکال دیا جائے۔ مذہبی عہدیداروں کے لئے غصہ پر قابو پانا اس لئے ضروری تھا کیونکہ وہ کمیونٹی کی روحانی ضروریات کو پورا کرتے تھے اور ان کی پہنچ خدا تک تھی۔

لیکن چونکہ خانقاہ کے پاس جائیداد تھی اس لئے اکثر اس کے جھگڑے جاگیرداروں سے ہوتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی نائٹ یا جاگیردار چرچ کی زمین پر قبضہ کر لیتا تھا تو ایسے موقعوں پر خانقاہ کے عہدیدار اور راہب اپنے غصہ کا اظہار چرچ کی گھنٹیاں بجا کر کرتے تھے۔ یا وہ اولیاء کے مجسموں کو گھاس میں ڈال دیتے تھے اور ان کے سامنے سجدہ میں گر کر ان سے انصاف طلب کرتے تھے اس کا مقصد یہ تھا کہ بدعنوان پارٹی ڈر جائے

اور قہرالٰہی یا اولیاء کے خوف سے زمین واپس کر دے۔

حکمرانوں اور بادشاہوں کے ہاں غصہ کے اظہار کا طریقہ دوسرا ہوتا تھا۔ مثلاً جب وہ کوئی حکم یا فرمان جاری کرتے تھے تو اس کے الفاظ ہوتے تھے کہ: "اگر کسی نے ہمارے احکامات کی خلاف ورزی کی تو اس پر ہمارا عتاب (غصہ) نازل ہو گا۔"

بادشاہوں کے لئے جو ہدایت نامے لکھے گئے ہیں' ان میں اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ رحمدل اور غصہ ور دونوں ہو تاکہ اس کے احکامات کی تکمیل ہو سکے' کیونکہ جب تک لوگ خوف زدہ نہ ہوں گے' اس کی اطاعت سے گریز کریں گے۔ للذا حکمراں اپنے غصہ کا اظہار سخت سزاؤں کے ذریعہ کرتے تھے۔

فرانس کے مورخ مارک بلوخ نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ آخر قرون وسطیٰ کے لوگ کیوں اس قدر جذباتی اور جوشیلے ہوتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ انہیں مناسب غذا نہیں ملتی تھی' دوسرے ان میں صفائی کا شعور نہیں تھا۔ ان دو عناصر کی وجہ سے ان میں جذباتیت تھی۔ اس کے علاوہ دوسری وجوہات بھی تھیں کہ جنہوں نے لوگوں میں عدم تحفظ اور اعتماد کی کمی کو تو پیدا کر دیا تھا' مثلاً: نااہل حکومتیں' جو عوام کو خوف زدہ رکھتی تھیں۔ وبائیں' قحط' اور تشدد کی وارداتیں۔ ان کی وجہ سے لوگ امید و ناامیدی کے عالم میں رہتے تھے۔ بلوخ کا کہنا ہے کہ قرون وسطیٰ کا کلچر لوگوں کی کھردری فطرت کو کنٹرول نہیں کر سکا اس کلچر میں ایسی اخلاقی و سماجی روایات کی کمی تھی کہ جن کے دباؤ کے تحت معاشرہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکتا۔ بعد میں جب یورپ میں' ریناساں کے بعد' تبدیلی آئی تو نوربرٹ (Norbert) کے نقطہ نظر کے مطابق "تہذیبی عمل" شروع ہوا' جس نے لوگوں کے رویوں اور عادات کو بدلا' اور لوگوں نے غصہ اور دوسرے جذبات پر قابو پانا شروع کر دیا۔ مثلاً اب پبلک میں رونا باعث شرم ہو گیا۔ غم کو برداشت کرنا ضروری تھا' نہ کہ اس کا اظہار کیا جائے' وغیرہ وغیرہ۔

قرون وسطیٰ میں کسانوں اور کاشتکاروں کے بارے میں جو رائے ہمیں ملتی ہے وہ طبقہ اعلیٰ کی ہے۔ کیونکہ وہ حکمران طبقوں اور مذہبی عہدیداروں کے لئے کام کرتا تھا' اس لئے ان طبقوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ اس کے عوض وہ اس کی حفاظت کریں

کیونکہ وہ خود اس قابل نہیں تھا کہ اپنی حفاظت کر سکتا۔

اگر کبھی کسان اپنے غصہ کا اظہار کرتا تھا تو اس کے غصہ کو اس کے سماجی رتبہ کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا' یعنی کسان غیر متمدن' جاہل' وحشی' اور گنوار تھا اس وجہ سے اس کا غصہ بھی اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا تھا کہ جس میں کوئی مثبت عنصر نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس کے نتیجہ میں وہ جھگڑے اور فسادات کرتا تھا جس میں لوگ زخمی ہوتے تھے یا مارے جاتے تھے۔ اس لئے اس کا غصہ انتشار' بدانتظامی' اور فسادات کا باعث ہوا کرتا تھا۔ یہی حال ان کی بغاوتوں کا تھا کہ جو بے مقصد ہوتی تھیں اور تباہی کا سبب بنتی تھیں۔ اس لئے قرون وسطیٰ کی کتابوں میں کسانوں کو وحشی جانوروں سے تشبیہ دی ہے کہ جو فہم و عقل سے بالاتر ہیں۔ مثلاً 1233ء میں جب جرمنی میں کسانوں کی بغاوت ہوئی تو پوپ گیریگری نہم نے کسانوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا اور کہا کہ ان میں سے کسی کو نہ چھوڑا جائے عورتوں' بچوں اور بوڑھوں سمیت سب کو قتل کر دیا جائے۔

یہی رویہ کسانوں کی دوسری بغاوتوں کے سلسلہ میں تھا۔ انہیں وحشی اور جنگلی جانور کہا گیا کہ جو پاگل کتوں کی طرح لوٹ مار' قتل و غارت گری' اور تباہی میں مصروف تھے۔ کسانوں کی بغاوتوں کو حکمران کی ناانصافیوں' اور استحصال کے پس منظر میں نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ یہ کہ ان کی بغاوتیں اطاعت سے گریز' امراء سے نفرت' اور فسادات کی خواہش کے تحت ہوئیں۔

کسانوں کی بغاوت اور جنگ کو اس لئے بھی برا کہا گیا کیونکہ قرون وسطیٰ میں نقطہ نظر یہ تھا کہ جنگ کرنا صرف نائٹوں کا کام ہے۔ عبادت کرنا راہبوں کا اور محنت کرنا کسانوں کا۔ اس لئے جب یہ اپنے دائرہ کار سے باہر نکلے تو اس پر سخت تنقید کی گئی اور ان کی بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا۔

اگر غصہ کے اظہار میں تبدیلیوں کو دیکھا جائے تو موجودہ زمانے میں اس کی صورت بدل گئی ہے۔ اب جمہوریت کے عہد میں عوام اپنے غصہ کا اظہار برملا کرنے لگے ہیں اور حکمران ان کے غصہ سے خوف زدہ رہنے لگے ہیں۔

تاریخ کے بنیادی ماخذ

فتاوائے جہانداری
(حکومت کے اصول)

خیرخواہ بارگاہ سلطانی
ضیاء برنی

نصیحت: 6
افسران اور خواص کے مراتب کے بارے میں

سلطان محمود نے کہا ہے: اے محمود کے فرزندو اور سرزمین عالم کے حکمرانوں! تمہیں صاف معلوم ہونا چاہئے کہ سلطان کے بنیادی فرائض دو بڑی بڑی سرخیوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں پہلا فرض تو یہ ہے کہ سلطان اپنے تمام محکومین کے لئے اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے سلسلے میں شفقت' مہربانی' فراخ دلی اور حسن سلوک دکھائے۔ دوسرا ہے سلطنت کے خواص کے تئیں اپنی ذمہ داریاں نبھانا۔

خواص کے دعوے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیادت' علم' تقویٰ' ممتاز شہریوں کی نسل سے ہونا اور اس کے علاوہ دوسری خوبیاں جیسے حوصلہ' تجربہ فنی مہارت اور آداب میں تفوق' سلطان کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر وصف کے اعتراف میں اسے انعام و اکرام سے نوازے جس طرح سلطان اپنے (مختلف مراتب کے) احواریوں کو ان کی وفاداری کے صلہ میں تحائف و انعلمات عطا فرماتا ہے اسی طرح اسے اپنی سلطنت کے خواص میں بھی (جو حکومت کی خدمت میں نہیں ہیں) ان کے اوصاف کی بنا پر مدارج اور مراتب قائم کرنا چاہئے اور ان کے متعینہ دعوؤں کے مطابق انہیں انعام عطا کرنا چاہئے۔

رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے: "ہر سچے طالب کو اس کا حق دو' ایک سلطان عوام اور

خواص یعنی اپنے بیٹوں' بھائیوں' رفیقوں' وفادار افسروں' درباری خدمت گاروں اور سلطنت کے منتخب لوگوں کو واضح مدارج اور مراتب پر رکھ کر ان کے ساتھ پوری دانش مندی سے پیش آتا ہے' اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کی بخششوں اور تحفوں میں اس کے افسران کے وقار اور رتبہ میں کوئی شتر گر بگی نہیں ہو گی۔ اس کے انتظامات افراتفری کا شکار نہیں ہوں گے۔ سچے دعویدار انعام سے محروم نہیں رہیں گے اس کے محکومین کے دلوں میں اس کے لئے محبت بڑھے گی اور سب کے نتیجہ میں اس کا نظم و نسق پائیدار ہو جائے گا۔

اردشیر بابکان کا کہنا ہے جس کے اقوال و افعال معاملات حکومت میں ایران کے کسریٰ کے لئے نظیر تھے : تنہا اسی کو ایک عادل سلطان مانا جائے گا جو عوام کے ساتھ اپنے معاملات میں ان کے مدارج و مراتب کا لحاظ رکھتا ہے تاکہ اس کے تمام محکومین اس کے وفادار خیر خواہ بن جائیں۔ ایسی صورت میں اگر سلطان پر کوئی آفت پڑتی ہے تو اس کے محکومین اپنے قلوب میں اپنے کو اس کا شریک اور اس کے ساتھ مبتلائے مصیبت محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک سلطان کا دماغ چین سے نہیں بیٹھ جاتا تو اس کے محکومین اپنے دلوں میں چین یا سکون محسوس نہیں کرتے۔ ایسی خوش نصیبی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سلطان خواص میں عام مدارج و مراتب قائم نہیں کرتا ہے اور ہر خاص آدمی کو اس کے حسب و نسب کے مطابق اس عظمت اور اختیار میں سے ایک حصہ نہیں دے دیتا ہے جو خدا نے اسے عطا کیا ہے کیوں کہ خدا نے تمام دنیا کو اس کی دہلیز کا محتاج بنا دیا ہے۔ اور اس کی بارگاہ عوام کی ضروریات کے حصول کے لئے ایک قبلہ ہے۔

لیکن جہاں تک ایک زمانہ ساز کی بات ہے' جو کسی اچھائی یا خوبی کو دیکھے بغیر اپنے تیئں صرف ان کی وفاداری کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو کثیر تعداد میں اپنے گرد جمع کر لیتا ہے' اسے سلطان نہیں غاصب کہنا چاہئے اس طرح کا غاصب اپنے پیروؤں کے ذریعہ ملک پر حکومت کرتا ہے' وہ وار کرتا ہے' چھینتا ہے ضبط کرتا ہے اور عطا کر دیتا ہے اور اس طرح ہر روز وہ اپنے حواریوں کو زیادہ عنایات سے نواز پاتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس کی سلطنت کا دار و مدار ان ہی پر ہے وہ ان کے دبدبہ اور وقار کو بڑھاتا ہے اور ان

کے حقیقی نقائص اور خوبیوں کا کوئی لحاظ کئے بغیر ان کی خوش حالی کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اس طرح کے زمانہ ساز فرماں روا کی آنکھیں قادر مطلق کی طرف سے پھر جاتی ہیں۔ وہ تمام وقت صرف اپنے معاونوں اور حواریوں کے لئے وقف رہتا ہے اور بالآخر معاملات اس حد کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ تمام گرے ہوئے' ذلیل' پنچ' ناقص اور بے کار آدمیوں کو جن کی اصل بری اور نچلی ہوتی ہے' صرف اس بناء پر اپنی ریاست کے اساطین میں شامل کر لیتا ہے کہ اس نے ان میں حقیقی طاقت اور اثر کے ساتھ ساتھ اپنے لئے سچی وفاداری بھانپ لی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سرزمین سے ہر مفروضہ طبقے سے ایسے ہزارہا غاصب نمودار ہو چکے ہیں اور انہوں نے طرف داروں کی ایک جماعت کی مدد سے تھوڑے عرصہ تک حکومت کی ہے اور اس کے بعد اپنے پیروؤں کے ساتھ جہنم رسید ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اس دنیا سے اس طرح اٹھے ہیں کہ لوگوں کی گفتگوؤں یا دلوں میں ان کے نام و نشان باقی نہیں رہے۔ لیکن ان تمام حکمرانوں نے جن کی آنکھیں قادر مطلق کی طرف جمی ہوئی تھیں اعلیٰ نسب' تقویٰ' شرافت' دانش مندی' ہنر اور اخلاقیات کی بنیاد پر عام مراتب اور مدارج قائم کئے ہیں۔ انہوں نے اپنی حکومتوں کے ذرائع اور اپنے اختیارات کی تمام حدود کے استعمال کے ذریعہ ہر خوبی کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے وقت انہوں نے ہر شخص کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا ہے۔ خدا بندوں میں ان کی یاد روز محشر تک باقی رہے گی اور یہ حقیقت اس بات کا کافی ثبوت مہیا کرتی ہے کہ انہیں آخرت میں نجات ملے گی اور بڑا رتبہ حاصل ہو گا۔

اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ماضی کے دانش مندوں نے جب دروازہ کے نگراں سے لے کر دربار کے تمام اعلیٰ افسران کے عہدوں کی تخلیق کی تو اس تدبیر کو سامنے رکھا کہ خدمت گار کا درجہ اور رتبہ واضح ہو جائے تاکہ ان کی لیاقت اور ان کی اطاعت کے مطابق تمام عہدیداروں کے مطالبات کو دربار سلطانی مد نظر رکھ سکے (اس کے بعد برنی اپنے پسندیدہ خیال کی طرف پلٹ آتا ہے سلطان کے دربار کے عالی نسب لوگ اس کے لئے عزت و وقار کا باعث ہوں گے لیکن اگر اس نے کم اصلوں پر عنایات کی تو ہر دو عالم میں اس کے لئے باعث ذلت ہوں گے)

اگر سلطان مدارج و مراتب طے کرنے سے متعلق دائمی احکام کے مطابق خوبیوں کو نہیں نوازتا ہے تو اسے عقل اور مذہب دونوں کی کئی ناپسندیدہ چیزوں کو روا رکھنا پڑے گا۔

پہلے تو نااہلوں کو اونچا اٹھانے اور ہمیشہ سے اہل لوگوں کو ذلیل کرنے سے حکومت کی پالیسی میں شخصی رجحان داخل ہو گا اور اس طرح یہ دینی و دنیاوی تباہی کا باعث ہو گا۔

دوسرے یہ کہ اگر کم اصلوں کو عزت دی گئی اور شرفاء اور وراثتاً" آزاد لوگوں پر ترجیح دی گئی تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اکثر کم اصلوں کو تو حکومت کے عہدے مل جائیں گے اور عالی حسب لوگوں کو ان کی خدمت اور اطاعت کرنا ہو گی اس کے بعد سلطان کے لئے مطلق العنان اور جابر ہونا ضروری ہو جائے گا۔

تیسرے یہ کہ کم اصلوں کو ترقی دے کر اور عالی حسب لوگوں کو گرا کر سلطان خود اپنی کم اصلی کا ثبوت دیتا ہے۔

چوتھے یہ کہ سلطان کے معاونوں اور حواریوں یعنی وزیروں' صوبیداروں' منصفوں' افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں کو باوصف ہونا چاہئے اور انہیں کسی ادنیٰ بات میں نہیں پڑنا چاہئے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خوبی و وصف کی بنیاد پر مدارج و مراتب قائم نہیں کئے جاتے اور پستی اور نکمے پن کو فاش نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا خواص کے مدارج و مراتب کی اشاعت سلطان کے لئے لازمی ہے (یہاں یہ مفہوم مضمر ہے کہ اگر کوئی مدارج نہیں ہوں گے تو کوئی ترقی یا تنزلی ممکن نہیں ہو گی)

تجربہ کار لوگوں کا کہنا ہے کہ جو خوبیاں کسی شخص کو دربار سلطانی میں عزت و وقار کا مستحق بناتی ہیں وہ دو قسموں کی ہوتی ہیں۔

پہلے تو "کامل خوبی" ہے جسے عقل کی کسوٹی پر اور تجربہ کے آئینہ میں پرکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ بہت سے ادنیٰ لوگوں کو ظاہرہ قابل تعریف ہوتا ہے "کامل خوبی" سے مزین اشخاص کے مدارج و مراتب کی اشاعت حکومت کے احکام جاری کرنے میں سلطان کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اس طرح خوبیوں کا حامل شخص اپنا انعام پا لیتا ہے اور اپنے

متعینہ حقوق سے واقف ہو جاتا ہے۔ مزید برآں' ان خوبیوں کی نمائش' جنہیں ذاتی کوششوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسروں کے پس چال چلن کو اونچا اٹھانے کا ایک آلہ بن جاتی ہے۔ دوسری طرف بدیوں میں پڑے ہوئے لوگوں کی جھوٹی توقعات دور ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ہر ایک خوبی کے مدارج کی اشاعت (محتاط جانچ کے بعد) بہت زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے اور اگر ہم غور کریں تو ہر خوبی کے کم' درمیانی اور اعلیٰ درجے ہوتے ہیں۔ مثلاً نسل میں' نسب میں' علم میں' اچھے برتاؤ کی حکمت اور افضلیت میں' فنون لطیفہ میں اور ہنر کی گوناگوں اقسام میں۔ یہ خصوصیات اور اوصاف کامل خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی خوبی کے مدارج یعنی کم' درمیانی اور اعلیٰ درجہ کے مطابق خواص دربار سلطانی میں قدر شناسی کے مستحق ہوتے ہیں۔

خوبی کی دوسری قسم "سلطان سے نسبت" کی ہے' جب خدا کسی ایک کو ملک کا امیر بناتا ہے تو وہ اسے ہر دوسرے فرد سے زیادہ احترام اور وقار عطا کرتا ہے اور زمین پر بسنے والوں کو اس کا تابعدار بناتا ہے۔ سلطان کا اعلیٰ رتبہ اس کے بیٹوں' بھائیوں' عزیزوں' خیر خواہوں' طرف داروں' درباریوں اور غلاموں کے لئے معزز درجے لاتا ہے۔ اس قسم کی خوبی کو مطلق نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے "اضافی" ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عالی حسبی خوبی مطلق تو ہے لیکن سلطان سے نسبت عالی حسبی سے زیادہ بڑی خوبی ہے۔ اس طرح اختیارات کا قانونی جواز اچھے نتائج لاتا ہے اور مذکورہ بالا گروہ ضرورت کے تحت ریاست کے معاملات میں سلطان کے شرکاء اور دوست بن جاتے ہیں۔ سلطان سے نسبت ان کے حقوق کی بنیاد بن جاتی ہے اور یہ خوبیاں اضافی ہونے کے باوجود دوسری خوبیوں پر' جو کہ "مطلق" ہیں برتری حاصل کر لیتی ہیں۔

لیکن بحث کا موضوع تو اب پیش کیا جا رہا ہے اگر وہ لوگ جو سلطان سے نسبت کی خوبی رکھتے ہیں۔ ادنیٰ' رذیل اور کم اصل ہیں تو وہ کس طرح ریاست کے عہدوں اور اونچے درجوں کے حق دار ہو سکتے ہیں؟ اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ خوبیوں کے حامل تمام یا بیشتر لوگ کم اصل ہوں گے یہ تو استثنائی بات ہے اور مستثنیات کے بارے میں کوئی ضابطہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ بڑے لوگوں نے یہ بھی کہا ہے

کہ "ریاستی اختیارات پر قبضہ ادنیٰ خوبیوں والوں کو بھی خوبیوں کا مالک بنا دیتا ہے۔" پھر بھی خوبی کے مدارج و مراتب کی اشاعت سلطان کے لازمی فرائض میں سے ایک ہے اور ایسے تمام امتیازات کی بنیاد نسل کی حقیقت ہے۔

(اس نصیحت کے سلسلہ میں دو مثالیں پیش ہیں' 1- تاریخ ماثر صحابہ کی سند پر برنی وضاحت سے کہتا ہے کہ کس طرح خلیفہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو طبقوں اور درجوں میں منقسم کیا۔ (48) 2- برنی ہمیں باور کرانے کے لئے امام ثعلبی کی "تاریخ عباسیہ" سے یہ نقل کرتا ہے کہ خلیفہ ماموں نے بھی خلافت کے تمام خدمت گاروں میں اور بغداد کے (نمایاں) باشندوں میں خواص کے مدارج کو معین کر دیا تھا۔

نصیحت: 7
فوج کے بارے میں

سلطان محمود نے کہا: اے محمود کے فرزند! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک بڑی طاقت ور شاندار فوج اور اس کے حسن انتظام کے بغیر کسی قدیم یا جدید حکمراں یا سلطان کے لئے ذیل کے مقاصد میں سے کسی کو بھی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوا ہے' بادشاہت کی محافظت' انتظامیہ کا چلانا' عوام کے دلوں میں اپنی فتوحات کی عظمت کا قیام اور جہاں گیری' باغیوں اور عیاروں کو کچلنا اور متمردوں اور سرکشوں کی سرکوبی۔ حریفوں کے لڑائی جھگڑوں' ہم رتبہ لوگوں کی مخالفت اور طاقت ور کی عداوت کی فرو کشی' پیغمبر اسلام کے دین اور ریاست کے دشمنوں کا خاتمہ کرنا' حکم شریعت کی نافرمانی کرنے والوں کی بیخ کنی اور غلط مذاہب پر سچے دین کے اقبال کا قیام' بہتر فرقوں میں شریعت کے احکام کا نفاذ' تلوار کی ضربوں سے کافروں سے ملک و صوبے فتح کرنا اور فاتحوں' مجاہدوں اور مسلمانوں میں دوسرے مستحق لوگوں کے لئے بے شمار مال غنیمت کا حصول اور ملک کے دشمنوں اور حکومت کے نافرمانوں کے لئے تمام راہوں کا سدباب۔

کیخسرو نے' جو تمام آباد دنیا کا حکمراں تھا' یہ اصول قائم کیا کہ "بادشاہت فوج سے ہے اور فوج بادشاہت سے" بادشاہت دو ستونوں پر قائم ہے۔ پہلا ستون تو انتظامیہ ہے اور دوسرا فتوحات۔ فوج دونوں ستونوں کا سہارا ہے کیوں کہ اگر کوئی بھی فوج نہیں ہے

یا فوج مختصر۔ پست ہمت اور غیر منظم ہے تو نہ تو اچھا انتظام ہو سکے گا اور نہ ہی فتوحات ممکن ہوں گی۔ اسی وجہ سے اسی کے پیش نظر عظیم بادشاہوں نے کہا ہے کہ ایک حکمراں کو ہمیشہ فوج کی طرف مخصوص دھیان کرنا چاہئے۔ کیوں کہ صرف اسی صورت میں فوج کے تمام امور مناسب طور سے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر سلطان فوج کی طرف سے غافل ہوا تو وہ اپنے ہی ہاتھوں سے فوج اور مملکت کو تباہ کر دے گا۔ اس کے علاوہ اگر سلطان کا دل صرف خزانے بھرنے ہی میں لگا رہتا ہے تو فوجی امور مناسب طریقہ سے نہیں سنبھالے جا سکیں گے اور نہ ہی خزانے بھرے جا سکیں گے۔ حتیٰ کہ جو کچھ سلطان کے پاس ہے وہ بھی جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر سلطان کی توجہ فوج پر مرکوز ہے تو اسے ڈھنگ سے سنبھالا اور مسلح و آراستہ کیا جا سکتا ہے اور علاوہ ازیں فوج کے بل پر اتنی زیادہ دولت جمع کر سکتے ہیں جو کسی اور خزانہ میں رکھی بھی نہیں جا سکتی سالہا سال سے یہ حقیقت دانش مندوں پر روشن رہی ہے اور تجربہ نے بھی صحیح ثابت کیا ہے۔

ایران کے مورخین لکھتے ہیں کہ انہوں نے جمشید سے دریافت کیا' بادشاہت کی بنیاد کیا ہے؟ جمشید نے جواب میں کہا: سپاہیوں کی کثرت اور عدل و مہربانی کی فراوانی۔ انہوں نے تین بار وہی سوال کیا اور جمشید نے دو مرتبہ یہی جواب دوہرایا۔ اس کے بعد انہوں نے اس سے پوچھا کہ آپ کے پاس عدل اور احسان پر سپاہیوں کی بڑی تعداد کو فوقیت دینے کی کیا معقول وجہ ہے؟ جمشید نے جواب میں کہا: اگر دنیا کو فوج کی محکومی میں نہیں رکھا جاتا۔ باغیوں کی نافرمانی' فرماں برداری میں نہیں بدلی جاتی اور فوج کی تعداد اور قوت کے ذریعہ نظم و نسق برقرار نہیں رکھا جاتا تو نہ عدل کا نفاذ ممکن ہو سکے گا اور نہ ہی کسی کو شاہی عنایات سے نوازا جا سکے گا۔

سکندر نے ارسطو سے سوال کیا: "فوج کی بڑی تعداد اور مناسب تنظیم' جو بادشاہت کی بنیاد ہے' کن باتوں پر منحصر ہے؟"

ارسطو نے جواب میں کہا۔ "کسی بھی فوج کو چار طریقوں سے بڑھایا اور مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ پہلے تو فوجی امور کو سلطان کی مکمل اور پوری توجہ حاصل ہونا چاہئے' کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں اسے ان امور کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرنا چاہئے اور

اسے قطعی طور پر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فوج پر منحصر ہے۔"

دوسرے، فوج کثیر خزانوں کے تصرف سے بڑھائی اور عمدگی سے منظم کی جا سکتی ہے۔ جب تک فیاضی سے پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا، فوج بڑی یا منظم نہیں ہو سکی۔

تیسرے افسران کو اپنے سپاہیوں پر مشفق اور مہربان ہونا چاہئے اور ان کے پاس ایسے اوصاف ہونے چاہئیں جو دانش مندوں نے تجویز کئے ہیں۔ سلطان تو صرف موقع موقع سے فوج سے ملتا جلتا ہے لیکن افسروں کو دن رات ہی ان کے ساتھ رہنا اور ربط رکھنا ہوتا ہے۔ اگر ان میں قیادت کی خوبیاں کم ہیں تو فوج کو ڈھنگ سے نہیں رکھا جا سکتا۔

"فوج کی بڑی تعداد اور طاقت کی چوتھی شرط عارض اصل (مرکزی عارض) کی ان برتری ہے جسے فوج کے تمام عام اور خاص امور سپرد کئے جاتے ہیں۔ عارض اصل کو عارض ممالک (49) بھی کہا جاتا ہے۔ عارض اصل کو سلطان کا اتنا ہی اعتماد حاصل ہونا چاہئے جتنا کہ وزیر کو اور اسے سلطان کا انتہائی وفادار ہونا چاہئے۔ اعتماد قابلیت دیانت، دلی محبت، سچائی، عالی نسبی، وقار، ایمان کے صحیح ہونے اور ایفائے عہد میں اس کا ثانی نہیں ہونا چاہئے عارض اصل جتنا زیادہ وفادار اور اوصاف سیہ کا حاصل ہو گا اسی مناسبت سے فوج بھی بڑی اور طاقت ور ہو گی اور اس کے قابو میں رہے گی۔ اس کے علاوہ اگر قطعی سوجھ بوجھ اور تمام ممکنہ اوصاف سے مزین عارض اصل کا تقرر ہو جاتا ہے تو یہی اوصاف اس کے ماتحت افسروں میں بھی دیکھے جائیں گے۔ ایسا عارض کم اصل فاترالعقلوں، پسندوں، کاذبوں اور بدمعاشوں کو فوج کی کمان سپرد نہیں کرے گا۔ وہ صرف ایسے ہی افسروں کو اعلیٰ فوجی کمانیں دے گا جن کا چال چلن اور برتاؤ اچھا ہے اور جو تجربہ کار اور قابل اعتماد ہیں۔ اگر فوج میں نیچے سے اوپر تک اچھے، دانش مند، اور مہربان افسر موجود ہیں تو فوجی مہم کتنی ہی زبردست اور مشکل کیوں نہ ہو وہ سلطان کی خواہشات کے مطابق کامیاب ہو گی اور دور رس لوگوں کو اس کی کامیابی کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں ہو گا۔

ارسطو کا جواب سننے کے بعد سکندر نے اس سے دوبارہ سوال کیا۔ "فوج میں سلطان کی مخصوص توجہ کی کیا حدود ہونا چاہئے؟" ارسطو نے جواب میں کہا۔ "سلطان کی

فوجی امور میں ایسی مخصوص توجہ ہونا چاہئے کہ اسے اپنے گھوڑے اور ہتھیار ہر شہسوار کو دینے کی خواہش ہونے لگے تاکہ وہ اس کی فوج میں "مرتب" کی حیثیت سے داخل ہو سکے۔ اگر وہ فوج میں کوئی نقص دیکھے یا سنے تو اسے چین کی نیند نہ آئے اور اس وقت تک سکون نہ آئے اور کسی دوسری شئے کی طرف توجہ نہ ہو پائے جب تک کہ وہ تمام موجودہ ذرائع کی مدد سے وہ نقص دور نہ کرے۔"

اس کے بعد سکندر نے ان خوبیوں کی تشریح چاہی جو سر لشکر کے لئے ضروری ہیں۔ ارسطو نے جواب میں کہا کہ "سر لشکر کے لئے دس خوبیاں ضروری ہیں۔ پہلی خوبی خوف خدا۔ اگر اس میں خوف خدا نہیں تو اس کو دس شہسواروں کی کمان بھی نہ سپرد کی جائے اور اگر وہ اس مدلل بات کو نظر انداز کرتے ہیں اور ایک ایسے افسر کو مقرر کرتے ہیں جسے کوئی خوف خدا نہیں تو وہ خود ہی دیکھ لیں گے کہ وہ کیا گل کھلاتا ہے؟ دوسری سلطان کی وفاداری۔ اگر کوئی شخص سلطان کا وفادار نہیں ہے تو اسے کوئی فوجی عہدہ جو کہ بادشاہت کا ستون ہے' نہیں دینا چاہئے۔ تیسری ذہنی توازن۔ اگر سر لشکر کے پاس متوازن ذہن نہیں ہے تو اس حقیقت کی بناء پر وہ بد دماغ ہو جائے گا کہ بہت سے افراد اس کے احکام کے پابند ہیں یہ اس کے اور اس کے ماتحتوں دونوں کے لئے مضر ثابت ہو گا۔ چوتھی عالی نسبی۔ اگر افسر عالی نسب نہیں ہے تو سپاہی اس سے محفوظ نہیں رہیں گے اور وہ دین یا مملکت کی حمایت میں کوئی مہم نہیں چلا پائے گا۔ پانچویں نمک حلالی۔ سر لشکر کو اتنا نمک حلال ہونا چاہئے کہ وہ ہر وقت ایک نئی شاخ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ چھٹی جنگی تجربہ۔ اگر سر لشکر کو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے تو وہ اپنی اور اپنے لوگوں کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ ساتویں خوبی۔ سر لشکر کو ایک اچھی جماعت (خیل) سے وابستہ ہونا چاہئے اور اسے اس جماعت سے پیرو بھی حاصل کرنا چاہئے ایسی صورت میں وہ اعتماد حاصل کر سکے گا اور سپاہی اس کی عزت بھی کریں گے۔ علاوہ ازیں اس کی جماعت اور اس کے پیرو کے اچھے طریق کار کی ضمانت ہوں گے۔ آٹھویں خوبی سر لشکر کو حوصلہ مند' ہوشیار اور امور سے واقف ہونا چاہئے۔ نویں۔ اسے فراخ دل ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے سپاہیوں کو ننگا نہ دیکھ سکے۔ فوج کا دائمی استحکام شکستہ حال لوگوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ دسویں خوبی قول کی سچائی اور ذہن کی پاکیزگی

ہے تاکہ سپاہیوں کو اس کے اقوال و افعال پر بھروسہ ہو اور وہ کسی شخص کی موجودگی یا غیر موجودگی میں اس کی مستورات یا بچوں پر نگاہ نہ ڈالتا ہو۔ اگر کسی سر لشکر کے پاس مندرجہ بالا خوبیاں ہوں گی تو اس کی کمان میں ہر شخص مطمئن اور محفوظ ہو گا۔"

(ماثرالوزرا کی بنیاد پر بنی ایک مرتبہ پھر یہ کہتا ہے کہ تمام بدنظمیاں اس لئے کھڑی ہوتی ہیں کیوں کہ کم اصلوں کو اعلیٰ عہدے مل جاتے ہیں)

عارض کو والدین سے بھی زیادہ مہربان ہونا چاہئے اور اسے اپنے آدمیوں کے جرائم پر نقاب ڈالنا چاہیے۔ اسے اپنے سپاہی کو ٹھیک اس طرح سزا دے کر درست کرنا چاہئے جس طرح کہ ایک مشفق باپ اپنے نافرمان بیٹے کو کرتا ہے۔ اسے زیادہ مظالم نہیں توڑنا چاہئے اور نہ ہی بے حد سخت سزائیں دینا چاہیے۔ اور ہر سزا دیتے وقت اسے مصالحت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے۔ اسے (خلاف ورزیوں میں) میں مناسب اور نامناسب میں تمیز کرنا چاہئے تاکہ وفادار اور بہادر افسروں کو بہت معمولی غلطی پر عزت سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں اسے خطا کاروں اور مجرموں کو جو اپنے جذبات کا شکار ہوئے تھے ان کے مقام سے محروم کرنے' کچھ کوڑے لگوانے اور قید میں رکھنے کے لئے' سہم الحشمان ' فوجی پولس) کے حوالے کرنے کی سزاؤں پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اسے وقتاً" فوقتاً" فوج کے جرائم اور نقائص کے بارے میں سلطان کو مطلع کرتے رہنا چاہئے اور عارض کو حتی الامکان یہ کوشش کرنا چاہئے کہ سلطان فوجی عملہ کو سزائے موت اور سخت و بے رحمانہ سزائیں نہ دے۔ اسے سلطان اور فوج کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں بنانا چاہئے اسے سپاہیوں کی بدنصیبیوں کو اپنی ذاتی بدنصیبیاں خیال کرنا چاہئے اور اپنے آدمیوں کے رنج و الم اور مسرتوں میں برابر کا شریک ہونا چاہئے اس پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے ذہنی سکون آرام اور چین حاصل کرنے کے لئے ان کی مناسب امداد کرے' تمام معاملات اور حالات میں عارض کو فوج کے ساتھ اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ فوج کا اس پر اعتماد کم نہ ہو' اس کا رعب اور احترام ان کے دلوں پر منقش ہو جانا چاہئے اور فوجی دستوں کو اس پر اپنے اعتماد کی وجہ سے اپنے کو اس کی جماعت' پیرو' غلام اور خدمت گار سمجھنا چاہئے۔ مختلف مزاجوں اور طرح بطرح کی خصوصیات کے ہزارہا آدمیوں سے مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق پیش آنے کے لئے کسی بزر جمہر یا

کسی آصف کی طرح غیر معمولی طور سے ذہین ہونا ضروری ہے۔

دور ماضی کے حکمراں اپنی فوجوں کو جمع کرنے اور ان کی نگہداشت کرنے میں بے انتہا محتاط ہوتے تھے اور اس معاملہ میں، جو کہ ریاست کا اہم ترین کام ہے۔ عقل اور تجربہ کے دیئے ہوئے کسی بھی اصول کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ صرف اسی طرح وہ چار سو ہزار یا پانچ سو ہزار منتخب جنگجو جمع کر پاتے جنہیں وہ اسلحہ اور تمام ساز و سامان سے لیس رکھتے تھے۔ اپنی فوج کی قوت پر ہی وہ دنیا فتح کرتے رہے اور ملکوں اور مملکتوں کو اپنی فرمانروائی میں لے آئے۔ انہوں نے دین و مملکت کی خاطر بڑی بڑی مہمات سر کیں۔ ان کے اچھے کاموں کی وجہ سے ان کے نام روز محشر تک روشن رہیں گے۔ حکمرانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے عظیم سلطانوں کی ہدایات پر چلیں نہ کہ ایسے لوگوں کے مشورہ پر چلیں جنہیں امور حکومت کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں اور جو ڈھنگ سے کسی قصبہ یا گاؤں پر بھی حکومت نہیں کر سکتے۔ ایسے اشخاص کو علم کی تمام شاخوں، مثلاً قانون، ادب، خطابت، قواعد، اور شاعری پر عبور حاصل ہو سکتا ہے لیکن امور حکومت اور فتوحات کے لئے علم کی جن شاخوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کے بارے میں ان کی واقفیت بہت ہی معمولی بلکہ درحقیقت بالکل بے کار ہوتی ہے۔

(تاریخ خلفاء عباسی کی سند پر خلیفہ ہارون الرشید سے مندرجہ ذیل پانچ ضوابط منسوب کئے گئے ہیں)

ضابطہ اول۔ فوج میں سپاہیوں کی بھرتی کی فہرست ہر سال سلطان کے علم میں لانا چاہئے اور تخت سلطانی کے سامنے یہ بات صاف صاف رکھ دینا چاہئے کہ کسے اور کہاں سے بھرتی کیا گیا ہے۔

ضابطہ دوم۔ سلطان کو صحیح طور سے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ افراط اور قلت کے سالوں میں سپاہیوں کو ساز و سامان بہم پہنچانے اور ان کے ذہنوں کو ان کے خاندان کی ضروریات کے سلسلے میں بے فکر رکھنے کے لئے کس قدر رقم کی ضرورت ہے۔

ضابطہ سوم۔ سال دو بار سپاہیوں کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا معائنہ ضروری ہے۔ سپاہیوں کا معائنہ ایسے اشخاص کو کرنا چاہئے جن کے بارے میں خوردبرد کرنے یا دروغ گوئی کرنے کا شبہ نہ کیا جا سکے۔ تاکہ مورچوں کے وقت یا دوران جنگ کوئی شوروغل

نہ ہو- یہ جائزہ (عرض) ایسے اوقات اور جگہوں پر ہو کہ اسے ایک ہی سلسلے میں ختم کیا جا سکے- (50) جائزہ کا حکم سب کے لئے ہونا چاہئے-

ضابطہ چہارم- نمازیوں اور مجاہدوں کا فن شہسواری میں امتحان ہونا چاہئے تاکہ ان میں وہ لوگ شامل نہ ہو جائیں جنہیں فن جنگ سے کوئی واسطہ نہیں اور جو کاری گروں کے دوسرے گروہوں یا دوسرے پیشوں سے متعلق ہیں-

ضابطہ پنجم- فوج کی تعداد اور استحکام بڑھانے کے لئے منتخب' ممتاز' عالی نسب' بہادر اور باوصف افسر ہونا چاہئے-

محمود کو اپنے غلاموں میں سے 30,000 شہسوار جمع کرنے اور منظم کرنے کے لئے بارہ سال تک جدوجہد کرنا پڑتی تھی- ان 30,000 غلام شہسواروں میں سے 15,000 ہندو ہیں اور 15,000 چین اور خطا (51) ممالک سے لئے گئے تھے- اگر ان کے خاندان کے تمام بزرگوں اور نوجوانوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد غالباً ایک لاکھ نفوس تک پہنچے گی- اسے غلاموں کی فوج جمع کرنے سے فائدے بھی ہوئے اور نقصان بھی-

پہلے تو غلاموں کی بڑی تعداد کی وجہ سے سلطان بہت طاقت ور اور باعظمت نظر آتا ہے- اگر کسی سلطان کے پاس فوجی سامان بکثرت ہے اور ہاتھیوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے تو یہ اس کی طاقت اور عظمت کا اعلان ہے- اس طرح اس کے دور و نزدیک کے دشمن دہشت زدہ رہتے ہیں- غلام سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت بھی یہی اثر چھوڑتی ہے- سلطان کے کثیر التعداد اور بخوبی لیس غلاموں کی وجہ سے لوگوں کی آنکھوں میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے-

دوسرے غلام اپنے خصوصی امتیاز کو قائم رکھنے اور سلطان کے ادنیٰ خدمت گاروں پر حوصلہ اور شجاعت میں اپنی برتری قائم کرنے کی غرض سے جنگوں اور قلعوں کے محاصروں میں دوسرے سے پہلے کود پڑتے ہیں' اور جان و دل سے ہر مہم کی کامیابی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں- بہتے دریاؤں اور بھڑکتے شعلوں میں اپنے کو گیند کی طرح پھینک دیتے ہیں- اس کے بعد باقی تمام فوج کے لئے بھی تقلید ضروری ہو جاتی ہے- غلاموں کی (منتخب دستے کی حیثیت سے) قدروقیمت صاف ظاہر ہے-

تیسرے ان کی تنظیم پر نظر ڈالنے سے افسروں کا غرور اور تکبر کم ہو جاتا ہے-

(52) جب غلام بکثرت ہوں تو کوئی فرقہ یا گروہ ان کے خوف سے حکومت پر غلبہ حاصل کرنے کا خیال نہیں کر سکتا۔ انہیں معلوم ہے کہ غلاموں کی ایک رقیبانہ تنظیم ہے اور وہ کسی بھی ایسے شخص کو دوست نہیں بنائیں گے یا اس کی پیروی نہیں کریں گے جو ان کے گروہ سے متعلق نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی کم فائدے کی بات نہیں ہے۔

غلاموں کو جمع کرنے اور انہیں ایک ساتھ رکھنے کے نقصانات حسب ذیل ہیں۔
بیشتر غلام لاپرواہ اور بے شرم ہوتے ہیں۔ خوف خدا اور موروثی اسلام کی خصوصیات' جو کہ مسلمانوں کی رگوں اور نسوں میں بسی ہوئی ہیں' ہندوؤں کے ذہنوں میں پیدا نہیں کی جا سکتیں خواہ انہیں بچپن سے لے کر سن بلوغ تک پہنچنے میں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے کئی سال گزر چکے ہوں۔ جہاں تک منگولوں کا معاملہ ہے' ان کے ساتھ کچھ سالوں تک ہی عنایات کی جائیں تب بھی ان کے ذہنوں میں تسلط' بغاوت اور وحشیانہ منصوبوں کے علاوہ دوسرے خیالات نہیں داخل ہو سکتے۔ (53) ان غلاموں کے ساتھ بڑی تعداد میں مسکن بنانے کی وجہ سے جو اندیشے پیدا ہوئے ان کے باعث محمود مستقل پریشان رہا۔ ان کا تعلق ایک گروہ سے ہے۔ ان کے ذہن ایک ہیں۔ اور ان کی بغاوت کے خلاف کوئی مستقل ضمانت نہیں ہو سکتی۔ غلاموں کی بغاوت بہت بڑا خطرہ ہے اور یہ باعث تشویش اور خوفناک ہوتا ہے۔ ایک زمانہ ہوا لوگوں نے یہ کہاوت بنائی تھی۔ کسی گھر کی آگ بجھانا مشکل ہے۔

محمود کے فرزندوں اور عالم اسلام کے سلاطین کو فوج کی تنظیم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصول معلوم ہونا چاہئے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سو ہی کی کمان سنبھالنے کے لائق ہے اور انتہائی کوششوں اور دوسروں کے تعاون سے صرف ایک سو آدمیوں ہی کو مناسب ڈھنگ سے رکھ سکتا ہے تو اسے ایک ہزار یا دو ہزار آدمی سپرد نہیں کرنا چاہئے۔ وہ حکمراں جو عقل اور تجربہ کو حقارت سے دیکھتے ہیں انہیں ان شہسواروں کو جنہیں انہوں نے نالائق افسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔ سنبھالنے کی امید نہیں رکھنا چاہئے۔ اور نتیجہ کے طور پر پیدا ہونے والی بدنظمی اور مصیبت کو انہیں اپنے ہی کاموں کا پھل سمجھنا چاہئے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص ایک ہزار یا دو ہزار سپاہیوں کی کمان سنبھالنے کا

اہل ہے اور انہیں اچھی طرح سامان سے لیس اور منضبط رکھ سکتا ہے اور اس کی سلطان کے لئے وفاداری ثابت شدہ اور مصدقہ ہے تو اسے ایک سو یا پچاس آدمیوں ہی کی نگرانی نہ دی جائے کیوں کہ اس سے اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور فوجی افسروں کی مایوسی کوئی اچھی بات نہیں۔ جب کوئی شخص اپنی خوبی کا صلہ نہیں پاتا اور نااہل لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر دیکھتا ہے تو یہ یقینی ہے کہ اس کی وفاداری کو ٹھیس پہنچے گی اور وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے گا۔

دوسرا اصول' اگر سلطنت کے لئے پچاس ہزار شہسوار ضروری ہیں تو سلطان کو صرف پچاس ہزار ہی پر اکتفا نہیں کر لینا چاہئے اسے کم از کم اس کے نصف زیادہ مستقل طور پر اور پوری طرح لیس رکھنا چاہئے۔ لہٰذا جس وقت یہ پچاس ہزار سپاہی اپنی جگہوں پر ہوں گے تو سلطان (اپنے بھرتی کئے ہوئے زائد آدمیوں کی وجہ سے) کسی ناگہانی اور اتفاقی صورت حال میں اپنے کو لاچار محسوس نہیں کرے گا۔ ناتجربہ کار اور غیر قابل اعتماد شہسوار صرف بے کار ہی نہیں بلکہ مشکل کے وقت خطرناک بھی ثابت ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں انہیں شامل نہیں کرنا چاہئے۔

(سلطان کو ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھنا چاہئے جو اسے فوج میں یا فوج پر تصرف میں کمی کی تجویز دے خواہ وہ اس کا بھائی یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔)

تمہیں سال میں دو مرتبہ ذاتی طور پر دیوان حشم (وزارت جنگ) کے کام کا معائنہ کرنا چاہئے۔ موجودہ سپاہیوں کی اصل تعداد دریافت کرو اور اگر ایسے مواقع پر فہرست میں مندرج سپاہیوں سے زیادہ اشخاص تمہارے معائنہ میں نہیں آتے ہیں تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ فوجی امور کا مناسب ڈھنگ سے انتظام نہیں ہو رہا ہے جو چیز ایک جگہ سے مفقود ہو جاتی ہے وہ دوسری جگہ سر اٹھاتی ہے اور پہلے زیادہ۔ (54) اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا مستحکم نہیں رہ پاتی۔ لہٰذا تمہیں اپنی فوج کی تنظیم بہت مضبوط کرنا چاہئے۔ یہ حکم جاری کرو کہ وہ اپنے کو فوج کے لئے آدمی بھرتی کرنے میں مصروف رکھیں۔ آدمی کم بھی بھرتی ہوں تب بھی افسران عرض کو اس معاملہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے اور بھرتی کے لئے دروازہ بند نہیں کر دینا چاہئے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر کسی طرح تمہاری مملکت کے بھرتی کرنے والے عہدیداروں'

فوجی افسروں اور صوبہ داروں پر یہ بات صاف ہو جائے کہ تم خاص طور سے اپنی فوج بڑھانے کے خواہاں نہیں ہو یا تمہاری کفایت کی خواہش ایسا کرنے سے روکتی ہے تو تمہاری فوج میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اور یہاں تک کہ جو فوج تمہارے پاس ہے وہ بھی مستحکم نہیں رہے گی اور دن بہ دن گھٹتی جائے گی۔

تیسرا اصول۔ فوج کو کبھی خالی ہاتھ نہ چھوڑا جائے۔ اسے مال گزاری جمع کرنے' سرحدوں کا تحفظ کرنے' جنگل کاٹنے' قلعے بنانے اور شکار کھیلنے میں مصروف رکھنا چاہئے۔ یہ ان افسروں کی وجہ سے خاص طور سے ضروری ہے جو قیادت کے لئے بہت آرزومند ہیں یا جن سے شورشوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر سلطان اپنے امور سلطنت کی طرف سے مطمئن ہے اور اس کی سیاسی حالت قابل اطمینان ہے تو اسے دوسری مہمات پر فتوحات کو سبقت دینا چاہئے اور اپنے بہادر اور معتبر افسروں کے ساتھ معرکوں اور جہادوں کے لئے کوچ کرنا چاہئے۔ کوئی بھی ماہر فن یا پیشہ ور جب تک اپنے فن کی مستقل طور پر مشق نہیں کرتا تو وہ اس میں اپنا ملکہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح اگر فوج کو اس کے کام میں مصروف نہیں رکھا جاتا تو اس کے دل میں دوسری خواہشات انگڑائیاں لینے لگیں گی اور اس کے دماغ پر دوسری امنگوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

فوج کے لئے آرام کے بھی اپنے فوائد ہیں۔ لیکن اس کی حدود معین ہیں۔ فوج کو اتنا زیادہ آرام نہیں ملنا چاہئے کہ یہ شورشوں کے لئے آمادہ ہو جائے یا اس کے ذہن میں بے سر پیر کی امنگیں گھر کر جائیں۔

(اس نصیحت کے سلسلہ میں مزوک (55) اباحتی کی مثال دی گئی ہے جس نے ایرانی شہنشاہ اور مشہور نوشیرواں کے باپ قباد پر اثر قائم کر لیا تھا۔ برنی کہتا ہے کہ اس کا تذکرہ تاریخ اکاسرہ پر مبنی ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں دیئے گئے تذکرہ سے ہر لحاظ سے مختلف ہے۔ بہرحال یہ برنی کے تصور باحت یعنی عورتوں اور مال و اسباب کی مشترکہ ملکیت کی وضاحت کر دیتا ہے جس کا اس نے اکثر حوالہ دیا ہے۔ مزوک نے قباد کو اپنے زیر اثر لانے کے بعد اسے فوج میں ہر سال ایک تہائی کی کمی کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ پہلے دو سالوں کی کمی کے بعد فوج تقریباً بالکل ختم ہو گئی۔ چنانچہ قباد لاچار تھا اور اب مزوک اپنے مسلک کی تعلیم دے سکتا تھا۔ "اس کے بعد حرامی مزوک نے

اباحت کے مسلک کا افشار کیا اور عوام کو اپنے باطل مذہب کی دعوت دی۔ اس نے بازاروں اور عوام میں ایک عام اعلانیہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ 'آدم کے بیٹوں میں حقوق ملکیت' زر نقد' عورتوں' بچوں' غلاموں اور باندیوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ تمام نوع انسان کی مشترکہ میراث ہیں۔ بھائی بہن ایک دوسرے کے لئے ممنوع نہیں ہیں۔ آدم کے زمانہ میں بھائی اپنی بہنوں سے شادی کرتے تھے۔ اب وہی نظام ہے جو آغاز دنیا کے وقت تھا۔ لیکن مزوک کی طاقت کچھ ہی دن کی تھی۔ دل شکستہ قباد مر گیا۔ اور نوشیرواں نے تخت نشین ہونے کے بعد مزوک اور اس کے پیروؤں کو کچل کر رکھ دیا۔

قراخطائیوں اور مزوک اباحتی پر نوٹس

4- قراخطائیں- برنی بار بار قراخطائیوں (یاخطائیوں) کو محمود کا ہمعصر دکھانے کی غلطی کرتا ہے۔ حالانکہ طبقات ناصری کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہو سکتی تھی کہ قراخطائی محمود کے دور کے بعد ایک صدی سے زیادہ مسلمان سلاطین کی نگاہوں میں نہیں آئے تھے۔ بیشتر مسلم مورخین قراخطائیوں کی ابتداء کے بارے میں خلط مبحث کر دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر بریشنڈر (Dr. Bretshnieder) نے چینی دستاویزات کی بنیاد پر اس بات کو صاف کر دیا ہے۔ "دسویں صدی کی ابتداء میں خطائین کے سردار موسوم یی بی اپاؤ کی (ye be Apao Ki) نے تمام خطائین قبیلوں کو زیر کر کے اپنے کو منگولیا کے زیادہ تر حصہ کے مالک بنا لیا اور 1916ء میں تے تسو (Jai tsu) کے (چینی) لقب کے ساتھ اپنی بادشاہت کا اعلان کیا (916-927) فاتح نے تسو کے بیٹے نے شمالی چین کے ایک حصہ کو فتح کیا اور اپنے شاہی خاندان کو لیاؤ (Liao) کا خطاب دیا۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلم مصنفین نے اور یورپی سیاحوں نے چین یا شمالی چین کے لئے جس خطائی نام کا استعمال کیا ہے اس کا اختراع خطائیں لفظ سے کیا گیا ہے۔ لیاؤ خاندان کے خاتمہ سے کچھ سال قبل شاہی خاندان کا ایک شہزادہ بچ کر مغرب کی طرف نکل گیا۔ اس نے ایک فوج جمع کی اور مشرقی اور مغربی ترکستان کو فتح کر لیا اور خوارزم سے خراج دینے لگا مغربی ایشیاء میں اس کی سلطنت قراخطائی کہلائی جانے لگی اور تقریباً ایک صدی

تک قائم رہی۔ اس کے حکمرانوں نے اسلامی ممالک میں بڑا بحران پیدا کیا۔ چنگیز خاں نے اسے نیست و نابود کر دیا۔"

(208-209 ص 'Medieval Researches from Eastern Asiatic saurces

طبقات ناصری میں (ص 327) خطائی خاندان کے فرمانرواؤں کی فہرست دی گئی ہے جس میں ایک حکمراں ملکہ کا نام بھی شامل ہے لیکن اصل چینی نام غلط نقل الفاظ اور نقل نویسوں کی غلطیوں کی وجہ سے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ قراخطائی سلطنت سلطان محمود کے دور بادشاہت کے ایک صدی سے بھی زیادہ عہد میں قائم ہوئی اور محمود کے عصر کے کسی بھی مصنف نے قراخطائین کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ فتاوائے جہانداری کی تصنیف سے سوا سو سال پہلے ان کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔

سلطان محمود کے دربار میں چینی غلام نہیں تھے۔ ہندو سپاہیوں کا ایک دستہ تو تھا لیکن وہ غلام نہیں تھے۔ (ح)

8- مزوک۔ برنی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ مزوک کو نوشیرواں نے ختم کیا تھا۔ تمام مصنف اس پر متفق ہیں کہ ساسانی شہنشاہ قباد (531-487ء) کو معزول و مقید کیا گیا اور اس کے بھائی کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن وہ اپنی رہائی اور تخت دونوں حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس نے اپنے دوسرے دور میں مزوک کا خاتمہ کر دیا۔ برنی کا خیال ہے کہ قباد بالکل صفر نہیں تھا کیوں کہ اس نے مغرب میں رومیوں سے اور مشرق میں سفید ہنوں سے جنگ کے دوران شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ "اس کی موت کے وقت آخری معرکہ میں ناکامیابی کے باوجود ایران کا اقبال اور اقتدار کافی بلند تھا اور اس نے سفید ہنوں اور رومیوں سے جنگ کی مہارت رکھنے والی ایک ایسی فوج اپنے پیچھے چھوڑی جو جنگ آزمودہ مشاق سپاہیوں کی ایک شاندار جماعت تھی۔) (سا نکس، پرشیا، ج اول، ص 441-448)

مشرقی عالم اسلام کے متعصب اور پختہ عقیدہ لوگوں کے خیال میں مزوک مثالی اشتراکیت پسند (اباحتی) تھا اور اس کی بدکرداری اور بددیانتی کی روایت نے وقت کے ساتھ نشوونما پائی۔ اس جگہ "مزوک روایت" کی صرف تین منزلوں پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔

فردوسی (1032ء-932ء) کا شاہنامہ مزوک کو شخصیت، کردار اور اہلیت کی ایک عمدہ سند دیتا ہے۔ فردوسی نے مزوک یا اس کے پیروؤں سے کوئی بدکاریاں، جادو یا فریب منسوب نہیں کئے ہیں، صرف "زرتشتی مذہب کی اصلاح" کا دعویٰ ان سے منسوب کیا ہے جو ان کے خیال کے مطابق تنزل کی طرف جا چکا تھا، پہلے ایک قحط کے دوران مزوک نے قباد کی اجازت سے بھوکے غرباء کو یہ ہدایت کی کہ وہ دولت مندوں کی کھیوں اور ریاست کے اناج کے گوداموں سے اپنی بھوک مٹائیں۔ دوسرے اس نے مندرجہ ذیل بنیادی باتیں پیش کیں۔ "پانچ چیزیں ایسی ہیں جو دانش مندوں تک کو صحیح راستہ سے ہٹا دیتی ہیں یعنی حاجت مندی (نیاز)، حسد (رشک)، نفرت (خشم) (جذبہ انتقام (لیکن) جنسی ہوس (آز) اگر تم اپنے کو ان پانچ شیطانی ہوسوں سے آزاد کر سکتے ہو تو پروردگار کا راستہ تمہارے لئے صاف ہو گا۔ ان پانچ بدیوں کا سبب (بلا شرکت غیر) بیویاں اور نجی جائداد ہیں جنھوں نے دنیا میں سچے مذہب کو تباہ کر دیا ہے۔ اگر (بلا شرکت غیر بیویاں اور نجی جائدادیں آدمیوں کے درمیان حائل نہ ہوں تو سچے مسلک کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ لہٰذا سماج میں آدمیوں کے درمیان حائل ان دو رکاوٹوں کو ہٹا دینا چاہئے تاکہ آدمیوں کی بدہوسیاں مفقود ہو جائیں" افلاطون نے بھی اپنی ریپبلک میں تقریباً یہی بات کہی ہے اور ممکن ہے مزوک نے عظیم ترین یونانی مفکر سے یہ بنیادی خیال لیا ہو۔ لیکن عملی اصول کی حیثیت سے ایک ایسا طریقہ عمل زمینداروں اور ایرانی مذہبی پیشواؤں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ رجعت پسند ولی عہد نوشیرواں نے نمایاں پیشواؤں کو ایک ساتھ جمع کیا اور مزوک کو ایک بڑے مناظرہ میں شکست ہوئی کیوں کہ وہ ایسے دو سوالوں کے جواب نہیں دے سکا جن کا کوئی بھی وہ شخص جواب نہیں دے سکتا جو بورژوائی سوسائٹی کے اصولوں کو بجا اور صحیح سمجھتا ہو۔ پہلا سوال تھا کہ اگر کوئی نجی جائداد نہ ہو تو سماج کے اعلیٰ ترین طبقوں کو کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے؟ دوسرا، اگر عورتیں بھی مشترکہ ہوں تو باپوں سے پیدا بیٹوں کی نسل کی کس طرح نشاندہی ہو گی؟ قباد کو رجعت پسند پیشواؤں نے اپنی طرف کر لیا اور اس نے مزوک اور اس کے پیروؤں کو سزا کے لئے نوشیرواں کے حوالہ کر دیا۔ فردوسی نے مزوک کے تقریباً ایک لاکھ پیرو بتائے ہیں۔ ان میں سے تقریباً تین ہزار کو سخت ترین سزاؤں کے لئے

علیحدہ رکھا گیا۔ انہیں باغ مزوک' میں سر کے بل اس طرح گاڑ دیا گیا کہ ان کی ٹانگیں چھوٹے پودوں کی طرح زمین کی سطح سے نکلی رہیں۔ مزوک کو بلا کر دکھایا گیا کہ اس کے پیروؤں کا کیا حشر ہوا ہے۔ اس کے بعد اسے ایک اونچی دار پر سر کے بل لٹکا کر تیروں سے ختم کر دیا گیا۔ فردوسی آخر میں کہتا ہے "اگر تمہارے پاس عقل ہے تو تم مزوک کے راستہ پر نہیں چلو گے مزوک نے مستلق حقوق کو للکارا اور ناکام رہا لیکن فردوسی اس کی شخصیت پر سیاہی نہیں پھیرتا ہے۔

ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک طوسی (1092ء-1018ء) نے اپنی شہرت یافتہ تصنیف "سیاست نامہ" میں ان غلط بیانیوں کو جمع کیا ہے جو ایک صدی کے دوران پھیل گئی تھیں اور ان میں کچھ اپنے خیالات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ نظام الملک اسماعیلیوں اور قرمطیوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ قبل اسلام کے ایک فرقہ یعنی "فرقہ مزوک" میں سے تھے جو اسلام میں بھی داخل ہو گئے۔ عظیم وزیر کو تاریخی اسناد کا ذرا بھی لحاظ نہیں تھا اور اس نے بلا جھجک مزوک کی سیرت کو سیاہ کرنے اور اس کی تعلیمات کو غلط بیانی سے پیش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس طرح اب مزوک افلاطونی نہیں رہا اور ہمارے سامنے اس کی تصویر ایک نجومی' فریبی اور عیار کی پیش کی گئی۔ ان تمام کہانیوں پر جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور جنہیں مزوک کے لئے گڑھا گیا ہے تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے لیکن جہاں تک مزوک کی تعلیمات کا سوال ہے نظام الملک لکھتا ہے : "مزوک نے اعلان کیا کہ 'جائداد تمام آدمیوں کے لئے ایک مشترک عطیہ ہے کیوں کہ وہ خدا کی مخلوق اور بنی آدم ہیں وہ تنگی میں کیوں رہیں؟ انہیں ایک دوسرے کی جائداد میں شرکت کرنے دیا تاکہ وہ سب مساوی ہو جائیں اور کوئی بھی مفلس یا محتاج نہ رہے..... اس کے بعد اس نے کہا کہ 'تمہاری عورتیں تمہاری جائداد کی طرح ہیں۔ تمہیں اپنی عورتوں کو دوسرے سے بھی متعلق سمجھنا چاہئے تاکہ تمام نوع انسان کے لئے خواہشات کی تکمیل کے دروازے کھلے رہیں اور ہر شخص اپنی جنسی ہوس اور لذت کی پیاس کو بجھا سکے۔ مزوک کی عورتوں اور بچوں کی اس اشتراکیت کی وجہ سے آدمی اور خاص طور سے عام لوگ اس کی طرف کھنچے۔ مزوک نے اس طرح کی رسوم قائم کیں جیسی کہ ذیل میں دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص

بیں مہمانوں کو اپنے گھر دعوت دیتا ہے تو وہ انہیں روٹی' گوشت' شراب' پھل اور موسیقی پیش کرے۔ آخر میں ہر ایک مہمان اس کی بیوی کے ساتھ مباشرت کرے اور ان میں سے کوئی بھی اسے غلط نہیں سمجھے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی کسی عورت کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کے دروازہ پر اپنی ٹوپی چھوڑ جائے اور کوئی دوسرا آدمی اندر جانا چاہے تو وہ ٹوپی کو دیکھے اور اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ پہلا آدمی واپس نہیں آ جاتا ہے" (شیفر Schefer' ص 199-168)

اب دیکھئے کہ سیاست نامہ کا مزوک فردوسی کے مزوک کی بالکل الٹ ہے۔ فردوسی کا مزوک ایک نیا اور سچا مذہبی سماج قائم کرنا چاہتا ہے جن میں ان پانچ بدہوسیوں کو عورتوں اور جائداد کی اشتراکیت سے دور کر دیا جائے گا جو آدمی کے ذہن کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ نیز اس کی دلیل (افلاطون کی طرح) بنیادی طور پر منطقی ہے۔ یہ روایت کے خلاف عقل کو متاثر کرتی ہے۔ ہمارے دور میں جس میں افلاطون کی ریپبلک' اتنی زیادہ مشہور ہے' اس حقیقت پر زور دینا ضروری نہیں ہے کہ عورتوں کی اشتراکیت' خواہ وہ عملی یا نہ ہو اس سے نرمی نہیں بلکہ جنسی تعلقات کی زیادہ سخت پابندی مراد ہو گی۔ اس کے برعکس سیاست نامہ مزوک پر ان ہوسوں کی فوری تسکین کی تعلیم کا الزام لگاتا ہے۔ جن پر خود مزوک نے موجودہ غیر اصلاحی سماجی نظام میں لعن طعن کیا تھا۔

میر خوند (انتقال 1498ء) اپنی روضتہ الصفا میں مزوک کے دروازہ پر اور زیادہ جرائم رکھتا ہے اور اس کے مذہبی عقائد کو بھی سیاہ کرتا ہے۔ "اس فاسق کا مسلک اس طرح تھا۔ تمام جائداد اور عورتیں مشترک ہوں گی اور وہ تمام محرم عورتوں کے ساتھ مباشرت کو' جن سے مذہب اور روایت نے شادی کی ممانعت کی ہے' ایک نیک کام تصور کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آدمی نباتات' انڈے' دودھ' پنیر اور ایسی ہی چیزیں کھا کر اکتفا کریں اور جانور مارنے اور جانور کا گوشت و چربی کھانے کی ممانعت کر دی۔ مزوک نے گرم کپڑے پہنے اور مذہبی ریاضات میں لگ گیا۔ اس وجہ سے مفلس' بدمعاش اور اوباش اس کے پیروؤں میں شامل ہو گئے۔ اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا..... کم اصل لوگوں نے اس کی مدد و حمایت سے دولت مندوں کی..... عورتوں کو پکڑا اور کافی

مال و اسباب لوٹا، اس دور کے بچوں کی ولدیت نہیں معلوم کی جا سکتی تھی اور کسی بھی شخص کو یہ یقین نہیں تھا کہ اس جائداد اور مال و اسباب مستقل اس کے قبضہ میں رہیں گے۔" (ص 258)

پروفیسر برنارڈ لوئس کا خیال ہے کہ "یہ تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مزوک نے جائداد کی اشتراکیت کا آغاز کیا لیکن اس میں شک ہے کہ اس نے عورتوں کی اشتراکیت کی تمہید کی۔" سیاست نامہ کے مطابق مزوک اور اسماعیلیوں کے درمیان رابطے کی کڑی مزوک کی بیوہ خرمہ سے ملتی ہے جس نے "خرم دینیہ" فرقہ کی بنیاد ڈالی جس سے ابو مسلم اور سند باد آتش پرست وابستہ تھے، شیعہ مذہب سے جس کی خالص مصلحتانہ وجوہات تھیں۔ اس تحریک کا تقلل اس ضرب المثل سے ظاہر ہوتا ہے کہ "مزوک شیعہ ہے" (The Origin of Islamism' ص 96-97)

اصل مزوک یعنی شاہ نامہ کے مزوک نے قحط سے خلاصی کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف جائداد کی تقسیم کی تدبیر تجویز کی تھی اور وہ بھی حقیقتاً قلت کے زمانہ میں صرف ذخیرہ میں بند اناج کی تقسیم تک محدود تھی۔ اس نے سماجی اصلاح کے اصول کی حیثیت سے، عورتوں اور جائداد کی اشتراکیت کا سوال بھی اٹھایا، لیکن عیاری، فریب اور بلکہ عملی نفاذ کا کوئی سوال نہیں تھا۔ عربوں نے جتنی آسانی سے ساسانی سلطنت کو ڈھیر کر دیا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے ایرانی ارماء اخلاقی حیثیت سے کتنا گر چکے تھے۔ مزوک نے داخلی انقلاب کے ذریعہ جن مقاصد کو حاصل کی کوشش کی انہیں درحقیقت ایک خارجی فتح نے حاصل کیا یہ مقاصد حسب ذیل تھے جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے طبقوں کے استحصال کو، جو برداشت کے باہر ہو گیا تھا، محدود کرنا، عورتوں کو اس حد تک آزاد کرانا کہ انہیں کم از کم کچھ انسانی حقوق تو مل جائیں جیسے حق وراثت، جائداد کو ملکیت میں رکھنے اور اپنی شادیوں میں کچھ آواز رکھنے کا حق۔

نظام الملک ایک عظیم وزیر تو تھا۔ لیکن اس کے پاس تاریخی تحقیقات کے لئے کوئی وقت نہیں تھا اور سیاست نامہ تاریخی غلطیوں سے پر ہے۔ وہ کٹر سنی تھا اور اس رائج الوقت عام تعصب کا کامل ترجمان تھا جس کے ذریعہ وہ زندہ رہا اور جس کے لئے

وہ مر گیا۔ ہم اس کا یہ خیال تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ اس کے عصر کے کٹر سنی اپنے دور کے اسماعیلیوں اور ساتھ ہی ساسانی مزوکیوں کو واقعی' اباحتی اخوتین' مانتے تھے۔ لیکن دونوں صورتوں میں الزام بالکل بے بنیاد اور غیر مستند ہے۔ (ح)

نصیحت: 8

برید کے بارے میں

(یہ نصیحت سونے اور چاندی پر ایک پیراگراف سے شروع ہوتی ہے۔" بہت سے لوگ اپنی زندگیوں سے زیادہ سونے و چاندی کی طرف راغب پیدا کئے گئے ہیں۔" اس کے بعد سماجی نظام کے تمام نقائص فلسفیوں کی چوکھٹ پر رکھے ہوئے ہیں۔ "اس سرزمین پر جو بدنظمیاں اور گناہ نمودار ہوتے ہیں ان کی وجہ وہ لوگ ہیں جن کا اس پر عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ کو تمام عالم اور اس کی باریکیوں کا علم ہے یا پھر جنہیں اس کے علم کے بارے میں شبہات ہیں اور اس پر قطعی یقین نہیں ہے کہ وہ علیم اور بصیر ہے۔" یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے نصیحت قلم بند کرنے سے پہلے اس کے موضوع کے بارے میں کچھ طے نہیں کیا تھا۔ یہ بھی دیکھنے میں آئے گا کہ جہانداری میں محاصل یا عام مالیات کے بارے میں کوئی نصیحت شامل نہیں غالبًا برنی کا پہلے ارادہ تھا کہ یہ نصیحت محاصل کے لئے وقف کی جائے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کے دوران اس نے منصوبہ بدل دیا۔ برید کے تقررات کے معاملات کو برنی نے بہت طول دیا ہے اور بے حد دہرایا نکھرایا ہے لہٰذا کچھ پیراگرافوں کا خلاصہ کرنے اور دوسروں کو خارج کرنے میں میں اپنے کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔ برنی کا ایک پسندیدہ موضوع یہ ہے کہ جس طرح کے آدمی ہیں ان کی حکومت کو اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں رکھا جا سکتا۔ اس موضوع کے سلسلہ میں تمثیل کے حصہ کی شکل میں بحث کی گئی ہے گو کہ اس کا نصیحت سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نے اس نصیحت کو دو غیر متعلقہ حصوں میں تقسیم کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھا ہے)

جب خدا کسی شخص کو منصب سلطانی سے سرفراز کرتا ہے اور عوام کے معاملات کو اس کی قوت فیصلہ اور عقلیم سلیم کو تفویض کرتا ہے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ

وہ عوام کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ اس کا یہ رویہ مذہب و مملکت کی بہتری اور عوام کی فلاح کا باعث بن سکے۔ لیکن یہ اس صورت میں ممکن نہیں وہ گا جب کہ سلطان آدمیوں کے نیک اور بداعمال سے لاعلم ہے۔ خاص طور سے اگر سلطان کی قربت میں رہنے والے اور ساتھ ہی ساتھ فوج کے سپہ سالار' افسر' منصف' صوبہ دار' درباری' مال گزاری وصول کرنے والے اور محاسب یہ شناخت کرلیں کہ سلطان ان کے نیک و بد اعمال سے ناواقف ہے تو وہ عوام کے ساتھ اپنے معاملات میں سلطان کی طرف سے دہشت زدہ یا خائف نہیں رہیں گے۔ مزید یہ کہ اگر سلطان اپنے عوام کی حالت سے ناواقف ہے تو وہ ان کی خوش حالی کے لئے تدبیریں نہیں کرپائے گا۔ آخری بات یہ کہ کل جب روز محشر میں' جس پر ہمارا عقیدہ ہے اور جس پر ہم ایمان لاتے ہیں' وہ سلطان سے اس کے محکومین میں سے ہر ایک کی حالت کے بارے میں سوال کریں گے تب اگر وہ کچھ بھی نہیں جانتا ہے تو جواب کس طرح دے پائے گا؟ اور بالفرض سلطان یہ کہتا ہے کہ "میں واقف نہیں ہوں اور میں واقف نہیں ہو سکتا تھا' تو یہ جواب نہیں سنا جائے گا کسی سلطان کو اتنے ہی زیادہ علاقہ پر حکومت کرنا چاہئے جس کے امور سے وہ واقف رہ سکتا ہے۔"

لہٰذا یہ سلاطین کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ برید (56) مقرر کریں۔

(اس کے بعد برنی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ قرآن کی تاکید 'ولا تجسو (اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا) کا اطلاق سلاطین پر نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے محکومین کے تمام نیک اور بداعمال کے لئے خدا کے آگے جواب دہ ہیں۔ اپنے محکومی کے سلسلے میں خدا کے سامنے ان کی وہی حیثیت ہو گی جو کہ ایک خاندان کے سربراہ کی اپنے خاندانی اراکین کے سلسلے میں ہو گی۔)

اور اب جب کہ اس مقدس یعنی رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے دور کے بعد اتنی پشتیں اور عرصہ گذر چکا ہے اور بے ایمانی' گناہ گاری' ناپرہیز گاری' فریب' دغا بازی' سفاکی' ناانصافی' بدظنی اور حسد اکثر ذہنوں میں سرایت کر گئے ہیں' نئی چیزیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں اور مذہب و مملکت میں مروج ہو گئی ہیں اور رسول اکرم کی سنت کی جگہ بدعتوں نے لے لی ہے جن کے ذکر سے کتب خانے بھر جائیں گے تو ایسی

صورت حال میں فرمانروائے سلطنت دیانت دار برید مقرر کئے بغیر اپنے فرائض کو ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو دنیا کا کام بدنظمی کا شکار ہو جائے گا اور ہر طرف فساد برپا ہو جائے گا۔

اس سرزمین پر کسی حکمراں کا عہدہ ایک بلند اقبال منصب ہے' لہٰذا اس کے بیٹے' بھائی' قریبی اعزاء اور مصاحبوں پر اپنی اپنی حیثیت کا نشہ چڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر انہیں سلطان کی ثابت قدمی کا یقین ہو اور یہ قطعی طور پر معلوم ہو کہ ان کے نیک اور بداعمال کی اطلاع اس کے کانوں تک پہنچنے والی ہے تو وہ چوکنے اور محتاط رہیں گے۔ اس میں صرف ان ہی کا بھلا نہیں ہو گا بلکہ سلطان کو بھی اپنے ہی خاندان کے لوگوں کو ان کے برے کاموں کے لئے سزا نہیں دینا پڑے گی اور اپنے حمایتوں کو دشمن نہیں بنانا پڑے گا اگر حکمراں خوب باخبر ہے تو اس سے محکومین کو بھی فائدہ ہے جب کہ اس کی بے خبری دونوں طرفین کے لئے مضر ہے۔

برید مقرر کرنے میں دین دار سلطانوں کا ایک اور مقصد بھی رہا ہے۔ اگر دارالسلطنت یا صوبوں میں کوئی بغاوت کھڑی ہوتی ہے یا باغی (ملک کے) باہر سے آتے ہیں تو باغیوں کی تعداد' قوت اور اتحاد کے بارے میں سلطان کے پاس خبریں پہنچ جائیں گی اور فتنہ پردازوں کی روش اور طریقے ان کے عمل پیرا ہونے سے پہلے ہی افشا ہو جائیں گے۔ اگر اپنے برید اور جاسوسوں کے ذریعہ سلطان کو ایک (منصوبہ بند) بغاوت کی اطلاع وقت سے ہو جاتی ہے تو وہ تحریک کو اس طرح کچل سکتا ہے کہ مسلمانوں کے بغاوت میں واقعی ہتھیار سنبھالنے کے بعد اسے ان کے خون سے ہاتھوں پر داغ لگانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ کیوں کہ سزائے موت' مرمت اور دیگر سزائیں دینے میں اسے اس میں تمیز کرنا چاہئے کہ کیا منصوبہ تیار کیا گیا تھا اور کس پر عمل ہوا۔ بغاوت کے لئے گفتگو کرنے اور سازش کے لئے ایک حکم ہونا چاہئے اور باغیانہ منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کے لئے دوسرا حکم۔ نیز اگر سازشیوں کو معلوم ہے کہ سازشیں سلطان سے چھپی نہیں رہ سکتیں تو وہ خائف رہیں گے اور ساز باز کرنے کے لئے مجلسیں منعقد کرنے سے پرہیز کریں گے۔ ان کے دلوں میں برے ارادے ہی کیوں نہ ہوں وہ انہیں ظاہر نہیں کریں گے اور ایک ساتھ شامل ہونے اور بغاوت کرنے کی

جسارت نہیں کریں گے۔ سلطان اچھی طرح باخبر ہے تو یہ اس کے اور اس کے محکومین دونوں کے لئے مفید ہو گا۔

(برنی بہت وثوق سے لکھتا ہے کہ خلیفہ حضرت عمر کو بھی ایسے راست باز زمانہ میں جس میں وہ خود رہتے تھے برید اور جاسوس مقرر کرنا پڑے)

برید' جاسوس اور محاسب کے تقرر میں دین دار سلاطین کے مندرجہ ذیل نیک اور پاک ارادے ہوتے تھے۔

پہلے تو یہ کہ جب دور و نزدیک کے قاضیوں' صوبہ داروں' افسروں اور مال گزاری وصول کرنے والوں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے اچھے اور برے کام روشنی میں آنے والے ہیں تو وہ رعیت پر ظلم و تشدد نہیں کریں گے' رشوت اور تحائف نہیں قبول کریں گے یا سفارشوں کو نہیں مانیں گے گناہوں اور غلط کاموں میں پڑنے کے لئے وہ راہ راست نہیں ترک کریں گے اور ہمیشہ اپنی ہی تقدیر سے خائف اور لرزتے رہیں گے۔ اس آگاہی کی وجہ سے وہ باضابطہ اور ساتھ ہی فنی سزاؤں کے نتائج سے محفوظ رہیں گے۔ دوسرے جب عوام کو یہ یقین ہو گا کہ خواص اور عوام دونوں کے نیک اور بداعمال کی اطلاع سلطان کو کر دی جائے گی اور اس مقصد کے لئے عہدیدار مقرر کر دیئے گئے ہیں تو وہ مناسب طریقے سے رہیں گے' نہ تو بغاوت کریں گے' نہ ایک دوسرے پر قابو پانے کی کوشش کریں گے۔ اور نہ ہی کمزور کو دبائیں گے۔ تیسرے اگر مال گزاری وصول کرنے والے اور محاسب یہ جانتے ہیں کہ ان کے کام سلطان کے علم میں لائے جائیں تو وہ چوری یا غبن نہیں کریں گے اور اس طرح سلطان کی سزاؤں سے محفوظ اور ذلت اور توہین سے بچے رہیں گے۔ آخری یہ کہ اگر سلطان کے بیٹوں' بھائیوں' رشتہ داروں اور اعلیٰ افسروں کو یہ معلوم ہے کہ تمام باتیں سلطان کو بتائی جا رہی ہیں تو وہ اپنے اعلیٰ رتبہ کی وجہ سے اپنے لوگوں یا اجنبیوں یا غلاموں اور خدمت گاروں کے ساتھ اپنے معاملات میں انصاف کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھیں گے (اس کے بعد سکندر اعظم اور سلطان محمود کے قائم کئے ہوئے برید طریقہ کا حوالہ دیا گیا ہے)

دین دار سلاطین نے برید کے تقرر کے بارے میں کئی شرائط کی پابندی کی ہے۔

سب سے زیادہ اہم شرائط برید کی اہلیت اور صفات ہیں۔ اسے تقریر و تحریر میں سچا' قابل اعتماد' عالی نسب' بھروسہ مند اور وقار و تمکنت کے بارے میں محتاط ہونا چاہئے اور لوگوں سے کم ہی گھلنا ملنا چاہئے تاکہ اس کا مقصد' یعنی سلطان کے لئے صحیح معلومات فراہم کرنا۔ حاصل ہو سکے۔ کیوں کہ سلطان صحیح اطلاع ملنے پر ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جو اس کی اور عوام کی فلاح کا باعث ہو۔

لیکن بالفرض برید چور ہے' دیانت چھو کر نہیں گئی ہے' کم اصل اور رذیل ہے' ہر جگہ اکثر آتا جاتا ہے اور ہر دروازہ پر پہنچ جاتا ہے' بداطوار' کھاؤ' حریص اور بے پروا ہے تو سلطان کی عوام کی فلاح و بہبود کی تمام کاوشیں غلط سمت میں چلی جائیں گی۔ کیوں کہ بے ایمان اور کم اصل برید' جو ساز باز اور ریشہ دوانیوں میں طاق ہے' ایسے جھوٹ گڑھتا ہے کہ سچ کا گمان ہو اور اس کی غلط اطلاعات کی تصدیق کی وجہ سے تمام کاروبار بد نظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں فائدے پہنچانے چاہئے تھے وہاں تکلیفیں دی جاتی ہیں' سزا کے قابل شخص پر عنایت کی جاتی ہے اور عنایات کے مستحق لوگ سزا یاب ہوتے ہیں۔ بے ایمان برید اپنے حرص' طمع اور بدچلنی کی وجہ سے' جو اس کی خلق میں اور اس کی کم اصلی سے ہیں' خدا کی مخلوق کو دن رات خوف میں گرفتار رکھتا ہے' کسی کو وہ اس لئے ڈراتا ہے دھمکاتا ہے کہ وہ اسے گھوڑا دے' دوسرے سے باندی کی توقع رکھتا ہے اور تیسرے سے سونا مانگتا ہے۔ وہ جھوٹ کی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بناتا ہے اور عداوت' بدلہ' غصہ' اور مکافات سے کام لیتا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو اپنی نیک نامی قائم کرنے کی غرض سے وہ کچھ خبریں بالکل صحیح صحیح دیتا ہے اور اپنے محکمہ کے فرائض بہت خوبی سے انجام دیتا ہے۔ لیکن ایمان داری کے لئے نام پیدا کرنے کے بعد یہ جھوٹے' کم اصل' رذیل اور بددین برید لوگوں کے مکانوں کو لوٹتے ہیں' ان سے مختلف طریقوں سے پیسہ اینٹھتے ہیں اور طرح طرح کے بہانوں سے انہیں تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔ وہ سلطان کو اپنے عوام کا اور عوام کو سلطان کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ ایسے اشخاص کا تقرر مخلوق خدا کی خوش حالی کا نہیں بلکہ ان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا سلاطین کو چاہئے کہ برید' محاسب اور جاسوسوں کے تقرر سے پہلے ان کے نسب کی تحقیق کر لیں۔ جن افسروں کو وہ مقرر کریں ان کی اکثریت'

نیک چلن' پیدائشی آزاد' اور زبان اور عمل میں سچی ہونی چاہئے۔ ایسے لوگ دنیاوی خواہشات سے پیٹھ نہیں موڑیں گے۔

(برنی نے اس موضوع پر مزید جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام نے دین کی خاطر دنیاوی عہدے سنبھال لئے تھے۔ یہ کام ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔" اس دور میں حقیقی دینی خوبی والے لوگ' حکومت کے عہدوں کو قبول نہیں کریں گے کیوں کہ "ان کی قابل تعریف خوبیاں ان قابل ستائش لوگوں کو دنیاوی امور کے قریب آنے یا حکومت کے عہدوں کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔" (57) لہٰذا سلطان کو اپنے بس بھر کوشش کرنا چاہئے کیونکہ اگر کامل خوبی کا مطالبہ کیا گیا تو حکومت کے عہدے خالی رہ جائیں گے۔" اس کے باوجود سلطان سستا" کچھ لوگوں میں زیادہ خوبی اور خوبی کے لئے نیک نامی پائے گا جب کہ دوسروں میں شاذ ہی خوبی نظر آئے گی اور بقیہ تو بدکاریوں کے لئے بدنام ہیں ہی۔

(اس جگہ برنی سلطان محمود کے بارے میں ایک قصہ کا اضافہ کرتا ہے۔ اس نے اپنے وزیر حسن میمندی سے برید (58) کے عہدوں کے لئے دو سو اشخاص منتخب کرنے کو کہا اور بداطواری کی صورت میں سزا کے متعلق ایک سخت دفعہ کا اضافہ بھی کیا۔ جب یہ لوگ اس کے تخت کے مقابل پیش کئے گئے تو اسے بتایا گیا کہ ایک سو تیس نے تو خدمت کرنے کے لئے رضامندی دی تھی اور ستر نے معذرت چاہی تھی۔ اس پر محمود نے ان ستر کا تقرر کر دیا جنہوں نے خدمت کرنے سے انکار کیا تھا۔ اور دوسروں کی تقرری کے پروانوں کو پرزے پرزے کرنے کا حکم دیا۔ برنی اعتراف کرتا ہے کہ اس طرح کی چال بہترین سہی لیکن اسے صرف ایک بار آزمایا جا سکتا ہے)

(اس نصیحت کے سلسلہ میں مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا گیا ہے جس کے لئے برنی تاریخ خلفائے عباسی کو بطور سند پیش کرتا ہے' خلیفہ مامون الرشید نے' جب وہ مروہی میں تھا' دینی زندگی اختیار کر لی اور شاگردوں کو حدیث کے سبق دینا شروع کر دیئے۔ اس نے بادشاہت کے رسم و رواج کو پس پشت ڈال کر اور تمام بریدوں اور امیروں کو برطرف کر کے صوبوں کی صوبہ داریاں' عاملوں' متقیوں' زاہدوں اور صوفیوں کی تفویض کر دیں۔ وزیر فضل بن سہل (59) نے بہت نرم' صاف' بالواسطہ اور دبے

لفظوں میں ان نتائج کی طرف مامون کی توجہ مبذول کرائی جو اس کے اقدام کے باعث پیدا ہو سکتے تھے۔ مامون نے ان پر کان نہیں دھرے لیکن جب بغاوتوں نے ہر طرف سر اٹھایا تو مامون نے اپنے دینی طریقوں کو ایک طرف رکھ دیا اور تب اس کے وزیر نے امور خلافت کو منظم کیا۔

(2- خلافت راشدہ کا دور تاریخ عالم میں درمیانی وقفہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوع انسان اپنے قدیم طریقوں پر واپس آ جاتا ہے)

(ذیل کے الفاظ' جو وہ فضل بن سہل کی زبان سے ادا کرواتا ہے' حقیقتاً بادشاہت کی ضرورت اور معصیت کے متعلق برنی کے ذاتی نظریہ کا لب لباب ہیں)

"بادشاہت کے غلبہ اور اثر کے بغیر لوگوں پر حکمرانی ممکن نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے طریقہ سے عوام پر حکومت نہیں کر سکا ہے۔ صرف رسول اکرمؐ کے زمانہ سے اپنی قربت کی وجہ سے' اور جسے ان کا (رسولؐ اکرم کا) ایک معجزہ سمجھا جا سکتا ہے' خلفائے راشدین اپنی دینی زندگی اور غربت کے باوجود ایک پشت تک ہی حکومت کر سکے۔ اور دنیا کو مناسب طور پر منظم رکھ سکے۔ لہٰذا آدم کے زمانہ سے دنیا کے آخر تک انہوں نے خلفائے راشدین کے اثر کو تمام عہدوں کے لئے ایک کامل نمونہ سمجھا گیا ہے۔ خلفاء راشدین تمام بڑے یا چھوٹے معاملات میں حدیث کی اتباع کرتے تھے لیکن اگر عصر آخر کے سلطان نے حدیث کی اتباع کی تو وہ ایک دن بھی اپنی بادشاہت برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔

اس کے باوجود خلفائے راشدین میں سے تین نے' جنہوں نے رسولؐ اکرم کی سنت سے انحراف کے خوف سے دنیاوی سلاطین کے ضوابط یا رسوم میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہیں کیا انہوں نے رسولؐ اکرم کی سنت کی خاطر جام شہادت نوش کیا' حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو ناعاقبت اندیش دین داروں نے شہید کر دیا۔ خلفائے راشدین کے علاوہ ماضی میں عالم اسلام کا کوئی بھی حکمراں رسول اکرم کی عسرت کی سنت کے مطابق زندگی بسر کر کے ملک کا نظم و نسق نہیں چلا سکا اور نہ ہی مستقبل کے لئے ایسی بات سوچی جا سکتی ہے کیوں کہ دنیا شیطانی آدمیوں سے بھری ہوئی ہے جن کے اندر شیروں' گوشت خور جانوروں اور شکاری درندوں کی خصوصیات ہیں۔ ان

پر جابر سلطانوں کی دہشت اور طاقت کے بغیر حکومت اور تسلط قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ خلفائے راشدین کے مددگار اور حامی رسولؐ اکرم کے وہ صحابی تھے جنہوں نے ایمان کی تمازت اور اپنی بے مثل دین داری کی وجہ سے اپنی زندگیاں' دولت' بیویاں' بچے جائداد اور مال اسباب اللہ کی راہ میں قربان کر دیئے تھے انہیں رسولؐ اکرم کی صحبت ملی تھی اور انہوں نے فیضان الٰہی کی زیارت کی تھی اس لئے ان کے اندر خدا اور اس کے رسولؐ کے لئے محبت کا اس قدر جذبہ تھا کہ ان کی نظروں میں تمام دنیا بھی ہیچ تھی۔ لہٰذا احکام الٰہی کی برتری کی خاطر وہ بھڑکتے شعلوں میں کود پڑے اور شہادت کے شوق میں سوئے تک نہیں۔ تمام مہاجرین اور انصار کرامات اور دینی بصیرت سے فیضیاب تھے۔ لہٰذا خلفائے راشدین کے لئے صحابہ کرام کے تعاون سے سلطانوں کی طرح حکومت کرنا ممکن تھا۔ جب کہ وہ خود مفلسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔

"اب جب کہ خلافت امیرالمومنین (مامون) کے پاس آ گئی ہے تو اس دور کو گذرے ہوئے دو سو سال ہو چکے ہیں اور سچے دین میں پختہ عقیدہ محدود افراد ہی میں باقی رہ گیا ہے۔ اسلام کا ظاہر اور اس کی خصوصیت بہت زیادہ بدل چکی ہے۔ دنیا ایک مرتبہ پھر رسم و رواج کے پیروؤں کے ہاتھوں میں آ گئی ہے اور وہ سب صرف اس دنیا کی بہتری دیکھتے ہیں۔ رسول اکرم کی آمد سے پہلے بنی آدم کی شجاعت اور حوصلہ صرف اس دنیا کے مقاصد کے لئے مخصوص تھے اور وہی اب ہے۔ بادشاہت کے دبدبہ' اثر اور قوت کے بغیر اور (دنیاوی) سلاطین کی ان شاہی روایات اور تدبیروں کو اختیار کئے بغیر جنہوں نے نافرمانوں کے سر کچل دیئے اور باغیوں اور سرپھروں کو ناکارہ کر دیا۔ خلافت کے تسلط اور مسند کو قائم یا مستحکم نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت' فتوحات اور بادشاہت۔ دینی عسرت کی زندگی کے متضاد ہیں۔ جب تک بادشاہت کا رعب اور دبدبہ قائم نہیں کیا جاتا ہے' لوگ ایک دوسرے کو غیر قانونی طریقہ سے دباتے رہیں گے۔ فرماں بردار نافرمان ہو جائیں گے۔ اعلیٰ ترین اقتدار کی عظمت معدوم ہو جائے گی اور حکومت کے احکام کا نفاذ ناممکن ہو جائے گا۔ کسراوں کے دہشت انگیز طریقوں کو استعمال کئے بغیر اور جمشید کی شان و شوکت کو اختیار کئے بغیر بہتر مذاہب کو زیر کر لینا اور انہیں احکام کا مطیع کر لینا ممکن نہیں ہے۔

"ایسا اسلام اور ایسے مسلمان باقی نہیں ہیں کہ کوئی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرح ان پر حکومت کر سکے۔"

نصیحت: 9

1- قیمتوں پر کنٹرول (نرخوں کا ضبط)

سلطان محمود نے کہا' اے محمود کے فرزندو اور سلاطین عالم اسلام! تمہیں یقینی طور پر معلوم ہو جانا چاہئے کہ مملکت کی تمام پالیسیاں اور مہمات ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ مثال کے طور پر جس طرح فوج خزانہ سے ادائیگی کے بغیر مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اشیاء کی کم قیمت کے بغیر اسے قائم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس طرح اشیاء کی ارزانی فوج کی مناسب تنظیم کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح ضروریات زندگی کی سستی قیمت کے بغیر عوام میں خوش حالی' آب و تاب اور استحکام نہیں ہو سکتا۔ سلطان کا در اور بارگاہ عوام کا قبلہ ہیں لیکن جب تک وہ نوع انسان کی ضرورتوں کو مہیا نہیں کرتے ہیں تو دور و نزدیک کے اشخاص کے دلوں میں شاہی اقتدار کی عظمت اور اقبال کے لئے کوئی احترام پیدا نہیں ہو سکتا۔ خواص و عوام کی اکثریت اس بارے میں ایک ہی رائے رکھتی ہے۔ اگر ضروریات زندگی کی اونچی قیمت کی وجہ سے ملک کے باشندے اور رعیت تکلیف میں پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر یا تمام مصیبت اور تباہی سے دوچار ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے عزیز وطن اور اپنے قدیم گھروں کو ترک کر دیں گے اور اس ملک کی طرف رخ کریں گے جہاں ضروریات زندگی ارزاں ہوں اور آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔

لہٰذا پہلے کہی ہوئی بنیادی باتوں کی بنیاد پر سلطانوں پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ فوج کی ضروریات کی قیمتیں' جیسے گھوڑے اور ہتھیار اور ساتھ ہی اناج اور کپڑے' جو خواص و عوام دونوں کی گزر اوقات پر اثر انداز ہوتے ہیں' کم کرنے کے لئے سخت جدوجہد اور بس بھر کوشش کریں۔ انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی سلطنت کا استحکام فوج اور عوام کے استحکام پر اور فوج اور عوام کا استحکام ضروریات زندگی کی کم قیمتوں پر منحصر ہے۔ قحط کے دوران' جو کہ آسمانی قہر ہے' بارش نہ ہونے سے خوراک کی پیداوار

میں شدید کمی آ جاتی ہے' حکمراں اس کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ قحط کے دنوں میں سلطان کی کوششیں ضرورتاً" خراج اور جزیہ کی ادائیگی یا کمی اور خزانہ سے ہر ممکن مدد کی منظوری تک محدود رہتی ہیں۔ لیکن اس کی کوششیں قحط سے پیدا شدہ قیمتوں کو کم نہیں کر سکتیں لہٰذا وہ قابل معافی ہے۔ لیکن بکثرت بالیدگی کے دوران جب بارش کی نعمت آتی ہے اور فصلیں' پھل' کاشت کئے ہوئے کھیت اور باغات خوب پھلتے پھولتے ہیں تب بھی سوداگر کا روانی اور سوداگر ابزی اس سب کے باوجود زیادہ قیمتوں پر فروخت کرنے کا طریقہ ہی عام رکھتے ہیں۔ اونچی قیمتوں سے جو منافع ہوتا ہے اس کی وجہ سے تمام دولت مند لوگ تجارت اور احتکار اپنا لیتے ہیں' لہٰذا سلطانوں کا یہ اولیں فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں اور ان میں کمی کے لئے سخت جدوجہد کریں۔ انہیں ایسے لوگوں کو اپنی ایجاد کردہ ترکیبوں سے خرید و فروخت کے معاملات طے کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہئے جن کے چال چلن خراب ہیں اور جنہوں نے زیادہ قیمتوں پر فروخت کرنے ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔ (60)

سلطان کو خود اپنے تخت کے سامنے پیداوار کی لاگت (نرخ براودد (61) کے مطابق تمام اشیاء کی قیمتیں طے کر دینا چاہئے۔ برید اور ایمان دار و سخت منصفوں کو چاہئے کہ وہ خرید و فروخت کے معاملات کو قابو میں رکھیں اور ان کے بارے میں خوب تفتیش و تحقیق کریں۔ اناج' کپڑے اور دوسری اشیاء کی کم قیمت کو انتظامی امور میں کوئی آسان کام یا کھیل نہیں سمجھنا چاہئے۔ تمام سلطانوں کو عوام کی ضروریات کی کم قیمت کو ملک کے اپنے بہتر انتظام اور نظام عدل کی بنیاد خیال کرنا چاہئے۔ انہیں منڈیوں کے گماشتوں اور شہروں کے شحنہ اور کوتوالوں کو یہ حکم دینا چاہئے کہ وہ دارالسلطنت میں کسی بھی حالت میں احتکار کی اجازت نہ دیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ احتکار کرنے والوں کا غلہ ضبط کر کے فروخت کر دیں کیوں کہ رسولؐ اکرم نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ شخص جو احتکار کرتا ہے اور جس نے احتکار کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے اس نے اپنے کو عوام اور ان کی ضروریات زندگی کے درمیان دیوار بنا لیا ہے اور عوام پر افراط کے فیوض کو محدود کر دیا ہے۔ اگر وہ حکومت کے احکام کے بلوجود احتکار سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی جائیداد بطور سزا

ضبط کر لینا چاہئے اور اسے جلا وطن کر دینا چاہئے تاکہ یہ دوسروں کے لئے ایک تنبیہہ اور عبرت رہے۔

بازار کے افسروں (رؤسا) کو یہ ہدایت کرنا چاہئے کہ وہ دکان داروں کو اپنا پابند رکھیں اور قیمتوں کا تعین ان پر نہ چھوڑیں۔ انہیں قیمتیں مقرر کرنے کے لئے (جیسا کہ حکومت نے حکم دیا ہے) اور خرید و فروخت کے معاملات میں چھان بین کرنے کے لئے سخت جدوجہد کرنا چاہئے' اس بڑی مہم میں' جس کی کامیابی اور ناکامیابی خواص و عوام دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے' انہیں کسی ڈھیلے پن کا مرتکب یا اپنے ہی بھلے کے لئے کام کرنے کی تحریص نہیں ہونا چاہئے۔ وہ قیمتوں کے معاملہ کو تفصیل طلب امر نہ سمجھیں۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان خریداروں یا فروخت کنندگان کی مدد کے لئے آئیں جو لاعلم' نوجوان' دیہاتی' لاچار اور کمزور ہیں۔ انہیں چاہئے کہ خرید و فروخت کے بازاری معاملات میں عدل کا نفاذ کریں۔ اور ٹھگوں' جعل سازوں' وعدہ شکن' اور غلط چیزوں کے فروخت کنندگان کو توہین آمیز سزائیں دیں' افسروں کو دکان داروں' بقالوں' کاریگروں اور دوسرے بے شرم لوگوں کی پابندی اور لاچاری کی نمود کے فریب میں آکر انہیں لاچار' شرمیلے نوجوان اور بے خبر لوگوں پر ظلم توڑنے کی غرض سے دکانوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دینا چاہئے یا پھر تجارتی لین دین کے انوکھے طریقوں' بدمعاشی' برے کاروبار' دیدہ دلیری اور بے حیائی کی طرف رجوع نہیں ہونے دینا چاہئے یا انہیں اپنے ہی کانچ کے دانوں کو ہیروں کا نام دے کر ہیروں کی قیمت پر فروخت نہیں کرنے دینا چاہئے اور فروخت کنندگان کے ہیروں کو پتھر اعلان کر دینا چاہئے تاکہ وہ انہیں پتھروں کی قیمت ہی پر خرید سکیں۔

اگر کوئی سلطان اپنے احکام کا نفاذ کرنے کے اختیار کے باوجود بدمعاشوں' دغابازوں' بے شرم اور بے خدا لوگوں کو اس طرح لاچار' غریب' ناتواں' مصیبت زدہ' نوجوان اور بے خبر لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی چھوٹ دیتا ہے اور ضروری تحقیق و تفتیش کا حکم نہیں دیتا ہے اور بہتر فرقوں کے لین دین میں یکساں عدل نافذ نہیں کرتا ہے تو اسے "ظل الٰہی" یا صحیح حکمراں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

سلطان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ خرید و فروخت اور دارالسلطنت کے لئے

مقرر کی ہوئی قیمتوں کے سلسلہ کا ہر نقش اس کے تمام صوبوں میں بھی ظاہر ہو گا اس کے افسر اور رعیت اسے تسلیم کریں گے اور اس کی پیروی کریں گے۔ (62)

اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فوج کی ضروریات اور عوام کی زندگی کی ضروریات کی ارزانی کے بہت سے دینی اور دنیاوی فوائد ہیں جو سلطان اور محکومین دونوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہیں :۔

(پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ فوج مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ دوسرے' سلطان کا دارالسلطنت ہر صنعت و حرفت کے ہوشیار اور مشاق منتخب آدمیوں کے آباد ہونے کے باعث ایک عالمی دارالسلطنت بن جاتا ہے۔ تیسرے' سلطان کے حریف اس کی فوج کی طاقت اور اس کی رعایا کی خوش حالی کو دیکھتے ہوئے اس کے ملک پر قابو پانے کا کوئی منصوبہ دل میں نہیں لاتے) چوتھے' عوام کی ضروریات کی کم قیمتیں سلطان کے لئے ایسی شہرت کا باعث ہوتی ہیں جو سالوں اور پشتوں عوام کے حافظہ میں رہتی ہے۔ نیز عوام میں غصہ اور حسد باقی نہیں رہتا اور آپسی محبت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ہر طرف رحمتیں' امن اور نیک خواہشات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس' زائد قیمتوں اور احتکار کی وجہ سے بے ایمانوں کے گنتی کے مکان تو بھر جاتے ہیں لیکن خریداروں کے ہزارہا مکان مفلسی اور مصیبت کا شکار ہو جاتے ہیں اور احتکار کرنے والوں اور اشیاء فروخت کرنے والوں کے لئے عوام کے دلوں میں دشمنی کے ساتھ انتقام کا جذبہ بڑھنے لگتا ہے۔ پانچواں فائدہ کم قیمتیں سلطان کے خزانہ کے لئے جو کہ مسلمانوں کا بیت المال بھی ہے۔ فائدہ مند ہیں۔ اگر غلہ اور اشیاء کمیاب ہیں تو حکومت کے کام میں کثرت سے پیسہ خرچ کرنا پڑے گا اور اس طرح خزانہ خالی ہو جائے گا۔ ایسے حالات میں حکمراں اور محکومین کی حالت زبوں ہو جاتی ہے۔ عام حالات میں خزانہ رعیت سے وصول کئے گئے پیسہ سے پر کیا جاتا ہے لیکن جب اناج اور اشیاء کمیاب ہوں گی تو خزانہ کا پیسہ رعیت کے مکانوں میں جائے گا اس کے علاوہ حکومت کے اخراجات مین کوئی حدود یا پابندیاں تو ہیں نہیں کیوں کہ ایک شاہی کارخانہ تک میں کئی ہزار گھوڑوں کے لئے چارہ بھوسا مہیا کرنا ہوتا ہے۔ زائد قیمتوں سے جو نقصان ہوتا ہے اس کا دارالسلطنت پر براہ راست اثر پڑتا ہے اور پھر یہ اثر دارالسلطنت سے تمام ملک میں

پھیل جاتا ہے۔ چھٹا فائدہ' یہ فائدہ بھی سلطان اور رعیت دونوں سے متعلق ہے۔ بادشاہت کا اعلیٰ ترین مقصد عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ لیکن جب کبھی دارالسلطنت میں' جسے عدل و انصاف کا سرچشمہ ہونا چاہئے۔ خرید و فروخت کے معاملات میں کھلم کھلا ناانصافی ہوتی ہے اور سلطان ان کی اصلاح کا حکم نہیں دیتا ہے' اور جب کہ احتکار کرنے والوں اور اشیاء فروخت کرنے والوں کے مکان بغیر اپنی کسی محنت اور پریشانی کے عوام کے پیسوں سے بھر جاتے ہیں لیکن جن کی اپنی پسینہ کی کمائی ہے ان کے مکان بغیر کسی آفت سماوی یا بد قسمتی کے خالی ہو جاتے ہیں اور ہر روز ان کی مصیبت اور مفلسی میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور سلطان جس کا کام عدل قائم کرنا ہے قیمتیں مقرر کر کے اور احتکار کرنے والوں اور اشیاء فروخت کرنے والوں کو تنبیہہ اور سزا دے کر اپنا فرض انجام دیتا ہے تو ان سب وجوہات کی بناء پر سلطان کا انتظامیہ بد نظمی میں پڑ جاتا ہے' اسے ذمہ دار اور خدا کے یہاں سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے اور ہر چیز اس کی غفلت سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ ساتواں فائدہ' بادشاہت کے قیام میں ایک حکمت الٰہی یہ تھی کہ یہ "اپنے دولت مندوں سے لے کر اسے اپنے مفلسوں کو دینے' کا فرض انجام دے۔ مفلس زور ڈال کر دولت مندوں کے مال و جائیداد پر اپنے حقوق کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ احتکار کرنے والے اور اشیاء فروخت کرنے والے کوئی اور نہیں دولت مند ہی ہیں۔ احتکار کرنے والے اپنے کاروبار کے دوران مفلس و محتاج سے ان کی گزر بسر کے تمام ممکن ذرائع لے لیتے ہیں اور فروخت کے بہانہ سے ان سے ہر چیز لے کر اپنے گھروں کو ہو لیتے ہیں۔ اس طرح مشیت الٰہی کی توہین کی جاتی ہے۔ کم قیمتوں سے اس سے بڑا کوئی فائدہ نہیں کہ خواص و عوام میں حکمت الٰہی کی مشیت میں سے ایک کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ آٹھواں فائدہ احتکار اور زائد قیمتوں پر فروخت سماجی گناہ ہیں۔ وہ ذاتی گناہوں کی قسم میں نہیں آتے۔ کیوں کہ ان سے دوسروں کا نقصان ہوتا ہے۔ (63) لیکن سلطان کے احکام اور کوششوں سے انہیں کچلا جا سکتا ہے۔ دانش مندوں سے اس خدمت کے انجام دینے کے عوض میں ملنے والا اجر الٰہی پوشیدہ نہیں ہے۔

نواں فائدہ' اس میں بھی حاکم اور محکومین کی خوش حالی شامل ہے۔ احتکار ہندوؤں (مجوسیوں) کافروں اور مشرکوں کا پیشہ ہے کوئی شخص جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور پھر

بھی احتکار (64) کو اپنا پیشہ بناتا ہے اور مخلوق خدا کو اپنی مکاری سے ان کی کفالت سے محروم کرتا ہے تو وہ اسلام سے لابلد ہے اور اس سے متاثر نہیں ہوا ہے۔ احتکار کے نتیجہ میں مسلمانوں کے مکانوں سے' جن کی عزت خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابندی میں ہے' دولت نکل کر ہندوؤں اور مجوسیوں کے مکانوں میں چلی جاتی ہے جن کی جائیداد' ازواج اور اولاد کو کچھ اسلامی فرقے مال غنیمت خیال کرتے ہیں۔ (65) لہٰذا وہ اشخاص' جن کی تذلیل اور معزولی دین کا عائد کردہ فرض ہے۔ احتکار کے ذریعہ مسلمانوں سے حاصل کی ہوئی دولت کے باعث عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان جنہیں خدا عزت و عنایت سے مالا مال کرتا ہے۔ اپنی مفلسی اور کم مائیگی کی وجہ سے کمتر اور حقیر ہو جاتے ہیں۔ اگر سلطان کم قیمتوں کے سلسلہ میں جدوجہد کرے تو جنہیں خدا نے عزت بخشی ہے وہ سماج میں زیادہ عزت حاصل کریں گے اور جنہیں خدا نے مطعون کیا ہے وہ زیادہ محتاج اور لاچار ہو جائیں گے۔ انتظامیہ کے سلسلے میں یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔ دسواں فائدہ' اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی سستی قیمت کی وجہ سے ملک کی رعیت کا ہر گروہ طبقہ' ذات اور برادری صنعت و حرفت اور دیگر فنون اور پیشہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ امور حکومت کے استحکام میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو موزوں کام کے لئے موقوف رکھتا ہے کیوں کہ اس طرح ملک کے انتظامی معاملات بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی احتکار اور زیادہ قیمتوں پر فروخت کرنے میں بہت کافی فائدہ دیکھا جاتا ہے اور دوسرے پیشوں میں زیادہ منافع نہیں رہ جاتا تو لوگ ایک فطری تحریک کے تحت اپنا ہی پیشہ ترک کر دیتے ہیں۔ سپاہی کاشت کا کام اختیار کر لیتے ہیں۔ کاشت کار تجارت میں کافی فائدہ دیکھ کر اسے اپنا لیتے ہیں اور احتکار کرنے والے اپنی دولت کے اثر سے اعلیٰ عہدوں کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتے ہیں۔ دکان دار افسر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ عالی نسب سوداگر بن جاتے ہیں اور سوداگر کاروانی حکومت میں امیر اور فوج کے سالار بننے کی چاہ کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر امور مملکت مستحکم نہیں رہتے۔ لیکن کم قیمتوں کی وجہ سے ملک کی رعیت میں کوئی بد نظمی یا افراتفری نہیں پھیلتی۔

انتظامیہ اور فتوحات کی صحیح نوعیت کے بارے میں جنہیں کوئی علم اور تجربہ نہیں

ہے وہ کہتے ہیں کہ سلطانوں کو قیمتوں پر کنٹرول اور قیمتوں کو مقرر کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ کم قیمتیں فراوانی پر موقوف ہیں۔ (66) اور رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے 'خدا بخشنے والا ہے' اس طرح کی بحث بظاہر تو صحیح ہے' لیکن یہ دنیا بدلتی رہتی ہے اور زمانہ کی گردش کی وجہ سے بنی آدم ہر عہد اور قرن میں قدرتی طور پر مختلف طور طریق اختیار کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ان حالیہ پشتوں میں' جو روز محشر کے قریب تر اور رسولؐ اکرمؐ اور صحابہ کرام کے فضیلت ماب دور سے اتنا پیچھے ہٹ گئی ہیں' خوبیوں کی منتہا پستی کی انتہا میں تبدیل ہو چکی ہے' مادی دنیا کی محبت ان بندوں کے سوائے جن کے لئے مشیت خدا کچھ اور ہے تمام لوگوں کے قلوب پر حاوی ہو گئی ہے' اور شیطان اور پست جذبات نے نوع انسان کے اکثر اشخاص پر غلبہ حاصل کر لیا ہے لہٰذا مستقل بارش اور پھلوں کی کثرت اور عمدہ فصلوں کے باوجود ان لوگوں پر غلہ اور کپڑے کی زائد قیمتوں کا لالچ اور طمع ان کے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے ان پر غالب آ جاتا ہے۔ وہ احتکار اور زائد قیمتوں پر فروخت کا طریقہ ترک نہیں کرتے اور نہ تو انہیں خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ سلطان کا۔ دولت مند اپنی مرضی کی قیمتوں پر مفلسوں کو غلہ اور کپڑا فروخت کرتے ہیں۔ احتکار اور زائد قیمتوں پر فروخت میں اپنی ہوشیاری کی وجہ سے وہ حکمراں کو' جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مقرر کیا گیا ہے کسی بھی طرح تحقیق و تفتیش کرنے' قیمتوں پر کنٹرول کرنے اور نرخ مقرر کرنے یا تنبیہوں اور سزاؤں کے ذریعہ خرید و فروخت کے معاملات میں عوام میں عدل قائم کرنے یا اسے ناانصافی کے خلاف اپنے عوام کے تحفظ کے لئے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع نہیں دیتے۔ روز محشر میں حکمراں اس سب کے لئے کیا جواب دے گا اور اس کی غفلت کے لئے اس کے عذر کیسے تسلیم کئے جائیں گے۔

2- اسلام کے اصولوں اور ادارہ بادشاہت کے درمیان تضاد

محمود کے فرزندوں اور درحقیقت اس سرزمین کے تمام سلطانوں کو قطعی طور پر یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ محمود بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ رسول اکرم حضرت محمد بن عبداللہ قریشی کے نقش قدم پر چلنا ہی سچا دین ہے۔ لہٰذا جو اپنی

زندگی کے طور طریق اور ذریعہ معاش میں رسولؐ اکرم کی رہبری اور قیادت اور ان کی سنت کی پیروی کرتا ہے۔ وہ دین دار کہلاتا ہے اور اس کے لئے دین کا فیض اور نعمت ہے۔ اس کے برعکس شاہی حکومت صرف خسرو پرویز اور ایران کے عظیم شہنشاہوں کی حکمت عملی ہی پر چل کر کی جا سکتی ہے۔ جو شخص بھی ان کی حکمت عملی اور نظیروں کی تقلید کرتا ہے اور ان کی زندگی کے طور طریق کو اختیار کرتا ہے وہ بادشاہت اور حکومت حاصل کر لے گا۔ اس کے بعد عوام اس کے مطیع ہوں گے اور اس دنیا میں اس کے احکام جاری ہوں گے۔

رسولؐ اکرم حضرت محمد کی سنت اور ان کی حیات اور رہن سہن کے طریقہ میں اور ایرانی شہنشاہوں کے رسم و رواج اور ان کی زندگی اور رہن سہن کے طور طریق میں مکمل تناقص اور قطعاً" تضاد ہے۔

جب خلفائے راشدین کے عہد میں ملک ایران و شام فتح ہوئے تو ابوبکر' عمر' عثمان' اور علی سلطان' حکمران اور اعلیٰ ترین حاکم بنے اور اپنے دین کی کاملیت کی وجہ سے انہوں نے اپنی زندگیوں کو خطرہ میں ڈال دیا۔ اور رسولؐ اکرم کی حیات اور رہن سہن کے طریقہ' ان کے تقویٰ اور درویشی اور ان کے عوام کے ساتھ پیش آنے کے اصولوں سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے۔ انہوں نے ایرانی شہنشاہوں کی سیاسی تدبیروں اور روایات کو اختیار نہیں کیا جو کہ حکومت اور بادشاہت کے لئے ضروری ہیں اور تمام قدیم اور موجودہ قرنوں میں تنہا وہی رسولؐ اکرم کے معجزہ کی طرح درویشی اور جمشیدی کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ انہوں نے دنیا پر حکومت تو کی لیکن خود چیتھڑے پہنے' مفلس رہے' اور فاقے کئے۔ اس کے باوجود عمر' عثمان اور علی کو ناعاقبت اندیش دین داروں نے شہید کر دیا۔

ان کے بعد عالم اسلام کے خلفاء و سلاطین کو دو متضاد صورتوں کا سامنا کرنا پڑا اور دونوں ہی دین و دولت دونوں کے لئے ضروری تھیں۔ اگر وہ رسولؐ اکرم کی سنت اور ان کے طریقہ حیات کی پیروی کرتے ہیں تو ان کے لئے بادشاہت اور حکومت دونوں ناممکن ہوں گی۔ اس کے برخلاف اگر وہ اپنے اٹھنے بیٹھنے' کھانے' پہننے اور اپنی زندگی کے عام طور طریقوں میں ایرانی شہنشاہوں کی پالیسی پر چلتے ہیں جو سرکشوں کے ٹکڑے

ٹکڑے کر دیتی ہے۔ باغیوں کو کچل دیتی ہے اور احکام سلطنت کے لئے ضروری ہے تو رسولؐ اکرم کی سنتوں سے، جو ایمان کا سنگ بنیاد اور اساس ہیں، انحراف کرنا ضروری ہو جائے گا۔

سلاطین اور ان کے مصاحبین کے اطوار پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ نبوت دین کا کامل نمونہ ہے اور بادشاہت دنیوی اقبال کا انتہائی درجہ ہے یہ دونوں انتہائیں ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں اور ان کا یکجا ہونا ممکنات کی حدود سے باہر ہے۔

خدا کی بندگی دین کی لازمی شرط ہے اور عجز، التجا، بیکسی، افلاس، انکسار، نفس کشی، عسرت اور اشک بندگی کی ضروری شرائط ہیں۔ اس کے برعکس بادشاہت، جو کہ دنیاوی اقبال کا عروج ہے، کے لوازم طاقت، فخر، عدیم المثال حیثیت، عیش و عشرت، خود ستائی، دوسروں کا استخفاف، شان و شوکت اور وقار و تمکنت ہیں۔ یہاں جو خوبیاں گنائی گئی ہیں وہ اللہ کے اوصاف ہیں، اور چوں کہ بادشاہ خدا کی نیابت اور خلافت ہے اس لئے بندگی کے اوصاف اختیار کر کے سلطان ہونا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا عالم اسلام کے حکمرانوں کے لئے ایرانی شہنشاہوں کے طرز عمل پر چلنا ضروری ہو گیا تاکہ قرآن کی عظمت اسلام کی برتری، صداقت کی قوت، دین کے مخالفین اور حریفوں کی بیخ کنی، دین کے احکام کے نفاذ اور اپنے اقتدار کے قیام کو یقینی کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی طاقت قائم کرنے کے لئے خدا کے منکروں (ایرانی شہنشاہوں) کے طریقہ عمل کو اختیار کیا ہے تاکہ دین کی ترقی و تحفظ اور کلام الٰہی کی بلندی کے لئے مستقل جہاد کے ذریعہ بت پرستی اور شرک کو ختم کر کے اور دشمنان دین کو مار کر اور قتل کر کے اسلام کا اقبال بلند کرنے کے لئے وہ اپنے اقتدار اور طاقت کو استعمال کر سکیں۔

تاہم اسلام ایرانی شہنشاہوں سے سرزد ہوئی بے انصافیوں کو قطعاً" ممنوع اور ناجائز قرار دیتا ہے۔

لیکن جس طرح سڑا ہوا گوشت کھانا ممنوع ہونے کے باوجود سخت ضرورت کے وقت مباح ہے اسی طرح ایران کے غیر اہل کتاب شہنشاہوں کی رسوم و روایات جیسے

تخت و تاج' رتبہ کی یگانگت' فخر و تکبر کم آمیزی' دربار سلطانی میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب۔ اونچے عالیشان محل' آداب دربار' لوگوں سے سلطان کو سجدہ کرنے کے لئے کہنا' خزانے بھرنا' ملک و مال کا غلط استعمال' سونے کے زیورات اور جواہرات اور ریشمی کپڑے زیب تن کرنا' اور دوسروں سے بھی وہی پہننے کو کہنا' مصلحت ریاست کی بنیاد پر لوگوں کو سزائے موت دینا۔ بڑے بڑے حرم رکھنا' کسی حق کے بغیر لاپرواہی سے خرچ کرنا' ممالک کو میراث کے کسی دعوہ کے بغیر قبضہ میں کرنا ان سب باتوں کو صداقت اور سچے ایمان کے نقطہ نظر سے سخت ضرورت کے وقت سڑے ہوئے گوشت کھانے کے مانند مباح تعبیر کرنا چاہئے۔ دیندار سلاطین کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے کاموں سے خائف اور پشیمان رہیں جو دین کے لئے خطرہ ہیں وہ راتوں کو گریہ و زاری کر کے خدا سے بخشش کی فریاد کریں۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بادشاہت کے تمام رواج اور طریقے رسولؐ اکرم کی سنتوں سے انحراف ہیں اور اس خلاف ورزی میں وہ اور ان کے پیرو اور ان کے خدمت گار سب شامل ہیں (برنی اس سے آگاہ کرتا ہے کہ رسولؐ اکرم چھری سے کاٹ کر گوشت تناول نہیں فرماتے تھے کیوں کہ یہ ایرانی شہنشاہوں کا طریقہ تھا)

لہٰذا اے محمود کے فرزندو' تمہیں یہ بخوبی معلوم ہو جانا چاہئے کہ ایرانی شہنشاہوں کی روایات کی تقلید کے بغیر بادشاہت ممکن نہیں ہے اور تمام عالم دین اس سے واقف ہیں کہ یہ روایات رسولؐ اکرم کی سنتوں اور ان کے اسوہ کے منافی ہیں۔

(چنانچہ کوئی بھی سلطان جو ان روایات کو اختیار کرتا ہے اسے اس وقت تک اپنے کو مسلمان تصور نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی نجات کی کوئی معقول امیدیں وابستہ کرنا چاہئے جب تک کہ وہ خاص مقاصد کے حصول کے لئے اپنے اختیارات استعمال نہیں کرتا جن کا برنی اس طرح تعین کرتا ہے: دین اسلام کا تحفظ کرنا' قرآن پاک کو بلند کرنا' دین کے اوامر و نواہی کا نفاذ کرنا۔ بت پرستی اور شرک کو کچلنا' بدعتوں اور ان کے بانیوں کو ختم کرنا' شریعت کی نافرمانی کرنے والوں کو نیست و نابود کرنا' بہتر فرقوں کو شریعت کا پابند بنانا' ضرورت کے علاوہ کسی بت پرست' مشرک یا بدعتوں کے بانیوں کی ملک میں عزت کرنے کی اجازت نہ دینا' مظلوموں کو بچانا اور عدل قائم کرنا۔

عالم اسلام کے سلاطین کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جب کہ پوری سلطنت میں کچھ لوگوں کا مندرجہ ذیل احکام سے لرز جانا ممکن ہے کہ 'اللہ کا حکم ہے' رسولؐ اکرم کا حکم ہے' اور علماء دین کا حکم ہے' لیکن زیادہ تر عوام صرف سلطان کے خوف' اس کے طاقت و جبر اور اس کی برہنہ شمشیر سے کانپتے ہیں۔ امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا ہے کہ "قرآن کے نسبتاً" سلطان سے خوف کھانے والے کہیں زیادہ ہیں۔" کیوں کہ خوف قرآن سچے ایمان کا نتیجہ ہے اور سچا ایمان اس دور میں سرخ گندھک کی طرح کمیاب ہے۔ لہٰذا اگر سلطان اپنے طاقت و جبر سے بہتر فرقوں کے معاملات میں عدل و انصاف قائم نہیں کرتا ہے تو اس کی قوت اور اقتدار فضول تصور کئے جائیں گے۔

(اس نصیحت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی گئی ہیں 1- امیرالمومنین حضرت عمر کی قائم کی قیمتوں کی سند میں' جنھوں نے مدینہ کے گرد و پیش میں پچاس ہزار دستے مقرر کئے تھے' تاریخ ماثر صحابہ کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک معقول خیال کا اضافہ کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔ "کم قیمتیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔ لیکن وہ سلطان کے عدل' عمدہ انتظام' اور کوششوں پر منحصر ہوتی ہیں' خدا دودھ اور چاول کا پیدا کرنے والا ہے لیکن انہیں برتن میں رکھنا اور پکانا آدمی کا کام ہے۔" 2- اس کے بعد قبل اسلام کے ایرانی وزیروں کے غلہ کا ذخیرہ کرنے اور گھوڑوں کی بکثرت فراہمی کے اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن کوئی سند پیش نہیں کی گئی ہے۔)

نصیحت: 10

سلطان کے وقت (کی اہمیت) کے بارے میں

(اس نصیحت میں برنی نے پچھلی باتوں کی تکرار کی ہے۔ کچھ عام باتیں ہیں جو ہر اس شخص کے دماغ میں آ جائیں گی جو اس موضوع پر غور و خوض کرنے کی کوشش کرے گا۔ مندرجہ ذیل پیراگراف کافی ہو گا)

سلطان کی اپنی عنایت کے اعتراف کے سلسلہ کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وہ وقت کی اہمیت محسوس کرتا ہے اور اپنے وقت کو' جو کسی دوسرے کے وقت سے زیادہ قیمتی ہے'

برباد نہیں کرتا۔ امور حکومت اور انتظامیہ میں اسے اس طرح مصروف رہنا چاہئے کہ خدا سے قربت حاصل ہو جائے اور اس طرح رضاء الٰہی کا وسیلہ اس کے ہاتھوں میں آ جائے۔ وہ اپنی بیش قیمت زندگی کو لذتوں کی نذر نہ کرے۔ لیکن سلطان کے لئے اپنے فرائض منصبی کی طرف مناسب طریقہ سے متوجہ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ دن اور رات دونوں کے لئے اپنے وقت کا سختی سے تعین نہیں کرتا اور ہر کام کے لئے ایک مدت مقرر کرتا ہے اور اس مقررہ مدت میں اس مخصوص کام کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ جہاں تک ممکن ہو اسے صرف حکومت کے کاروبار کی طرف ہی متوجہ ہونا چاہئے اور بیہودگیوں' عشق بازیوں اور بے کار باتوں میں اپنی بیش قیمت زندگی نہیں گنوانا چاہئے۔

(اس نصیحت کے سلسلے میں دو مثالیں دی گئی ہیں 1- امام محمد اسحاق (67) کی تاریخ ماثر صحابہ کی سند پر یہ کہا گیا ہے کہ صحابی ابو حذیفہ نے بازنطینی شہنشاہ کو حضرت عمر کی روزانہ زندگی کے بارے میں حسب ذیل بیان دیا)۔

"اول صبح میں امیرالمومنین مسجد نبوی میں فجر کی نماز میں صحابہ کی امامت کرتے ہیں اور قرآن کے ایک طویل سورہ کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں کہ سامعین کے ذہنوں میں اللہ کی ذات سے امید اور خوف دونوں جاگ جائیں۔ اس کے بعد سورج کے طلوع ہونے تک' جو کہ ان کی نماز اشتراق (گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر) ادا کرنے کا وقت ہے' وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اپنے ادا کرتے ہیں۔

"اس وقت تک لوگ ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ امیرالمومنین ان کے سامنے اپنی مسند اس طرح سنبھالتے ہیں کہ ان کی پشت مسجد کے در کی طرف رہتی ہے۔ وہ صحابہ کو طلب کرتے ہیں اور ان کے خلیفہ بننے سے پہلے انہیں جو تقدم حاصل تھا اس کے مطابق وہ اپنی نشستیں سنبھالتے ہیں اس کے بعد صحابہ کے صلاح و مشرہ سے کارروائی (حسب ذیل ترتیب سے) شروع ہوتی ہے۔

"امیرالمومنین تمام عالم اسلام سے آئی ہوئی واقعات کی روئداد اور صوبائی امراء کی عرض داشت پڑھتے ہیں۔ جو اشخاص ان کے تقریباً ہم رتبہ ہیں انہیں امیرالمومنین اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور ان کے احکامات ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ "از طرف

عبداللہ' خلیفتہ المومنین اور خادم المسلمین۔" عثمان بن عفان' جو رسولؐ اکرم کے ذوالنورین ہیں' امیرالمومنین کی طرف سے دوسرے تمام اشخاص کو لکھتے ہیں۔

"بعدازاں امیرالمومنین خراج' جزیہ اور مال غنیمت سے اگر کوئی رقم موضول ہوئی ہے تو اس کے بارے میں تفتیش کرتے ہیں۔ اکثر وہ اس رقم کو صحابہ کے مکانوں پر بھیج دیتے ہیں لیکن اہل بیت کرام اور بنی ہاشم میں رسولؐ اکرم کے اعزہ کو تقدم دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امیرالمومنین مدینہ کے لوگوں کے ان قانونی جھگڑوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ کی حقیقت کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرتے ہیں اور قانون خدا اور رسول کے مطابق فیصلہ سناتے ہیں اگر کسی مقدمہ کے حقائق صاف طور سے ثابت نہیں ہو پاتے تو وہ انہیں مزید چھان بین کے لئے روکے رکھتے ہیں۔

(بعدازاں وہ بیت المال اور لشکر کی طرف توجہ کرتے ہیں)

"بیت المال سے وہ ان لوگوں کے لئے رقم کی ادائیگی کے احکام دیتے ہیں جو اس کے مستحق ہیں۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی حالت کے بارے میں چھان بین کی جاتی ہے اور بیت المال کو ان کے چارہ اور دوسری ضرورتوں کے لئے احکام بھیجے جاتے ہیں۔ اگر کسی صوبہ میں فوجی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے تو امیرالمومنین فوجی دستوں کو مسلح کر کے بھیجتے ہیں۔ قبائلی شیوخ اور فوجی سپہ سالاروں سے اس لشکر کی حالت کے بارے میں استفسار کیا جاتا ہے جسے امیرالمومنین نے مدینہ کے گرد و پیش میں مقرر کیا ہے' اور مناسب احکام جاری کئے جاتے ہیں۔

"اگر امیرالمومنین کے سامنے کسی شخص کے اعمال بد کے بارے میں شکایت کی جاتی ہے تو ملزم اگر مدینہ ہی میں ہے تب اسے فوری طلب کیا جاتا ہے اور امیرالمومنین (کافی تحقیقات کے بعد) مجرم کو خواہ وہ امیرالمومنین کا بیٹا یا بھائی ہی ہو' ایسی سزا دیتے ہیں جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔ اگر ملزم مدینہ میں نہیں ہے تو امیرالمومنین مظلوم مدعی کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس ملزم کو طلب کرنے کے لئے کسی سخت قاصد کو روانہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد امیرالمومنین مدد کے لئے مستحق لوگوں اور لشکر کے ہم رکاب سپاہیوں کے اعزہ کے بارے میں دریافت حال کرتے ہیں۔ وہ بذات

خود اس بات کا معائنہ کرتے ہیں کہ آیا قبیلہ کی ضرورت پوری کی جا رہی ہے۔ انہوں نے صحابہ سے بھی گزارش کی ہے کہ وہ مستقل ایسے اشخاص کے بارے میں تحقیق کرتے رہیں جو مدد کے مستحق ہیں اور انہیں خلیفہ کے علم میں لاتے رہیں۔

زوال کے وقت لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

"اگر امیرالمومنین روزہ سے نہیں ہیں تو اپنے مکان چلے جاتے ہیں' اپنی نجی آمدنی سے سوکھی روٹی کھاتے ہیں اور مختصر سا قیلولہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسجد واپس آ جاتے ہیں اور اول وقت میں نہایت سکون اور اطمینان سے نماز ظہر ادا کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ روزہ سے ہوتے ہیں تو اپنے مکان نہیں جاتے بلکہ مسجد کے ایک گوشہ میں اینٹ پر سر رکھ کر ایک ٹاٹ کے ٹکڑے پر لیٹ جاتے ہیں' اور تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے ہیں۔ امیرالمومنین ہر روز دو اونٹوں کی قربانی کرتے ہیں اور ان کا گوشت پکواتے ہیں۔ بسااوقات وہ قبل ظہر اپنے سامنے کھانا رکھ کر مسافروں' غریبوں اور محتاجوں کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں وہ خود ہی ان کے سامنے کھانا چنتے ہیں اور کھانا شروع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد خود ہی ان کے ہاتھ دھلاتے ہیں۔

"بعد نماز ظہر امیرالمومنین دوبارہ حکومت کے کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حدود اللہ (68) اور شریعت کی خلاف ورزی کے خلاف بیشتر سزائیں اسی وقت.....دی جاتی ہیں کبھی کبھی نماز ظہر ادا کرنے کے بعد امیرالمومنین اپنے ہاتھ میں کوڑا لے کر پیدل ہی بازار کی طرف نکل جاتے ہیں ان کا رعب اور دبدبہ لوگوں میں سرایت کر گیا ہے اور دکان دار ان سے لرزتے ہیں۔ انہوں نے تمام تاجروں کو زائد قیمتوں پر فروخت کرنے' دھوکہ و فریب دینے' احتکار کرنے اور شرمناک طریقے اختیار کرنے کے خلاف تنبیہہ کی ہے اگر کہیں ایسے جرائم کا ثبوت ملا تو شریعت کے احکام کے مطابق غلطی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ اگر احتکار کا کوئی معاملہ ان کے سامنے آتا ہے تو وہ احتکار والی اشیاء کو ضبط کرنے اور فروخت کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اس سے حاصل ہونے والی رقم لشکر کے گھوڑوں اور اونٹوں کے لئے چارہ خریدنے کے کام میں لائی جاتی ہے۔ اگر زائد قیمتوں پر اشیاء فروخت ہوتی ہیں یا خرید و فروخت میں شرمناک فریب دہی ہوتی ہے تو وہ دکان داروں کو سخت سزا دیتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے درے

لگاتے ہیں۔

"نماز مغرب کے قریب امیرالمومنین گرم اور پسینہ سے شرابور مسجد واپس ہو کر دروازہ پر وضو کرتے ہیں اور نماز میں جماعت کی امامت کرتے ہیں۔ مغرب کی نماز ادا کر کے وہ نوافل اوابین (بیس مرتبہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر) ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ مسجد کے در کی طرف اپنی پشت کر کے بیٹھتے ہیں اور صحابہ ان کے گرد اپنی نشستیں سنبھالتے ہیں شب کے تیسرے پہر تک وہ رسول اکرم کے نیک اعمال' اوصاف' مشفقانہ برتاؤ اور ان مغازی کے بارے میں جن میں وہ شریک تھے' باتیں کرتے ہیں' صحابہ کرام رسولؐ اکرم سے اپنی جدائی پر روتے ہیں اور ان کے دل سے نکلے ہوئے آنسو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں۔ وہ کئی کئی بار رسولؐ اکرم کے روضہ پر حاضری دیتے ہیں اور ایسے مواقع پر رسولؐ اکرم کے لئے ان کے والہانہ لگاؤ کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی روحیں ان کے جسموں سے نکلنے والی ہوں۔

"امیرالمومنین جماعت کے ساتھ نماز عشاء ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے مکان جاتے ہیں اور اپنے خاندان کی ضرورتوں پر توجہ کرتے ہیں لیکن اگر ان کے مکان پر کوئی کام نہیں ہے اور اہل بیت کرام کے کسی فرد نے ان سے کوئی بھی کام کرنے کو نہیں کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں کوڑا لے کر اپن دو یا تین رفیقوں کو ان کے گھروں سے لے کر نصف چوتھائی یا چوتھائی شب چوکیداروں کی طرح مدینہ میں گشت کرتے ہیں۔ اس گشت کے دوران وہ یتیموں' بیواؤں' بیماروں' محتاجوں اور مظلوموں کی حالت دریافت کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو ضرورت مند محسوس کرتے ہیں تو اسی جگہ اس کے لئے امدادی رقم مقرر کر دیتے ہیں اور یہ ہدایت کرتے ہیں کہ اگلی صبح بیت المال سے اسے پیسہ بھیج دیا جائے۔ امیرالمومنین نے رسولؐ اکرم کے زیر سایہ تربیت پائی ہے اور وہ رسولؐ اکرم کے اوصاف سے منور ہیں۔"

(دوسری مثال خراسان کے ایک بادشاہ آرزو شاہ کے بارے میں ہے۔ وہ اس قدر سرکش تھا اور غلط مشورہ پر چلتا تھا کہ اس نے اپنی فوجیں جمع کیں اور گرمی کے اختتام پر جب کہ برسات قریب تھی ایک دشمن کے خلاف کوچ کر دیا۔ لیکن دشمن ہوشیار تھا لہذا وہ آرزو سے جنگ کرنے کے لئے اپنے دارالسلطنت سے باہر نہیں آیا۔ فورا" ہی

برسات (69) شروع ہو گئی بارش کی جھڑی لگ گئی اور ہر چھوٹا نالہ ندی بن گیا۔ آرزو کے سپاہی اس کے لشکر سے بھاگ نکلے اور خود دشمن کے قبضہ میں چلا گیا۔

نصیحت: 11

مرکز میں حق و صداقت کے قیام کے بارے میں

(1- نظریہ تناقص: منفیات کا اتفاق ناممکن ہے کیوں کہ دو منفی قوتوں میں سے کوئی بھی اپنی مخالف ضد کو قطعاً ناپید نہیں کر سکتی)۔

سلطان محمود نے کہا ہے: اے محمود کے فرزندو اور سلاطین عالم اسلام، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ چونکہ سلطان کی سرگرمیاں محض اپنی جسمانی خواہشات کی تسکین تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں امور حکومت بھی شامل ہیں لہٰذا وہ خدا کی صفات میں شرکت کا دعویدار ہوتا ہے۔ اس کی نجات اور روحانی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ اس طرح کے انتظامات رائج نہیں کرتا جس سے مرکز میں حق و صداقت قائم ہو۔ اور اس کی حکومت کی قوت سے رسولؐ اکرم کے دین کی بلندی ہو۔

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مرکز میں حق و صداقت کے قیام کا یہ مطلب نہیں کہ باطل قطعی طور پر معدوم ہو جائے اور دنیا میں صداقت ہی باقی رہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ خود قادر مطلق نے کہا ہے کہ "ہم نے ہر چیز کا جوڑ پیدا کیا ہے" یعنی تمام چیزوں کے (مخالف) جوڑے ہیں اور ایک چیز پیدا کرنے کے بعد اس کی ضد پیدا کر دی گئی ہے۔ صداقت کی ضد میں انہوں نے باطل پیدا کر دیا ہے اور امن کی ضد میں بدامنی، نیکی کے رموز میں بدی پیدا کی گئی ہے۔ خدا کے زہد اور خشیت الٰہی کی ضد معصیت ہے اور اطاعت کی ضد نافرمانی ہے۔ اسی طرح رات و دن، نور و ظلمت، زمین و آسمان، دین داری و بے دینی، خدا پرستی اور اصنام پرستی مخالف جوڑوں میں اور ایک دوسرے کے پرتو تخلیق کئے ہیں۔

مندرجہ بالا بات کا مقصد اس طرح ہے۔ مرکز میں صداقت کے قیام کا یہ مطلب نہیں کہ باطل کو بالکل ناپید کر دیا جائے۔ اگر تمام انبیاء اور مسلم سلاطین متحد ہو کر اس دنیا سے، جس میں کفر، بدامنی، گناہ اور بدکاری شامل ہیں، باطل کا خاتمہ کرنے کی

کوشش کریں تاکہ صرف "صداقت" قائم ہو سکے۔ جس کا مطلب اسلام' امن اور اطاعت کا قیام ہے اور نیکی غالب آ سکے تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ یہ تو دائرہ امکان ہی میں نہیں کہ اس زمین پر نیکی ہی نیکی ہو اور کوئی بدی نہ ہو' صرف امن ہو اور بدامنی نہ ہو' صرف اسلام اور خدا پرستی ہو اور کفراور اصنام پرستی نہ ہو' باطل کے وجود ہی میں صداقت منعکس ہوتی ہے' نیکی کا پرتو بدی کے وجود میں نظر آتا ہے۔ اسلام کفر کے وجود سے نمایاں ہوتا ہے اور خدا پرستی اصنام پرستی کے وجود سے نمایاں ہوتی ہے' پس یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صداقت ہے اور یہ باطل' یہ نیکی ہے اور یہ بدی' یہ اسلام ہے اور یہ کفر' یہ خدا پرستی ہے اور یہ اصنام پرستی' تمام چیزیں اپنی ضدوں کی وجہ سے شناخت ہو جاتی ہیں۔

نیز اگر "باطل" میں جس کی علامات شرپسندی' کفر' اصنام پرستی' بدامنی اور گناہ ہیں' کوئی ایسی دانش مندی نہیں ہوتی جسے ہم نہ سمجھ سکتے تو خدا نے اسے پیدا نہ کیا ہوتا۔ جہنم بھی' جس کا پیٹ باطل لوگ ہی بھریں گے' (70) نہ پیدا کی جاتی کیوں کہ قادر مطلق نے کہا ہے کہ "ہم جہنم کو جنوں اور آدمیوں سے بھریں گے۔"

یہ تو انسانی تصور سے باہر ہے کہ حسب ذیل چیزیں قطعاً" خارج کر دی جائیں اور دنیا سے مفقود ہو جائیں جیسے کفر' اصنام پرستی' بدکاری' شر' باطل' سیاہ کاری' دروغ گوئی' جعلی سکے چلانا' نشہ' زنا' اغلام بازی' غصہ' معصوم لوگوں کو پھانسنا' ناانصافی' ظلم' دوسروں پر غیر قانونی طور پر قابو پانا' غبن' سرکشی' بدامنی' عدل کی حدود سے تجاوز' عداوت' بغاوت' نافرمانی' بے ایمانی' دھوکہ فریب' غلط بیانی' والدین کے حقوق مارنا' نافرماں برداری' جھوٹے الزامات تراشنا' بہتان لگانا' بدکلامی' بدگوئی' تہمت' ناپرہیزگاری' حسد' بدنیتی' خودداری کی کمی' بے شرمی' غداری' چوری' بغاوت انگیز رویہ' شاہراہ پر ڈاکہ زنی' سود خوری' احتکار' احسان فراموشی' حقوق تسلیم نہ کرنا' اشیاء میں ملاوٹ' غیر قانونی اور ناپسندیدہ کاموں کا ارتکاب یا کہ کافر' اصنام پرست اور بدمذہب' بددین اور بدعقیدہ' بدعتی اور رسولؐ اکرم کی شریعت کی نافرمانی کرنے والے باغی اور شرپسند بالکل نیست و نابود کر دیئے جائیں تاکہ تمام ریاستیں ایک سلطنت میں متحد ہو جائیں اور تمام باطل مذاہب تہ و بالا کر دیئے جائیں۔

انبیاء کی ہدایت اور تعلیم یا مسلم سلاطین کے اثر' طاقت اور دبدبہ سے بدی کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

اس کا جواز یہ ہے کہ انسان کی فطرت متضاد خوبیوں سے بنائی گئی ہے اس کے اندر اچھائیاں بھی ہیں اور گھٹیا پن بھی۔ روز ازل ہی میں قلم الٰہی نے اصل اعمال نامہ میں اسلام یا کفر پر چلنے والوں کے حصہ میں نیکی یا بدکاری' ہدایت یا گمراہی' اطاعت یا گناہ گاری لکھ دی۔ لہٰذا گناہوں اور بدیوں کا مکمل اخراج ناممکن باتوں میں ہے اور اس کا حصول ممکن نہیں۔ اسے محض حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ مرکز میں صداقت کے قیام' کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ صداقت باطل پر حاوی ہو جائے اور باطل صداقت پر حاوی نہ ہونے پائے تاکہ اصنام پرستی اور کفر کو ذلیل و رسوا کر کے صداقت اور اسلام کی بلندی و عظمت کا اعلان ہو جائے۔

اب پیش نظر جو بات ہے وہ یہ کہ جب کبھی سلطان نیک ارادوں اور مصمم حوصلہ اور ضروری انتظامات کے ساتھ بمعہ اپنے تمام حامیوں اور پیروؤں اور اپنی حکومت کے دبدبہ' طاقت و اثر اور اس احساس کے ساتھ کہ اس کے دین اور اس کی ریاست کا اولین مقصد رسولؐ اکرم کے دین کا اقبال ہے' انتہائی جدوجہد کرتا ہے تو حسب ذیل مقاصد تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ دارالسلطنت اور صوبوں میں نیک کام کرنے کے احکام اور برے کام کی ممانعتوں کی اطاعت کی عادت نمایاں ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اسلام کی روایات وقتاً" فوقتاً" بلند و بالا ہوتی رہتی ہیں۔ نیکی اور صداقت شعاری بڑھ جاتی ہیں اور نوبت کی چوٹ پر اخلاص و اطاعت ظاہر ہو جاتی ہیں' گناہ اور ناپرہیز گاریاں' معصیتیں اور بدکاریاں دب جاتی ہیں اور چوری چھپے رہتی ہیں۔ عدل و مہربانی کا ہر سو چرچا ہوتا ہے اور جبر و ظلم بظاہر غائب ہو جاتے ہیں اور راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ سنت و جماعت کے علوم لوگوں کے قلوب کو عزیز محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کے ذہن بدعتوں' بدعتوں کے علم اور بدعتی تصانیف سے ہٹ جاتے ہیں۔ دیندار لوگ اور دین کے محافظ درجہ امتیاز اور اعلیٰ منصب حاصل کرتے ہیں جب کہ بد ارادوں' بدعقائد' بد مذاہب' بدعتوں کے بانی اور ایمان کے دشمن لوگ ذلیل' محتاج' قابل نفریں اور ہیچ ہو جاتے ہیں۔ دین کے نیک کام رائج ہوتے ہیں اور شریعت پر

عقیدہ نہ رکھنے والے ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ وہ چیزیں جنہیں دین نے ناپسند کیا ہے اور ممنوع قرار دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔ خدا اور نبی کی محبت ملت اسلام کے دل میں مضبوط ہو جاتی ہے اور اس دنیا کی محبت' جو راہ صدق میں پریشانی کا ایک ذریعہ اور شر اور بدی کی طرف راے غب کرنے کا باعث ہے' ہر ایک کے دل میں کم ہو جاتی ہے۔ دوسری دنیا کی تمنا لوگوں کے دل میں بڑھ جاتی ہے اور دنیاوی خواہشات سے تنفر اور ان سے توبہ کی ترغیب ہوتی ہے۔ انسان کی فطری خوبیاں اس کے برے رجحانات پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ صداقت حسین اور حسن سے آراستہ ہو جاتی ہے اور راست گو عزت پاتے ہیں اور جھوٹے ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ سادات' علمائے دین' مشائخ' متقی پرہیز گار' تارک الدنیا' زاہد' گوشہ نشین انسانوں کے دل و دماغ میں برتری' احترام اور امتیاز حاصل کرتے ہیں جب کہ جاہل' شرپسند' بے ایمان' بے شرم اور اپنی عبادات میں سستی دکھانے والے ذلیل' حقیر اور ہیچ ہوتے ہیں۔ جہاد اور معرکوں میں پاک ارادہ عیاں ہوتا ہے اور مجاہدوں اور فاتحوں کے قلوب میں شہادت کا جذبہ روشن ہوتا ہے۔ صداقت اور راست بازی تبسم بکھیرتی ہیں جب کہ بے ایمانی اور فریب اشک بار ہوتے ہیں۔ سچے اور نیک لوگ دین و دنیا کے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں جب کہ ظالم اور بددماغ یا تو کچل دیئے جاتے ہیں یا تبدیلی خصلت سے وہ سچے اور نیک ہو جاتے ہیں۔ دولت مند خدا کے عائد کئے ہوئے فرائض ادا کرتے ہیں اور انعام و خیرات دینے اور مخیر اداروں کی تعمیر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا کہ وہ تباہ ہو جائیں بلکہ انہیں بھوک اور برہنگی سے بچایا جاتا ہے۔ معیشت کے ایماندارانہ اور جائز ذرائع کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ ذرائع معاش جو ممنوع اور ناپسند کئے جا چکے ہیں یا جن کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہے کم ہوتے ہیں اور گوشہ نشین ہو جاتے ہیں تاکہ جس وقت انہیں غلط تشریحات اور بے ایمانی سے حق بجانب ثابت کیا جا رہا ہو۔ تو انہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ عیاری اور مکاری باعث ذلت ہوتی ہے۔ نیک اور مخیر کام قابل قدر قرار دیئے جاتے ہیں اور برے اور غلط کام زیر زمین جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ خرید و فروخت کے معاملات میں حق و انصاف ظاہر ہوتا ہے اور دلالوں کی کاوشوں کی وجہ سے زائد قیمتوں پر فروخت اور احتکار مفقود ہو

جاتے ہیں۔ دکان دار دھوکہ فریب نہیں کرتے اور غلط خرید و فروخت کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں کیوں کہ نہ تو وہ مختلف حیلوں سے معصوم لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اشیاء میں ملاوٹ کر سکتے ہیں۔ خریدار اور فروخت کرنے والے دونوں دلالوں اور سرکاری افسروں کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں جبکہ دلال بذات خود بھی انصاف کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ گناہ اور بدکاری کے پیشوں کو لوگ اتنا ہی غلط سمجھنے لگتے ہیں۔ جتنا کہ کفر کو اور ان کا خاتمہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مطیع اور فرماں بردار بے فکر ہو کر اپنے بستروں پر ٹانگیں پھیلاتے ہیں اور پھر چین کی نیند لیتے ہیں جب کہ باغی اور سرکش سلطان کی شمشیر کے خوف سے دن رات لرزتے ہیں۔ امن اور تحفظ عام ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے پریشانیاں اور رنجشیں دور ہو جاتی ہیں۔ طاقت ور کمزور کو نہیں دباتے اور ظلم کے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ راہزنوں کے ہاتھ بطور سزا کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ خدا سے خائف اور دیانت دار افسروں کی ترقی ہوتی ہے جب کہ دغاباز اور فریبی برطرف کئے جاتے ہیں اور غیر دیانت دار افسروں کو ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ آبائی آزاد شہریوں اور عالی نسب لوگوں کو عہدے دیئے جاتے ہیں اور ادنیٰ اور کمتر لوگوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مکاری' حسد' بدگوئی اور بدنیتی انسانوں کے ذہنوں سے کھرچ دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ خلوص اور نیک نیتی لے لیتی ہے۔ مسجدیں' خانقاہیں اور ضیافت خانے (71) بھرے رہتے ہیں۔ بیٹے اپنے والدین کے فرماں بردار ہو جاتے ہیں اور مربیوں کے حقوق دوبارہ محبت سے ادا کئے جاتے ہیں۔ انسانوں کی گفتگو میں صداقت' باندیوں میں صحیح رویہ اور غلاموں میں وفاداری ظاہر ہوتی ہے۔ غریبوں اور حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ بیوائیں اور یتیم تنگی کا شکار نہیں ہوتے۔ مسافر بھوکے نہیں سوتے اور بے خانماں اور آواراؤں کو گھر واپس جانے کے لئے پیسہ دیا جاتا ہے۔ خواص و عوام کی گفتگو میں خدا کی عنایات کے لئے شکرانہ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور احسان فراموشی کم ہوتی ہے۔ معاہدوں پر پکا بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور وعدے پورے ہوتے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں بغاوت کا تصور تک نہیں آتا۔ قوانین شریعت اور سلاطین کی طرف سے ملنے والی سزاؤں کے باعث وہ تمام چیزیں جو غیر منصفانہ "ممنوع' ناپسندیدہ اور امتناعی ہیں انسانوں کو بری لگنے لگتی ہیں اور آخر میں دین کا احترام گناہوں اور شر کے

کھلم کھلا دستور کو دور کر دیتا ہے۔

مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کے بعد مرکز میں صداقت قائم ہو جاتی ہے۔

(2- بری ہندو مذہب کے خلاف کھل کر مقابلہ کرنے کی وکالت کرتا ہے۔

مسلم سلطان توحید اور اسلام کی بلندی اور برتری اس وقت تک قائم نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام حوصلہ کو یکجا کر کے کفر کو مٹانے اور اس کے قائدوں کو' جو کہ ہندوستان میں برہمن کہلاتے ہیں' قتل کرنے کے لئے سخت جدوجہد نہیں کرتا' اسے کافروں کو بے قابو کرنے' ان پر قبضہ کرنے' انہیں غلام بنانے اور ان کا درجہ گرانے کے لئے مضبوط ارادہ کرنا چاہئے۔ سلطان اور اسلام کے مجاہدوں کی تمام طاقت اور قوت مذہبی معرکوں اور جہاد پر مرکوز ہونا چاہئے اور انہیں مہم میں اپنی جانوں کی بازی لگا دینی چاہئے تاکہ دین حق باطل عقیدوں کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہو گا جیسے باطل عقاید کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ کیونٗ کہ ان کا تمام سحر ٹوٹ چکا ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مسلم سلطان' باوجود اس قدرت اور منصب کے جو خدا نے اسے عطا فرمائے ہیں' ہندوؤں سے محض جزیہ اور خراج وصول کرنے پر اکتفا کرتا ہے اور کافروں اور کفر دونوں کو برقرار رکھتا ہے اور انہیں ختم کرنے میں اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنے سے گریز کرتا ہے تو اس صورت میں سلاطین اسلام اور رائیان کفار کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا؟ کیوں کہ کافر رائیان بھی ہندوؤں سے جو انہیں کے باطل عقیدہ سے وابستہ ہیں' جزیہ اور خراج وصول کرتے ہیں اور اس طرح پیسہ حاصل کر کے اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ درحقیقت وہ محصول سو گنا زیادہ ہی وصول کرتے ہیں۔ (72)

نیز یہ کہ اپنی شاہی طاقت اور اثر کے باوجود اگر سلاطین اسلام خراج اور جزیہ کے عوض میں کفار اور کفر برقرار رکھنے پر اکتفا کرتے ہیں تو اس دنیا میں رسولؐ اکرم کی حسب ذیل روایت کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ "مجھے تمام لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ "لا الہ الا اللہ" کی تصدیق نہ کر دیں۔ لیکن جب وہ اس کی تصدیق کر دیتے ہیں تو قانون اسلام کے تحت (جیسا کہ مسلمانوں میں ہے) ان کے مال و جائیداد اور زندگیاں مجھ سے محفوظ ہیں۔"

ایک سو چوبیس ہزار انبیاء بھیجنے میں مشیت الٰہی یہ تھی کہ وہ کفار اور کفر کو مٹائیں اور یہی قدیم اور حالیہ سلاطین کا مقصد رہا ہے۔ لیکن ہمارے رسولؐ اکرم خاتم الانبیاء ہیں لہٰذا اب انبیاء کی تعلیمات کے ذریعہ کفر کا حساب چکانا کس طرح ممکن نہیں ہے چنانچہ کفار و مشرکین کا خاتمہ اب اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ سلطان تمام ضروری انتظامات کے ساتھ اپنے حوصلہ اور عزم کو اس ایک مقصد پر مرکوز کرے تاکہ اسے دین حق کی بلندی و برتری قائم کرنے سے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ لیکن اگر سلطان ہندوؤں سے، جو اصنام پرست اور گائے کے گوبر کی پرستش کرنے والے ہیں۔ محض جزیہ اور خراج لینے پر اکتفا کرتا ہے اور ہندو پرسکون ہو کر رسوم کفر برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں تو واقعی کفر کا حساب کبھی نہیں چکے گا۔ مرکز میں صداقت قائم نہیں ہو گی۔ اور کلام الٰہی کا احترام نہیں ہو گا (ایک اور پیراگراف جس میں ان باتوں کو ایسے ہی الفاظ میں دہرایا گیا ہے یہاں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔)

تاہم یہ ممکن ہے کہ سلاطین اپنی مصمم کوششوں سے پہلے اپنی حکومتوں کو منظم کریں اور اس کے بعد اپنے بلند عزم سے اپنی طاقت و وقار اور اثر کو خطرہ میں ڈال دیں تاکہ دین حق باطل عقائد کو شکست دے کر حاوی ہو جائے۔ اسلامی روایات بلند ہوں اور پروردگار عالم نے جو بھی خاکہ مرتب کیا ہے وہ مرکز میں صداقت کے قیام کے ذریعہ منتقل ہو جائے۔ لیکن سلاطین کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مرکز میں صداقت کے قیام کا کیا مطلب ہے تاکہ وہ اپنی زندگیاں اس کی خاطر جدوجہد کے لئے وقف کر دیں، اسے اہم ترین مقصد تصور کریں جس کے حصول کے لئے انہیں اپنی جان کی اور اپنے حامیوں کی بازی لگانے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس مہم میں جو کہ انبیاء خلفاء، اولیاء، صدیقین اور ساتھ ہی امت اسلام کے قدیم اور حالیہ سلاطین کا مقصد رہی ہے، اپنی کوششوں کے صلہ میں سلاطین اس دنیا میں اپنے نیک کاموں کے لئے شہرت پائیں گے جو روز محشر تک قائم رہے گی اور آخرت میں ان کا درجہ انبیاء، صدیقین، اولیاء اور مقربین کے درمیان ہو گا اور انہیں اس یقینی فیضان الٰہی میں حصہ ملے گا "جسے کانوں نے سنا نہیں ہے اور آنکھوں نے دیکھا نہیں ہے۔" روحانی انعامات کے اضافوں سے، جن کے سلطان حقدار ہیں، بہشت میں۔ ایسے حکمراں مختلف اچھی چیزوں سے فیضیاب

ہوں گے جب کہ اس سرزمین کے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت زندہ رہے گی اور ان کے اچھے کام پشتہا پشت تک دوہرائے جاتے رہیں گے مسلم سلاطین کی دینی تکمیل اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ مرکز میں صداقت قائم کرنے کے لئے اپنی جانوں اور اپنے طاقت و اقتدار کی بازی لگا دیں اور دن رات جدوجہد کریں' فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام کو معلوم ہونا چاہئے کہ سنی عقیدہ میں صداقت کے قیام کو شاندار علم اور ساتھ شاندار کام بھی تصور کیا جاتا ہے۔ انبیاء کے مقصد حیات کو مستثنٰی کر کے یہ تمام اچھے کاموں سے اعلیٰ تر کام ہے۔

فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ تم خدا اور رسولؐ اکرم کے سامنے شرمندہ نہ ہو اور تمہارے اعمال نامہ سے جو کچھ تم نے کہا اور کیا ہے جو کچھ تم نے پہنا اور کھایا ہے اس کے متعلق بری باتوں کے بجائے اچھی باتیں لکھی جائیں تو تمہیں اپنے شاہی عزم کے ساتھ کفار و مشرکین اور بدعقیدہ اور بدمذہبوں کی بیخ کنی کرنی چاہئے اور انہیں ذلیل و رسوا کرنا چاہئے تمہیں خدا اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھنا چاہئے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنے طاقت و اقتدار کی بازی لگا دینی چاہئے تاکہ تمہیں خدا اور رسولؐ اکرم حضرت محمدؐ اور تمام انبیاء اور اولیاء کی رضا و خوشنودی حاصل ہو جائے۔ تمہیں کفار سے محض جزیہ اور خراج وصول کرنے پر اکتفا نہیں کر لینا چاہئے اور اپنے طاقت و اقتدار کے ہوتے ہوئے کفر کو محفوظ نہیں چھوڑنا چاہئے' تمہیں دن رات کفر کو زیر کرنے کی سعی کرنی چاہئے تاکہ (روز محشر میں) تمہیں (قبروں سے) اٹھا کر انبیاء کے درمیان کھڑا کیا جائے اور تم ابد تک دیدار الٰہی سے فیضیاب ہوتے رہو اور تمہیں "خدا کے قریب ہی صدیقین کے درمیان جگہ ملے۔"

قدیم اور جدید ہر دو عصر کے (اسلامی علماء دین اور عاقلوں کو یقین تھا کہ اگر مسلم سلاطین اپنی طاقت اور قوت اور اس راستے پر گامزن اپنے تمام حامیوں کی طاقت کے ساتھ جدوجہد کریں گے تو حسب ذیل مقاصد کی تکمیل ہو جائے گی۔ دین حق باطل عقاید پر پوری طرح حاوی ہو جائے گا۔ کلام الٰہی کا احترام ہو گا۔ کفر و شرک کی روایات کمزور پڑیں گی مسلمانوں پر عنایت ہو گی اور انہیں عزت ملے گی۔ کفار اور بددین محتاج اور ذلیل ہوں گے۔ غیر قانونی ریاست اور مخالف عقائد کے احکامات ختم کر دیئے جائیں

گے۔ بہتر فرقوں پر قوانین شریعت نافذ ہوں گے۔ اور خدا اور رسولؐ کے دشمن مطعون ہوں گے۔ انہیں دور رکھا جائے گا' ان سے قطع تعلق کر لیا جائے گا اور ان پر رعب رکھا جائے گا۔

(3۔ برنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین بے تعصب ہیں : (الف) ہندو خوشحال ہیں' (ب) مسلمانوں کو گناہ آلود پیشوں کی چھوٹ ہے اور (ج) فلسفیوں کو تعلیم دینے کی اجازت ہے۔)

لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مرکز میں صداقت قائم نہیں ہو سکتی۔ کلام الٰہی کی برتری و بلندی ممکن نہیں ہے اور دین حق بد عقائد پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا کیوں کہ اس سرزمین پر اسلام کے حاصل کئے ہوئے طاقت و اقتدار اور اپنے آبائی دین اسلام کی سات صدیاں گزر جانے کے باوجود سلاطین اسلام اپنے دارالسلطنت اور مسلم شہروں میں رسوم کفر کے رواج کو پروان چ ے ڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہاں بتوں کی علانیہ پرستش ہوتی ہے اور لوگ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے کفر کی روایات کے پابند ہو رہے ہیں۔ کفار کھل کر اور بے خوف ہو کر اپنے باطل عقیدہ کے اصولوں کی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے بتوں کو سجاتے سنوارتے ہیں اور تیوہاروں میں ڈھول تاشے بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ وہ (کفار) صرف کچھ ٹیکے اور جزیہ ادا کر کے اپنے باطل دین کی کتابوں کی تعلیم دے کر اور ان کتابوں کے احکامات نافذ کر کے کفر کی روایات کو جاری رکھتے ہیں (ان حالات میں اسلام کی روایات کس طرح بلند کی جا سکتی ہیں یا نیکی کے نفوذ اور بدی کی ممانعت کے احکامات کس طرح موثر ہو سکتے ہیں؟

لیکن (ہندوستان کے) مسلم سلاطین کے قلوب کافروں کو ختم کرنے اور بت پرستوں اور مشرکوں کو مار گرانے کے جذبہ سے خالی ہیں۔ اس کے برخلاف اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کفار اور مشرکین خراج ادا کرتے ہیں اور ذمی ہیں ان کفار کا احترام ہوتا ہے' انہیں ممتاز کیا جاتا ہے' ان پر عنایت ہوتی ہے اور انہیں برتر کیا جاتا ہے۔ سلاطین انہیں نقارے' علم' زیورات' زر بفت و کمخواب کے چوغے اور ساز سے آراستہ گھوڑے عطا کرتے ہیں اور انہیں صوبہ داریاں' اعلیٰ رتبہ اور عہدے دیئے

جاتے ہیں۔ اور اپنے دارالسلطنت (دہلی) میں جس کی حیثیت کی وجہ سے دوسرے مسلم شہروں کی حیثیت بڑھتی ہے، مسلم سلاطین صرف اسے روا ہی نہیں رکھتے بلکہ انہیں اس وقت بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے جب کفار و مشرکین، بت پرست اور گائے کے گوبر (سرگین) کے پجاری محلوں کی مانند بلند مکان تعمیر کرتے ہیں۔ زر بفت کی پوشاک پہنتے ہیں اور سونے چاندی کے ساز سے آراستہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں۔ انہیں ہزارہا طاقت کے ذرائع میسر ہیں، وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنی خدمت میں رکھتے ہیں اور انہیں اپنے گھوڑوں کے سامنے دوڑاتے ہیں۔ غریب مسلمان ان کے در پر ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اور اسلام کی سلطنت میں جس کی وجہ سے اسلام کی عمارت بلند و ممتاز ہوتی ہے، وہ رائے، رانا، ٹھاکر، سہا، مہتا اور پنڈت کہلاتے ہیں۔

ان حالات میں دین حق باطل عقاید پر کس طرح فتح حاصل کر سکتا ہے یا مرکز میں صداقت کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

نیز دین کا تحفظ کرنے اور رسولؐ اکرم کی شریعت مطہرہ کے احکامات کے نفاذ کا جذبہ اگر عالم اسلام کے سلاطین کی سرحدوں کو گرفت میں نہیں لیتا ہے تو وہ مسلمانوں کو ناپاک اور گناہ آلود تجارتیں اور پیشے کرنے اور ہر بازار اور کوچے میں شراب کی دکانیں، قحبہ خانے اور جوئے کے اڈے کھولنے اور موسیقی کی شاندار محفلیں منعقد کرنے کی چھوٹ دے دیں گے۔ لیکن سلطان ان گروہوں پر محصول لگانے پر اکتفا کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر گنہگار اور عام فسق و فجور قائم کرنے والے بے خوف و خطر ہر کوچے اور بازار اور شہر کے علاقے میں اپنے دھندے میں مصروف رہتے ہیں، نیک کام کرنے کا حکم اور بدی کی ممانعت کا اصول، جو کہ دین اسلام کی روح ہے اور مسلم سلاطین کا فرض ہے۔ ایسی چیزوں کی کس طرح اجازت دے سکتا ہے؟ اور کس طرح (اگر ان چیزوں کی اجازت ہو تو) اسلام کا وقار بلند ہو سکتا ہے اور مرکز میں صداقت قائم ہو سکتی ہے؟

اس کے علاوہ اگر سلطان اسے پسند کریں گے اور اس کی اجازت بھی دیں گے تو فلسفی اور دوسرے بددین، جو کہ دین حق کے مخالف اور رسولؐ اکرم کے دشمن ہیں،

کھلم کھلا اپنی کتابوں کی تعلیم دینے لگیں گے۔ وہ یونانی علوم کو' جو کہ قدیمی اور آخری انبیاء کے روایتی احکامات کے دشمن ہیں' علم معقولات کا نام دیتے ہیں اور علوم شریعت کو علم منقولات کہتے ہیں۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا ابدی ہے اور اس کے ابدی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کو تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ انہیں قیامت' انسانوں کے (اپنی قبروں سے) اٹھنے' روز محشر اور جنت و دوزخ پر عقیدہ نہیں ہے حالاں کہ ان پر عقیدہ ایمان کی بنیاد ہے اور انبیاء کرام کی ایک سو ساٹھ مقدس کتابوں میں اسے بہت وثوق کے ساتھ جتایا گیا ہے۔ وہ صرف (اپنے نظریات کی) تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان چیزوں کے انکار میں استدلالی کتابیں بھی تصنیف کرتے ہیں۔ اب اگر ایسے لوگوں کو سلطان کے دارالسلطنت میں عزت و وقار سے رہنے اور اپنے نظریات کی.....اشاعت کرنے اور منقولات پر معقولات کو ترجیح دینے کی اجازت دی جائے گی تو دین حق باطل عقاید پر کس طرح فتح پا سکتا ہے یا اسلام کی روایات بلند کی جا سکتی ہیں یا مرکز میں صداقت قائم کی جا سکتی ہے یا نیک کام کے حکم کا اثر اور ناجائز کام کی ممانعت قائم کی جا سکتی ہے؟

(4- برنی اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ تعلیم کمتر طبقوں کے لئے ممنوع ہونا چاہئے کیوں کہ تعلیم انہیں قابل اور لائق بنا دے گی)

(اس نصیحت کے سلسلہ میں برنی ماثر خلفاء کی سند پر ایک تذکرہ بطور مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں جو بھی کہا گیا ہے وہ تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ یہ برنی کے ذاتی نظریہ کو ہی ظاہر کرتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دو بیٹوں محمد امین اور مامون میں جانشینی کی جنگ کے دوران بغداد کا نظم و نسق ڈھیلا پڑ گیا اور نتیجہ میں دو برائیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی برائی یہ کہ گناہ اور فسق و فجور عام ہو گئے۔ طرب دار شروع کئے گئے' شراب' جوئے اور رنڈی بازی کے پیشے فروغ پانے لگے۔ دوسری برائی یہ پیدا ہوئی کہ فلسفی منظر عام پر آ گئے۔ بہت سے فلسفی علماء دین کے بھیس میں بغداد آئے اور شہر میں اپنی حیثیت قائم کر لی۔ انہوں نے مسجدوں میں کھلم کھلا مسلمانوں کو اپنے غلط نظریات اور باطل عقاید کے درس دیئے' باطل دین کی کتابیں شائع کیں اور اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا کر انہیں گمراہ کیا کہ کوئی بھی چیز اس وقت تک ممکن نہیں

جب تک کہ وہ عقل کے میزان پر ثابت نہیں ہو جاتی۔ غیر دنیاوی علماء دین جیسے امام احمد بن حنبل' امام یحیٰی معین' عبداللہ مبارک اور دوسرے متقی اور دین دار لوگ شہر بغداد میں ممنوعہ چیزوں کو پھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکے...... (73) انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی' آنے جانے والے لوگوں پر اپنے دروازے بند کر دیئے' نماز جمعہ اور عیدین کی جماعتوں میں حاضری بند کر دی اور اپنے ہمسر لوگوں سے ترک تعلق کر لیا)

جب ماموں اپنے بھائی کی شکست کے بعد بغداد میں داخل ہوا تو اس نے ایک محضر طلب کیا اور اپنے ہاتھ سے ایک منشور لکھا۔ برنی اس منشور کی عبارت نقل کرتا ہے جو کہ من گھڑت ہے۔ اس منسوب منشور میں ہر طبقہ کو دیئے جانے والے انعامات اور سزاؤں کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔ ایک ایسے منشور کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سا ہے جس کا وجود ہی نہیں تھا لیکن حسب ذیل پیراگراف خاصا دلچسپ ہے کیوں کہ یہ مسلم مزدور طبقہ کی طرف برنی کے رویہ کو افشا کرتا ہے)

"ہر طرح کے اساتذہ کو یہ سختی سے حکم ہوتا ہے کہ وہ کتوں کے حلق میں قیمتی پتھر نہ ٹھونسیں یا خنزیروں اور ریچھوں کے گلوں میں سونے کے گلوبند نہ پہنائیں' یعنی لحمینوں' رذیلوں اور نکموں کو' دکان داروں اور کم اصلوں کو نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کے ارکان اور قرآن کے ان کچھ پاروں اور کچھ دینی عقاید سے زیادہ کی تعلیم نہ دیں جن کے بغیر ان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور ان کی عبادات کا درست ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انہیں کچھ بھی نہ پڑھائیں کہ کہیں ان کمین نفوس کو عزت نہ مل جائے۔ دین و دولت کے امور میں جو بد نظمی پھیلی ہے اس کی وجہ ان کم اصل لوگوں کے افعال و اقوال ہیں جو ہنرمند ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ اپنے ہنر کی وجہ سے وہ والی' عامل' متصرف' فرمان دہ اور فرمان روا بن جاتے ہیں۔ اگر اساتذہ نے نافرمانی کی اور تحقیق کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے کم اصلوں کو علم دیا ہے یا علم ادب یا تحریر کی تعلیم دی ہے تو انہیں اس نافرمانی کی پاداش میں سزا دینا ناگزیر ہو گا۔

امام شافعی اور مامون رشید پر نوٹ

4: غیر مسلموں کے بارے میں امام شافعی کا نظریہ۔ قرآن میں اس بات کی طرف

اشارہ ہی نہیں ملتا بلکہ اس کی توثیق بھی کی گئی ہے کہ تمام عوام میں وقتاً" فوقتاً" انبیاء بھیجے گئے اور روایت کے مطابق ان انبیاء کی تعداد 124,000 بتائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود مسلم فقہا نے (الف) اہل کتاب یا قرآن میں جن مقدس کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان کے پیروؤں اور (ب) غیر مسلموں میں فرق کیا ہے۔ برنی کا درخشاں خیال یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر پرامن سلوک کی اجازت دی ہے جن کے پاس کوئی ایسی مقدس کتاب نہیں ہے۔ جس کا قرآن میں ذکر ہو۔ لیکن دوسرے مذہبی رہنماؤں نے ان کے ساتھ دائمی جنگ تجویز کی ہے۔ چنانچہ تاریخ فیروز شاہی میں (ص 291- وہ قاضی مغیث کی زبان سے حزب ذیل بیان ادا کرواتا ہے" امام اعظم ابو حنیفہ کے علاوہ جن کے مسلک پر ہم ہیں' دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے حق میں کوئی روایت نہیں ہے۔ دوسرے علمائے دین کے مطابق ہندوؤں کے سلسلہ میں "اسلام یا تلوار" کا حکم ہے۔"

یہاں حقیقتاً اشارہ امام شافعی کی طرف ہے جن کی اس موضوع پر تعلیمات کو برنی بہت غلط بیانی سے پیش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی اسلام کرہ زمین کے ایک مختصر حصہ ہی میں محدود تھا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ اگر مسلمانوں کے تمام مشرکین کے خلاف تلوار اٹھائی' تو آخرالذکر بھی ایسا ہی کریں گے اور کوئی بھی شخص اس طرح دور دراز تک پھیلے ہوئے اور ختم نہ ہونے والے تصادم کے نتیجہ کی پیش بینی نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ امام شافعی نے حقیقتاً کیا اصول قائم کیے۔ امام شافعی کی اصل تخلیقات اختلاف الحدیث اور رسالات ہیں۔ اول الذکر پہلی جنگ عظیم کے بعد مصر میں طبع ہوئی۔ ان کتابوں کا برنی کے زمانہ میں ہندوستان میں حاصل کرنا مشکل تھا۔ البتہ مشہور شافعی محدث اور دینیات کے منصف ابوبکر احمد بیہقی (انتقال 1067ء کی تصانیف اس وقت ہندوستان میں دستیاب تھیں۔ اپنی احکام القرآن میں (طباعت قاہرہ' 1952ء) جو کہ فاضل شافعی محمد بن ادریس کی' جن کا انتقال 203ھ میں ہوا ایک تصنیف کی دوسری اشاعت ہے' بیہقی لکھتے ہیں۔

1- "شافعی نے فرمایا ہے: "خدا نے حکم دیا ہے: ان کے خلاف جنگ کرو جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جو اسے منع نہیں کرتے جسے اللہ اور اس

کے رسولؐ سے منع فرمایا ہے اور جو اہل کتاب دین حق میں شامل نہیں ہوتے ہیں ان سے اس وقت تک (جنگ کرو) جب تک کہ وہ جزیہ نہ دے دیں اور وہ مغلوب نہ ہو جائیں (ص 51)'....اور اس (معاملہ میں) عرب اور غیر عرب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔" (ص 53)

2- لیکن مشرکین میں سے جو بت پرست ہیں ان سے برسرپیکار ہونے کے متعلق یہ فرض ہے ان سے جنگ کرو۔ اگر تمہیں ان پر قدرت ہے (از قدر علیہم) تاوقتیکہ وہ اسلام قبول کرلیں اور رسولؐ کی سنت تمہیں ان سے جزیہ قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں (ص 53)_

چوں کہ اس بنیادی اصول کی مشروط وجہ یہ ہے کہ اگر تمہیں ان پر قدرت حاصل ہے "اور اگر اس دفعہ کو حذف کر دیا جائے تو امام شافعی کے اصول کے معنی ہی بدل جائیں گے۔ وہ مسلمانوں کو کسی مایوس کن کشمکش میں ہلاک ہونے کا مشورہ نہیں دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں کسی زمانہ کے تاریک عرب کے قلب میں رہتے ہوئے امام یہ محسوس کرنے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام عرب بت پرستی کا تصفیہ تو کر سکتا ہے لیکن اسے یہودیوں اور عیسائیوں سے مستقل معاہدے کرنے ہوں گے۔ یہی "اہل کتاب" اور "بت پرستوں" کے درمیان عملی تفریق کی بنیاد ہے۔ امام شافعی ہندوؤں کے سلسلہ میں خاموش ہیں لیکن وہ بہت وضاحت سے کہتے ہیں۔ کہ "رسول اللہ نے مجوسیوں سے جزیہ قبول کرنے کی اجازت دی ہے" (احکام القرآن' ج دوم' ص 53) اور ازمنہ وسطیٰ کے مسلم فقہا کے نقطہ نظر سے ہندو اور مجوسی (زردشتی) ایک ہی قسم میں آتے تھے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

3- "امام شافعی فرماتے ہیں : 'جنگ ان غیر مسلموں کے خلاف لازمی قرار دی گئی ہے جو اہل کتاب نہیں ہیں تاوقتیکہ وہ اسلام قبول نہ کرلیں اور اہل کتاب کے خلاف اس وقت تک جب تک کہ وہ جزیہ ادا نہ کر دیں لیکن قرآن بھی فرماتا ہے کہ 'اللہ کسی شخص پر اس کے اختیار سے باہر کا فرض عائد نہیں کرتا ہے' (سورہ 2' آیت 276) لہٰذا مسلمانوں پر وہی فرض ہے جو ان کے اختیار میں نہیں ہے اور اگر وہ کسی معاملہ میں لاچار ہیں تو وہ کسی فرض کے پابند نہیں ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں ہے' چنانچہ

مسلمانوں کے لئے کوئی سزا نہیں ہے اگر وہ مشرکین کے ایک گروہ کے ساتھ جنگ کرنے سے باز رہیں اور ان کے ساتھ امن قائم کریں' (ص 62)۔ "اور امام شافعی مزید فرماتے ہیں : 'رسول اللہ نے حدیبیہ میں مکیوں کے ساتھ صلح کی۔ یہ صلح ان کے درمیان دس سال کے لئے تھی اور اس سفر کے دوران ان پر یہ وحی نازل ہوئی' ہم نے تمہیں قطعی فتح دی ہے تاکہ اللہ تمہیں معاف کر دے (سورہ 48' آیت 2-1) (احکام القرآن' ص 62)

"اور امام شافعی فرماتے ہیں' ابن شہاب نے کہا ہے کہ "اسلام کے لئے صلح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح نہیں تھی۔ اور شہاب نے نیز یہ بھی کہا کہ 'لوگ اسلام میں شامل ہو گئے اور سچے دین دار بن گئے'۔" (احکام القرآن' ص 63-62)

اس طرح یہ ثابت ہوا کہ امام شافعی کی تعلیمات میں برنی کے تعصب کی تائید میں کچھ بھی نہیں ہے مزید برآں یہاں یہ کہنا ضروری ہو جاتا ہے کہ بیہقی کی احکام القرآن کے فاضل مصری ایڈیٹر پروفیسر عبدالغنی عبدالخالق کے مطابق بیہقی نے جو بیانات امام شافعی سے منسوب کئے ہیں وہ امام کی اختلاف الحدیث میں جوں کے توں ملتے ہیں۔ نصیحت 11 میں برنی کے متعصبانہ رویہ کی تائید مسلم فقہا کے کسی بھی مکتب سے نہیں ملتی۔ امام شافعی کے لئے 'جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں صلح حدیبیہ نے مسلمانوں کے لئے پرامن تبلیغ کا جو موقع فراہم کیا وہ مثالی ہے۔ (ح)

5- خلیفہ مامون رشید کا تعصب

اس نصیحت کے سلسلہ میں دی گئی مثال کے دوران برنی نے حقائق کے بیان میں جو غلطیاں کی ہیں ان سب کی طرف اشارہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ (الف) یہ صحیح ہے کہ اگست 819ء میں مامون کے دارالسلطنت میں داخل ہونے تک بغداد میں بغاوت اور بدامنی دونوں تھے۔ لیکن برنی نے فلسفہ اور گناہ کے تسلط کی جو تصویر کشی کی ہے اسے کسی طرح صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ (ب) اپنی حسب عادت لاپرواہی اور گھٹیا مذہبی تعصب کی وجہ سے وہ معتزلہ کو (واصل بن عطا کے پیرو) فلسفیوں سے خلط ملط کر دیتا ہے جو کہ ارسطو اور یونانی مفکروں کے پیرو تھے۔ اس وقت صرف معتزلہ کا بغداد میں

عام اثر تھا لیکن فلسفی کسی شمار میں نہیں تھے۔ (ج) چوتھے سنی مسلک کے بانی امام احمد بن حنبل (780-885ء) اور امام یحییٰ معین جن کا انتقال غالباً 848ء میں ہوا) گہرے دوست تھے۔ ابن خلکان ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ دونوں امام شافعی کے شاگرد تھے (ملاحظہ کیجئے ابن خلکان' ج اول' ص 44 برائے امام احمد بن حنبل اور ج چہارم' ص 26' 24 برائے امام یحییٰ معین) بہرصورت امام حنبل اعلیٰ ترین وضع کے بیشتر مسلم مفکروں کی طرح حکومت کی خدمت کو گناہ تصور کرتے تھے اور خود اپنے بیٹے کے گھر بھی کھانا تناول نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان کا بیٹا ایک سال تک قاضی کی حیثیت سے حکومت کی خدمت انجام دیتا رہا تھا۔ نیز یہ کہ وہ معتزلہ کے مخالف تھے اور چوں کہ وہ ان کے اس نظریہ کی حمایت نہیں کرتے تھے کہ 'قرآن مخلوق تھا' لہذا مامون کے حکم پر ان کے بیڑیاں ڈال دی گئیں اور 883ء میں مامون کے انتقال کے عہد ہی وہ مزید اذیتوں سے محفوظ ہو سکے۔ (ح) اس سلسلہ میں صوفی شیخ عبداللہ مبارک کو خواہ مخواہ کھینچ لیا گیا ہے۔ وہ تو اس واقعہ سے بیس سال قبل انتقال کر چکے تھے (تاریخ الاولیاء نمبر 15' کشف المحجوب ص 76)

لیکن برنی کی تاریخ سے لاعلمی کی غالباً بہترین مثال اس کی مامون رشید کی بحیثیت متعصب حکمراں کے تصویر کشی ہے جس کا وہ دلدادہ ہے۔ مامون معتزلہ کا بہت مربی تھا جو کہ علماء دین کا منحرف گروہ تھا اور جس سے برنی سخت متنفر تھا "کچھ امور میں المامون خاصا وسیع النظر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے پیشرووں کی معاویہ کے مناسب ذکر پر کچھ سال قبل لگائی پابندی کو ہٹا دیا اور یہاں تک کہ عیسائیوں کو انجیل اور اسلام کے تقابلی دعووں پر بحث کی اجازت دے دی۔ لیکن ایرانی رجحان کے سبب جس کی طرف وہ ہمیشہ ہی راغب تھا بالاخر وہ مسلمات سے منکر مگر وسیع النظر معتزلہ کے نظریات کا سراغ لگانے کے لئے بہت اشتیاق سے متوجہ ہوا۔ آخر میں اس نے مسلمہ ایمان کے کچھ متضاد عقائد میں اپنے یقین کا اعتراف کر لیا۔ ان میں وہ 'جبر' کی جگہ 'اختیار' پر عقیدہ رکھتا تھا اور اس وقت تک کے اس مکمل عقیدہ کی جگہ کو قرآن ازلی اور ابدی ہے' وہ یہ تو تسلیم کرتا تھا کہ قرآن الہامی ہے لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ وہ 'مخلوق' ہے۔ خود قرآن کی مجازاً" وضاحت کی گئی اور جب تقلید پسندوں کے سامنے ایسی مشکلات پیش

آئیں جو عقل کے خلاف تھیں یا جن سے معاشرہ کی نشوونما محدود ہو سکتی تھی تو انہوں نے ان سے بہ آسانی راہ فرار اختیار کیا۔" (موئرکی Calibhate' ص 507-506)

ڈاکٹر لیٹراسٹین (Dr. Letterstein) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "مامون کے عقلی رجحانات نے اسے معتزلہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ ایک طرف اس نے تقلید پسندوں کی تعذیب کی اور معتزلہ کی بابت ان کے عقیدہ کی صحت کے بارے میں ان سے سخت سوال و جواب کئے اور دوسری طرف اس نے علویوں کا بہت پاس و لحاظ کیا۔ اس کا عہد شعرو شاعری اور علوم کا عصر زریں تھا...... خلیفہ نے فلسفہ اور علوم قطعیہ میں بھی خاصی دلچسپی ظاہر کی۔" (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج سوم' ص 222)

مولانا شبلی نے اپنی "المامون" میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے' خلیفہ معتزلہ تھا اور اس متعصب گروہ کا مخالف تھا جس کا آئندہ ابوالحسن اشعری (935-873ء) کی قیادت میں غلبہ ہونا تھا اور جسے ضیاء الدین برنی کی شخصیت میں اپنا سب سے حقیر اور سطحی ترجمان ملا' جس مفروضہ منشور کو برنی نے نقل کیا ہے وہ خالص اس کی اختراع تھا لہٰذا اسے مسترد کر دینا چاہئے۔ (ح)

حوالہ جات

48- خلیفہ حضرت عمرؓ نے تمام مسلم امت کو (جیسا کہ برنی خیال کرتا ہے) ذاتوں یا روحوں میں بانٹ نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے تو صرف مال غنیمت کی خاص طور سے ایرانی شہنشاہوں کی جمع کی ہوئی دولت کی تقسیم کے لئے ایک اصول معین کیا تھا۔ ایک ایرانی صوبہ دار نے خلیفہ کو بتایا کہ ایرانی شہنشاہوں کے تنخواہوں کے رجسٹر کس طرح تیار کئے جاتے تھے اور اس کی تجویز کو اپنا لیا گیا۔ "اس کے بعد عمر نے طے کیا کہ ایمان میں تقدم اور میدان جنگ اور جہادوں میں رسول اکرم کی مدد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تنخواہ مقرر کی جائے گی" خلیفہ نے کاتبوں کو ہدایت کی "رسول اکرم کے چچا عباس اور بنی ہاشم سے شروع کرو اور اس کے بعد جو آتے ہوں انہیں ان کے درجوں کے مطابق رکھو اور خطاب کے خاندان کو وہاں رکھو جہاں اللہ نے اسے جگہ دی ہے" (الفخری' ص 81-800) کیخسرو۔ ایرانی روایات کے مطابق شام کے فرماں روا ضحاک نے' جس نے آخری بیس وادیاں شہنشاہ جمشید کا خاتمہ کیا تھا۔ ایران پر

ایک ہزار سال تک بہت خراب حکومت کی۔ اس کے بعد ایران کے ایک لوہار کاوہ نے اس کے خلاف ایک کامیاب بغاوت کی اور اپنے پیشہ کی وردی کو ایک باغیانہ جھنڈے (روفش کاویانی) کی حیثیت سے استعمال کیا۔ لیکن کاوہ نے محسوس کیا کہ انسانوں پر حکومت کرنا اس کے لئے موزوں کام نہیں لہٰذا اس نے پرانے شاہی خاندان کے ایک فرد موسوم فریدوں کو بغاوت کا سردار بنا دیا۔ فریدوں نے ضحاک کا خاتمہ کیا اور ایران میں دوسرا شاہی خاندان قائم کیا جو کاوہ یعنی لوہار کی نسبت سے کیانی کہلایا۔ کیخسرو نے (جو کیکاؤس کے بیٹے سیاروش کا بیٹا تھا) اس خاندان کے سب سے زبردست بادشاہ کی حیثیت سے ناموری حاصل کی۔ اس نے ترکی شہنشاہ افراسیاب کا خاتمہ کر ڈالا۔ مشہور و معروف رستم اسی کے افسروں سے میں سے ایک تھا۔ روضتہ الصف کے مصنف کا کہنا ہے کہ "اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ کیخسرو کی خوبیوں اور نیک کاموں کی تعریف میں جو بھی اسمائے صفت استعمال کئے جائیں وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے۔" (دیکھئے روضتہ الصفا' ج اول' ص 198-196 اور فردوسی کا شاہنامہ' ص 279-203)

49- عارض ممالک۔ دور سلطنت میں عارض ممالک کا خطاب وزیر جنگ کو دیا جاتا تھا۔ وہ ریاست کے چار بڑے وزیروں میں سے ایک ہوتا تھا اور اس کا اہم ترین کام یہ ہوتا تھا کہ کم از کم سال میں ایک بار ہر ایک سپاہی کے بارے میں تحقیق (عرض) کرے' سپاہی کو اس وقت تنخواہ اور اس کے خریدے ہوئے ساز و سامان کی ادائیگی ہوتی تھی۔ جب وہ اس تحقیق میں اہل ثابت ہو جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر کسی سپاہی کا گھوڑا یا اس کے ہتھیار خود اس کی کسی غلطی سے تلف نہیں ہوئے ہیں تو حکومت ان کی کمی کو پورا کرے گی۔ فوج کے تمام غیر فوجی امور عارض ممالک کے تحت آتے تھے' دور سلطنت یا مغلیہ میں سپہ سالار کے ہم مرتبہ کوئی افسر نہیں ہوتا تھا۔ عارض اصل' عارض ممالک' یعنی تمام سلطنت کے عارض' ہی سے بنا ہے مغلیہ دور میں عارض کی جگہ بخشی کا عہدہ قائم کیا گیا جو قطعی طور پر ایک غیر فوجی افسر تھا۔ ہر صوبہ کے لئے ایک بخشی ہوتا تھا اور نیز تمام سلطنت کے لئے ایک بخشی ہوتا تھا۔

50- ہمارے مستند مصنف اکثر ان سپاہیوں کا ذکر کرتے ہیں جو دہلی جائزے کے لئے آیا کرتے تھے: قلعہ تغلق آباد پر کھڑے ہو کر کوئی دیکھے تو ایک بوسیدہ دیوار سے گھرا ہوا کئی

مربع میل طول و عرض میں پھیلا ہوا ایک میدان ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں جائزہ لیا جاتا ہو۔ جائزہ ایک ہی وقت میں ختم کرنا ہوتا تھا تاکہ ایک فوجی کے ہتھیار اور شاید گھوڑے بھی کوئی دوسرا دوبارہ نہ پیش کر سکے۔

51- قراخطا پر ایک نوٹ اس نصیحت کے اختتام پر دیا گیا ہے۔

52- فیروز شاہ تغلق نے جیسا کہ بخوبی معلوم ہے' بہت بڑی تعداد میں غلام جمع کئے تھے۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ کیا برنی کا اشارہ اس طرف ہے کہ اس جماعت کے قیام کا مقصد حکومت کے خدمت گاروں کے تکبر کو قابو میں رکھنا تھا۔

53- برنی کے خیال کے مطابق علاؤ الدین نے ایک ہی دن میں تیس ہزار نگولوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی جائداد ضبط کرنے کی ہدایت جاری کی (تاریخ فیروز شاہی' ص 336) برنی اس ظالمانہ اقدام کی مذمت کرتا ہے کیوں کہ بیشتر لوگ جنہیں قتل کیا گیا ان کا مبینہ سازش میں کوئی ہاتھ نہیں تھا تاریخ فیروز شاہی میں منگولوں کے متعلق ایسی کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔

54- ظاہر ہے کہ جن سپاہیوں کو سلطان بھرتی نہیں کرے گا۔ انہیں باغی بھرتی کریں گے۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ برنی کے زمانہ میں اتنے زیادہ سپاہی تھے کہ سلطان ان سب کو روزگار نہیں دے سکتا تھا۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ ایسے باغی جن کی کامیابی کی ذرہ برابر بھی توقع نہیں ہوتی تھی وہ بڑی سہولت سے اپنی تقدیروں کی اطاعت کے لئے سپاہی بھرتی کر لیتے تھے۔

55- مزوک کے لئے اس نصیحت کے اختتام پر ایک نوٹ دیکھئے۔

56- برید۔ ہٹی کے مطابق یہ لفظ لاطینی لفظ "Veredus" یا ایرانی "بردان" یعنی تیز رفتار گھوڑے سے نہیں لیا گیا ہے بلکہ عربی "بردھان" یعنی بوجھ سے لدے گھوڑے سے لیا گیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ معاویہ پہلا حکمراں تھا جس نے دور دراز تک پھیلی ہوئی خلافت کی خبر رسانی کے لئے دیوان برید قائم کیا۔ لیکن برنی کے زمانہ میں برید سے مراد خبر رسانی کا نگراں افسر نہیں تھا بلکہ افسر مراد تھا جو رازدارانہ معلومات جمع کر کے انہیں سلطان کے پاس بھیجتا تھا۔ جاسوسوں کے برخلاف برید اعلانیہ مقرر کیا جاتا تھا اور جس کے اختیارات اور دائرہ عمل سے ہر شخص واقف تھا۔

57- پارہ 26، سورہ 49، آیت 12- پوری آیت اس طرح ہے "اے ایمان والو بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر بعضی تہمت گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور بد نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو سو گھن آئے تم کو اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان۔" برنی شاہی اقتدار میں شان ایزدی پیدا کرنے کی اپنی کوشش کے سلسلے میں اس آیت پر جو مفہوم ٹھونستا ہے اسے تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ اس نے دوسری نصیحت میں یہ کہہ کر زیادہ سمجھداری کا ثبوت دیا کہ "جو نجی اور مخفی ہے اسے فاش نہ کرو اور اس کی اشاعت نہ کرو۔"

58- اشارہ صاف طور پر اس واقعہ کی طرف ہے کہ بہترین صلاحیتوں کے حامل مسلمان اور چشتی سلسلہ کے لوگ جس سلسلہ میں برنی بھی کم از کم رسماً ہی شامل کر لیا گیا تھا۔ سلطانوں کی خدمت میں داخل ہونے کو گناہ سمجھتے تھے۔

برنی کے ذہن میں سلطان محمود کے وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کی کوئی صحیح تصویر نہیں تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کی عام بولی میں خواجہ احمد ابن حسن میمندی کو عام طور سے سلطان محمود کا وزیر کہا گیا ہے جب کہ وہ صرف سترہ سال محمود کی خدمت میں رہا۔ "سابقہ وزیر ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائینی کے (ایذا کے ساتھ) قتل کے بعد سلطان محمود نے احمد ابن حسن میمندی کو اس کا جانشین مقرر کیا۔ احمد سلطان کا برادر رضاعی اور ہم جماعت تھا اور اس کا باپ حسن میمندی محکمہ مال گزاری کی طرف سے محصول جمع کرنے کے لئے بست میں متعین تھا۔ عوام میں ایک خیال عام تھا جو قطعی صحیح نہیں کہ حسن میمند (وزیر کا باپ) بھی وزیر تھا۔ خواجہ احمد بن حسن میمندی اپنی دینی ریاضات اور عالمانہ اوصاف کے باعث ممتاز تھا۔ وہ پہلے محکمہ انشاء اور رسالت کا نگراں تھا، لیکن سلطان محمود کی اس پر بڑی نظر عنایت تھی۔ اس کی دیگر ذمہ داریوں میں خراسان کی مال گزاری جمع کرنے کے کام کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس نے اپنے فرائض کو انتہائی حسن و خوبی سے انجام دیا جب سلطان محمود ابوالعباس اسفرائینی سے ناخوش ہو گیا تو اس نے وزارت بھی مستقل طور پر خواجہ احمد بن حسن میمندی کے مضبوط ہاتھوں میں دے دی۔ سترہ سال تک خواجہ ملک کے سیاسی اور فوجی امور دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بہت سے امرا جیسے التون تش حاجب اور امیر علی خویشاوند نے سلطان کے

سامنے اس کی شکایتیں شروع کر دیں۔ ان کے الفاظ سلطان پر اثر کر گئے لہٰذا اس نے خواجہ کو برطرف کر کے ہندوستان کے ایک قلعہ میں مقید کر دیا جب سلطان مسعود محمود کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تو اس نے خواجہ کو رہا کر کے اسے ایک مرتبہ پھر وزیر بنایا۔ خواجہ 1037ء میں اپنی وفات تک وزارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ (حبیب السیر' ج دوم' فارسی' تہران ایڈیشن) (ح)

59- واقعات مختصراً" اس طرح ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید مامون کو ایک فوج کے ساتھ مرو بھیجنے کے بعد 808ء میں طوس (مشہد) کے مقام پر انتقال کر گیا۔ خانہ جنگی شروع ہو گئی اور مامون کے جنرل طاہر نے بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد مامون کے حریف امین کو بے قابو کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد مرو میں مامون بغداد کے عباسیوں سے بہت دور تھا لہٰذا اس نے آٹھویں امام علی رضا کو' جو اس سے عمر میں بائیس سال بڑے تھے۔ اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مامون نے اپنے وزیر فضل بن سہل کے اثر کی وجہ سے ایسا کیا۔ لیکن یہ واقعہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ جسے عباسی یا خلافت میں حق جتلانے والے دوسرے لوگ برداشت کر سکتے تھے' بغداد میں ابراہیم ابن مہدی (مامون کے چچا) کے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور مامون کے صوبہ دار حسن بن سہل (وزیر کے بھائی) کو واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ مامون نے بالآخر صورت حال بھانپ لی اور وہ بغداد کی طرف چل پڑا۔ سرخش (شمالی ایران میں) میں وزیر فضل بن سہل کو اپنے غسل خانہ میں قتل ہوا پایا گیا اور مشہد میں امام علی رضا انگور کھانے سے انتقال کر گئے۔ مامون کی آمد پر بغداد میں بغاوت فرو ہو گئی لیکن اس پر بہت سے لوگوں نے اپنے وزیر کے قتل کا منصوبہ بنانے اور امام علی رضا کو زہر دینے کے الزامات لگائے۔ ان حالات میں یہ بات کچھ لگتی ہوئی نہیں ہے کہ فضل بن سہل نے مامون کو یہ نصیحت دی ہو گی جو برنی نے اس سے منسوب کی ہے کیوں کہ فضل بن سہل کا مفاد اس میں تھا کہ مامون کو معاملات سے لاعلم رکھا جائے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مامون مرو میں اپنے قیام کے آخری حصہ (817-808ء) میں امور سلطنت سے الگ تھلگ ہو گیا تھا لیکن ہم عصر فضل بن سہل کو اس کے لئے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

60- اس نصیحت کو سمجھنے کے لئے برنی کی علاؤ الدین خلجی کے اقتصادی ضوابط کی روئداد کو ذہن نشین رکھنا چاہئے (تاریخ فیروز شاہی' ص 319-303) لیکن دو دیگر امور کو بھی مدنظر رکھنا

پڑے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ برنی نے "عام بازاروں" کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے باوجود کچھ عالم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علاؤ الدین کے اقتصادی ضوابط خالص فوجی اقدام تھے۔ اس جگہ برنی اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ قیمتوں پر کنٹرول فوج اور عوام دونوں کے بھلے کے لئے ہے۔ دوسرے' برنی (تاریخ فیروز شاہی' ص 305) اور امیر خسرو (ص 13-12) دونوں اس کی توثیق کرتے ہیں کہ جب تک علاؤ الدین زندہ رہا اناج اور دوسری اشیاء کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن برنی بھی تاریخ فیروز شاہی میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ علاؤ الدین خلجی کا مخصوص کار نمایاں تھا اور دوسرے سلطانوں کی دسترس سے بالکل باہر تھا۔ یہاں اس حقیقت کا صاف گوئی سے اعتراف کیا گیا ہے۔

61- یہ برنی کا پسندیدہ خیال ہے کہ تمام اشیاء کی قیمتیں پیداوار کی لاگت (نرخ برادر) کے مطابق ہونا چاہئے' یا کارل مارکس کی زیادہ صحیح اصطلاح میں' براہ راست پیدا کرنے والے کی' سماجی اعتبار سے محنت کی ضروری مدت' کے مطابق۔ لہٰذا وہ تاریخ فیروز شاہی (ص 316) میں لکھتا ہے "عام بازاروں کے متعلق پہلے کہے گئے ضوابط کے نفاذ کی غرض سے) جس سے عوام کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سلطان علاؤ الدین نے دن رات جدوجہد کی اور ہر شے کے بارے میں یہاں تک کہ سوئیوں' کنگھوں' موزوں' جوتوں' پیالوں' صراحیوں اور جام جیسی حقیر اشیاء کی برآورد کے بارے میں تحقیق کی۔ اس نے اپنی موجودگی میں ہر چیز کی قیمت اشیاء کی "نرخ براورد" پیدا کرنے والے کے منافع کے مطابق مقرر کر دی۔ قیمتوں کا نرخ نامہ جو سلطان کے سامنے طے کیا گیا تھا اسے دیوان ریاست کے حوالہ کر دیا گیا۔"

62- اپنی تاریخ فیروز شاہی میں برنی نے صرف دہلی کے حوالہ سے علاؤ الدین خلجی کے اقتصادی ضوابط کا ذکر کیا ہے صوبوں کے بارے میں وہ ساکت ہے صرف اتنا کہتا ہے کہ وہاں سے غلہ حاصل کیا جاتا تھا اور تما ناتکوں کو یہ اختیار حاصل تھا یا ان کا فرض تھا کہ وہ غلہ لائیں فتاوائے جہاں داری کا یہ پیراگراف یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ علاؤ الدین کے ضوابط کی توسیع سلطنت کے شہروں تک تھی۔

63- مسلمان عام طور سے تمام اعمال کو "خواہ وہ بد ہوں یا نیک" دو قسموں میں بانٹتے ہیں۔ پہلے تو وہ اعمال جو خود آدمی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے اور اس کے خدا کے درمیان کا معاملہ ہیں۔ دوسرے وہ اعمال جو دوسروں کو متاثر کرتے ہیں' جہاں تک دوسروں کے

حقوق کو گزند پہنچانے کا معاملہ ہے یہ خطرہ ہے کہ مغفرت الٰہی بھی آزار پانے والے شخص کی معافی سے مشروط ہو گی۔

64- احتکار۔ احتکار کا مطلب ہے جب قیمتیں کم ہوں اس وقت کسی شئے کو باہر یا بازار سے خریدنا اور قیمتیں بڑھنے پر فروخت کرنا۔ احتکار دو صورتوں کے سبب ممکن ہو گیا تھا۔ پہلی، سڑکوں کا غیر محفوظ ہونا۔ موسم کی طوفان خیزیاں اور نقل و حمل کا خرچہ۔ دوسری، سوداگر کاروانی اور سوداگر بازاری کے اتحاد سے پیدا ہونے والی اجارہ داریاں، کئی مسلم عالم دین احتکار کے گناہ سے اس قدر خائف تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اناج کے کاروبار میں نہ پڑیں۔ بہرکیف ازمنہ وسطیٰ میں اناج کی تجارت پوری طرح ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور علاؤ الدین اپنے اقتصادی ضوابط شروع کرتے وقت ان کی تعمیل کے سلسلہ میں ہندو نائکوں پر منحصر تھا جن میں یکجہتی تھی اور چوں کہ تجارت مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی لہٰذا صرف وہی اناج کا احتکار کر سکتے تھے۔ برنی نے اس جگہ مجوسیوں یا پارسیوں کا جو اضافہ کیا ہے وہ بالکل فضول ہے (ح)

65- امام شافعی کے مسلک کی طرف اشارہ ہے جس کے ان غیر مسلمین کے بارے میں نظریات کو جن کے پاس کوئی ایسی مقدس کتاب نہیں ہے جس کا قرآن میں ذکر ہو، برنی نے غلط سمجھا اور غلط پیش بھی کیا ہے۔ اس امر پر نصیحت کے اختتام پر ایک نوٹ میں بحث کی گئی ہے۔

66- فراوانی کی صورت میں قیمتیں کم ہوں گی بشرطیکہ (الف) تجارت میں کھلا مقابلہ ہو اور (ب) نقل و حمل کی مناسب سہولتیں میسر ہوں۔ اس زمانہ میں یہ بہت آسان اقتصادی منصوبہ رہا ہو گا۔ لیکن برنی انسانوں کے چال چلن پر کیچڑ اچھالتا ہے اور نقل و حمل کی سہولتوں کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کرتا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں تجارتی اشیاء کا نقل و حمل مخصوص طبقوں کی موروثی تجارت تھا اور ان طبقوں کے اراکین ایک دوسرے سے مل کر قیمتوں کو اعلیٰ اجارہ دارانہ سطح پر رکھ سکتے تھے۔ برنی کا اولیں مطالبہ یہ ہے کہ ریاست کے حکمران کو قیمتوں کے اجارہ کو کچل دینا چاہئے۔ اور ایسی قیمتیں مقرر کر دینا چاہئے جو تجارتی مقابلہ کی صورت میں رائج ہو سکتی تھیں، حکومت باآسانی ان قیمتوں میں، جن قیمتوں پر خود سوداگر کاروانی نے بیرون شہر یا دیگر شہروں سے اپنی تجارتی اشیاء خریدی

تھیں، نقل و حمل کی لاگت اور معمولی تجارتی منافع کا اضافہ کر کے مناسب یا مقابلتی قیمتیں مقرر کر سکتی تھی (ح)

67- امام محمد اسحاق : امام ابو عبداللہ محمد اسحاق رسولؐ اکرم کی سیرت اور مغازی کے قدیم ترین مصنفین میں سے ہیں۔ امام کے دارا یاسار کو 633ء میں عراق سے پکڑ کر مدینہ لایا گیا تھا اور امام مدینہ میں جوان ہوئے اور اسی شہر میں اپنی کتابوں کے لئے مواد جمع کیا لیکن کچھ علمائے دین کی تنقید کے باعث، جنھوں نے انہیں شیعہ کہا، وہ مصر منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بعدازاں خلیفہ منصور نے انہیں بغداد بلا لیا اور وہیں 767ء کے قریب ان کا انتقال ہو گیا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ امام نے رسول اکرم کی سیرت پر دو جلدیں تیار کیں اور خلفاء راشدین کی تاریخ بھی لکھی۔ بدقسمتی سے ان کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ لیکن طبری نے اپنی مشہور تاریخ میں امام اسحاق کی تصنیف کے کافی اقتباسات محفوظ کئے ہیں امام ابن ہشام نے بھی جو اپنے ایک شاگرد کے ذریعہ ابن اسحاق کی تصانیف سے واقف تھا، اپنی مشہور تصنیف سیرت رسولؐ اللہ کی تکمیل میں ابن اسحاق کی تصانیف بھی استعمال کی ہیں (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ج دوم، 389'390) ظاہر ہے کہ یہاں برنی ابو اسحاق سے منسوب کسی بعد کی تصنیف کا حوالہ دے رہا ہے قدیم اسلامی عہد کی کئی کتابوں میں ابو حذیفہ کی بازنطینی شہنشاہ کے ساتھ گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے۔

68- حدود اللہ پر قرآن کہتا ہے "یہ حدود اللہ ہیں لہٰذا ان کی خلاف ورزی نہ کرو اگر کوئی (اشخاص جو اللہ کی عائد کی ہوئی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ ظالم ہیں۔" (سورہ 2، آیت 229) وہ تمام جرائم جن کے لئے قرآن نے سزا تجویز کی ہے دوسرے جرائم سے مختلف ہیں کیوں کہ وہ حدود اللہ کو توڑتے ہیں۔ (ح)

69- برشکال۔ مون سون یا موسم برسات (برشکال، برکھارت، برسات) ہندوستان کی ایک خصوصیت ہے۔ ایرانی صوبہ فرس میں معمولی سا مون سون آ جاتا ہے لیکن باقی ایران، افغانستان، وسط ایشیاء اور ترکستان میں مون سون بالکل نامعلوم شئے ہے۔ برطانوی قونصل خانہ کے محفوظ کئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق اس علاقہ میں بارش کا اوسط تقریباً چار انچ سالانہ ہے اور اس کی نوعیت طوفانی ہے۔ ان علاقوں سے آنے والا کوئی بھی تارک وطن برنی کو اس معروف حقیقت کے بارے میں بتا سکتا تھا بہت سے لوگ منگولوں کی ہیبت سے عجم سے

ہندوستان آئے تھے اس کے باوجود برنی اتنا بے خبر اور بھولکڑ ہے کہ وہ فتاوائے جہانداری میں چار مرتبہ برشکال کا حوالہ برسات کے بجائے ہندوستان کے مون سون کی شکل میں دیتا ہے۔

70- قرآن، سورہ 32، آیت 13-

71- عہد سلطنت میں سلطان اور اعلیٰ عہدیدار دونوں غربا کا پیٹ بھرنے کے لئے ضیافت خانہ جنہیں لنگر خانہ بھی کہا جاتا تھا، قائم کرتے تھے۔ صوفیاء اور قلندر بھی انہیں قائم کرتے تھے اور ان پر لوگوں سے ملنے والے تحائف خرچ کرتے تھے۔ (ح)

72- تاریخ فیروز شاہی اور موجودہ تصنیف دونوں میں برنی اس مفروضہ کے ساتھ بحث کرتا ہے کہ "اہل کتاب" کے برخلاف ہندو جزیہ کی ادائیگی کے باوجود پرامن زندگی کے مستحق نہیں ہیں۔ اس کا طرز خیال امام ابو حنیفہ کے نظریات کے بالکل مخالف ہے لیکن برنی یہ جواز پیش کرتا ہے کہ امام شافعی نے ان کے لئے "اسلام یا تلوار" کے سوائے کسی چارہ کار کی اجازت نہیں دی ہے اس موضوع پر امام شافعی کے نظریات پر اس نصیحت کے اختتام پر بحث کی گئی ہے۔

73- خلیفہ مامون اور مذکورہ بالا تینوں اشخاص کے مذہبی رویہ کے بارے میں اس نصیحت کے اختتام پر نوٹ ملاحظہ کیجئے۔

آج

ایڈیٹر: اجمل کمال

316 مدینہ سٹی مال۔ عبداللہ ہارون روڈ' صدر کراچی 74400

☆

آواز

نگراں: رفیع اللہ شہاب۔ ایڈیٹر: محمد شعیب عادل

31۔ سیکنڈ فلور۔ حفیظ سینٹر' مین گلبرگ لاہور 54660

☆

شب خون

ایڈیٹر: شمس الرحمان فاروقی

پوسٹ بکس 13۔ الہ آباد 211003' انڈیا

☆

سنگت

مری لیب۔ فاطمہ جناح روڈ' کوئٹہ

☆

مزدور جدوجہد

ایڈیٹر: فاروق طارق

جدوجہد سینٹر۔ 40 ایبٹ روڈ' لاہور

☆

جفاکش

ایڈیٹر: توقیر چغتائی

رمپا پلازہ۔ ایم اے جناح روڈ' کراچی

☆

عوامی منشور

چیف ایڈیٹر: طفیل عباس

261-C/II سینٹرل کمرشل ایریا

طارق روڈ پی ای سی ایچ ایس' کراچی

☆

طبقاتی جدوجہد

ایڈیٹر: منظور احمد

105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک

لکشمی چوک' لاہور۔ فون: 6316214

☆

سہ ماہی خیال

انجم سلیمی' نذر جاوید

ہم خیال پبلشرز' رحیم سنٹر فسٹ فلور

پریس مارکیٹ امین پور بازار' فیصل آباد 645830

☆